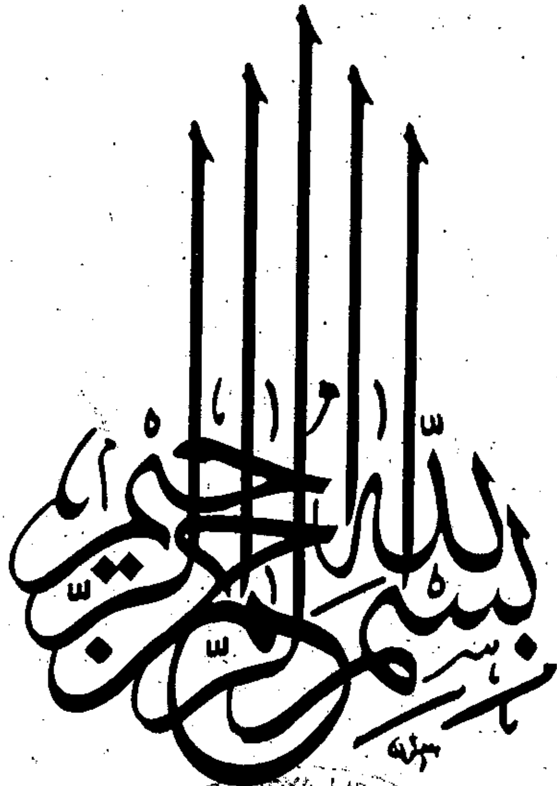
پانی پت اور
بزرگانِ پانی پت

حضرت شیخ شرف الدین بُو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ
حضرت خواجہ شمس الدین ترک رحمۃ اللہ علیہ
حضرت شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ
حضرت شیخ اعلیٰ چشتی رحمۃ اللہ علیہ

تألیف
حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ
مُحدّث، فقیہ، مؤرّخ، مجاہد فی سبیل اللہ، مؤلف کتب کثیرہ

زیر اہتمام
جمعیۃ پبلیکیشنز
متصل مسجد پائلٹ ہائی سکول ○ وحدت روڈ لاہور





ضابطہ

نام کتاب	پانی پت اور بزرگانِ پانی پت
اشاعت اوّل	فروری ۲۰۰۰ء
اشاعت دوم	اگست ۲۰۰۴ء
ناشر	محمد ریاض درانی
سرورق	جمیل حسین
کمپوزنگ	جمعیۃ کمپوزنگ سنٹر، وحدت روڈ
مطبع	اشتیاق اے مشتاق پریس، لاہور
قیمت	-/160 روپے

ISBN No: 969-8793-30-7

انتباہ

فہرست

عرض ناشر

بزرگان دین اور اولیاء کرام کا تذکرہ باعث رحمت و سکینت ہے' جہاں اولیاء کرام کا تذکرہ ہوتا ہے وہاں اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے دلوں کو سکون و راحت نصیب ہوتی ہے' البتہ یہ ضرور ہے کہ تذکرہ صاف ستھرا اور صحیح و درست ہونا چاہیے اور ان کے تذکرہ میں لایعنی روایات اور لغو و بے سروپا حکایات سے احتراز ہونا چاہیے۔

اس دور میں جہاں ہر چیز افراط و تفریط کا شکار ہے بد قسمتی سے اولیاء کرام کے معاملہ میں بھی اسی روش کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ اس قدر افراط کا شکار ہیں کہ انہوں نے اولیاء کرام کو تمام تر اختیارات کا مالک جان کر سب کچھ انہیں کو سمجھنا شروع کر دیا ہے' اور کچھ لوگ اس قدر تفریط کا شکار ہیں کہ وہ اولیاء کرام کا جو اصل مرتبہ و مقام ہے وہ بھی انہیں دینے کے لیے تیار نہیں' استقامت کی راہ وہی ہے جو افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال کی راہ ہے' ہمیں چاہیے کہ ہم جادۂ مستقیم پر چلتے ہوئے ہر معاملہ میں اعتدال کی راہ کو اپنائیں اور افراط و تفریط سے بچیں' زیر نظر کتاب ''پانی پت اور بزرگان پانی پت'' میں افراط و تفریط سے احتراز کرتے ہوئے نہایت معتدل و متوازن انداز میں بھارت کے مشہور اور تاریخی شہر پانی پت میں مدفون اکابر اولیاء اللہ مثلاً حضرت بو علی شاہ قلندر' حضرت خواجہ شمس الدین ترک' شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء' حضرت شیخ اعلیٰ چشتی وغیرہم کا تذکرہ کیا گیا ہے' اس کتاب کے مصنف جانی پہچانی شخصیت سید الملۃ حضرت مولانا محمد سید میاں صاحب

رحمۃ اللہ ہیں جن کا نام نامی کتاب کی ثقاہت کے لیے کافی ہے حضرت کی یہ کتاب بہت پہلے ہندوستان میں شائع ہوئی تھی اور عرصہ سے نایاب تھی جمعیت پبلیکیشنز کی خوش بختی ہے کہ پاکستان میں پہلی مرتبہ اسے یہ کتاب شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے-

جمعیت پبلیکیشنز اپنی سابقہ روایات کے مطابق اس کتاب کو شائع کر رہی ہے اس ایڈیشن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے شروع میں مقدمہ کا اضافہ کیا گیا ہے جو برادر مکرم مولانا نعیم الدین صاحب نے تحریر فرمایا ہے مولانا نعیم الدین دینی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں- موصوف جامعہ مدنیہ لاہور میں حدیث کے استاذ ہونے کے علاوہ تقریباً ایک درجن کتابوں کے مصنف بھی ہیں- اس مقدمہ میں مولانا موصوف نے تصوف اور صوفیاء کرام پر کیے جانے والے اعتراضات کا جائزہ لے کر ان کا شافی جواب دیا ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس کاوش کو بھی قبولیت سے نوازے-

محمد ریاض درانی
۱۰ شوال المکرم ۱۴۲۰ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

آنحضرت ﷺ نے علامات قیامت میں سے ایک علامت یہ ذکر فرمائی ہے کہ "اس امت کے پچھلے لوگ اگلے لوگوں پر لعن طعن کریں گے" (۱) اس دور پر فتن میں جہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذکر کردہ دوسری علامات کا ظہور ہو رہا ہے وہیں اس لعن طعن والی علامت کے اثرات بھی پوری طرح ظاہر ہو رہے ہیں مادر پدر آزاد لوگ جو دین سے بے بہرہ اور دینی اقدار سے ناآشنا ہیں وہ اپنے مذموم مقاصد کی راہ میں جس ہستی کو اپنے خلاف پاتے ہیں اس پر کھل کر تنقید اور طعن و تشنیع کرتے ہیں اور اس میں کسی کے مرتبہ و مقام کا لحاظ نہیں کرتے انبیاء کرام ہوں یا صحابہ کرام، خلفاء راشدین ہوں یا اہل بیت عظام، تابعین و تبع تابعین ہوں یا ائمہ مجتہدین، اولیاء کرام ہوں یا صوفیاء عظام، اس دور میں ان محترم شخصیات میں سے کوئی بھی تنقید سے بچا ہوا نہیں، دشمنان دین اگر یہ طرز عمل اختیار کریں تو ان سے کیا گلہ شکوہ، حیرت واستعجاب کا مقام تو یہ ہے کہ آج کل تنقید کا عمل وہ لوگ کر رہے ہیں جو اپنے آپ کو دیندار بلکہ اشاعت دین کا بلا شرکت غیرے ٹھیکیدار سمجھتے ہیں- صوفیاء کرام جو اس امت کا مقدس و پاکباز طبقہ ہیں جن کے انفاس قدسیہ سے ہر دور میں عالم مستنیر و مستفیض رہا ہے، جن کے ہاتھوں پر لاکھوں نہیں کروڑوں افراد نے اسلام قبول کیا ہے، جو ہمیشہ امن و آشتی اور صداقت و راستی کا پیغام دیتے رہے ہیں، جو ہمیشہ ایثار و ہمدردی سے کام لیتے ہوئے خلق خدا کی صلاح و فلاح میں لگے رہے ہیں، افسوس کہ آج اس مقدس طبقہ پر طعن و تشنیع کا بازار گرم ہے کوئی

۱ جامع ترمذی ج ۲ ص ۴۴

انہیں شیعیت کا علمبردار کہہ رہا ہے تو کوئی باطنیت کی پیداوار کسی کو صوفیاء کرام کے افکار میں کفر و شرک کی بو محسوس ہو رہی تو کوئی تصوف کو افیون قرار دے رہا ہے کوئی صوفیاء کرام کو کتاب و سنت کی اتباع سے ہٹا ہوا قرار دے رہا ہے تو کوئی انہیں اشاعت اسلام میں سب سے بڑی رکاوٹ بتلا رہا ہے۔ الغرض جتنے منہ اتنی باتیں، بڑا المیہ یہ ہے کہ جس سرزمین پاک میں تصوف کی بنیاد پڑی جہاں یہ پروان چڑھا جہاں سے اس کا سلسلہ چلا وہاں کے کچھ لوگ بھی تصوف اور صوفیاء کرام کے خلاف دوسروں کے بہکاوے میں آکر ایسی باتیں کرنے لگے ہیں جن کی ان سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ ؎ چو کفر از کعبہ برخیزد۔ کجا ماند مسلمانی

صوفیاء کرام کے متعلق یہ الزامات و اتہامات ہمارے لیے کوئی نئے اور پریشان کن نہیں ہیں جو لوگ تصوف کی ماہیت سے ناآشنا اور صوفیاء کرام کے فیض صحبت سے بے بہرہ ہیں وہ "الناس اعداء لما جھلوا" کے مصداق یہ الزامات و اتہامات لگاتے رہے ہیں، آج بھی ان کے کچھ باقیات اور عاقبت نااندیش مقلدین ان الزامات کے پرچار میں لگے ہوتے ہیں اور سادہ لوح عوام کے قلوب و اذہان کو خراب کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب الزمات و اتہامات تصوف کی حقیقت و ماہیت اور صوفیاء کرام کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات سے جہالت کا نتیجہ ہیں، صوفیاء کرام کا دامن ان الزامات و اتہامات سے پاک ہے وہ نہ شیعیت کے علمبردار ہیں نہ باطنیت کی پیداوار اور نہ تصوف کسی افیون کا نام ہے اور نہ ہی صوفیاء کرام کبھی بھی اشاعت اسلام میں رکاوٹ بنے ہیں، بلکہ اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی علمی، فکری اور سماجی بیداری صوفیاء کرام ہی کی تبلیغ و دعوت اور انہیں کی رشد و ہدایت کی رہین منت ہے، انہوں نے برصغیر کی تہذیبی اور مذہبی

لوگ جس چیز سے جاہل ہوتے ہیں اس کے دشمن ہوتے ہیں۔ زندگی کے ارتقاء

میں فرمانرواؤں سے کہیں بڑھ کر نمایاں خدمات انجام دیں اور سیرت کردار کا ایسا مینارہ روشن کیا جس کی روشنی سے پوری کائنات جگمگا اٹھی، صوفیاء کرام نے توحید و رسالت پر ایمان رکھنے کی دعوت دی، عشق الٰہی کو سرمہء اہل نظر بنایا۔ انہوں نے مساوات انسانی کا اعلان کیا، انفرادیت کی عظمت قائم کی، رواداری، اخوت و نیک نفسی کی تعلیم دی، جو لوگ سنجیدگی سے آگہی، بصیرت اور خداشناسی کے جویاں تھے انہوں نے صوفیاء کرام کے افکار و خیالات کا پرجوش خیر مقدم کیا اور ان کے آغوش رحمت اور دامن تربیت میں خداشناسی کی منزلیں طے کیں۔

افسوس کا مقام ہے کہ تصوف و صوفیاء کرام کے ناقدین نے یورپ کی تقلید میں مسخ شدہ تصوف اور صوفیہء خام کو سامنے رکھ کر طعن و تشنیع کا بازار گرم کیا۔ حقیقی تصوف اور سچے صوفیاء سے آنکھیں موند لیں انہوں نے نہ صوفیاء کرام کی تعلیمات کا مطالعہ کیا اور نہ ان کے طریق کار کا جائزہ لیا اور بلا تحقیق و جستجو ان پر الزامات عائد کر دیئے۔ حالانکہ باطنیت کی پیداوار ہندو فقیروں، جوگیوں، بیراگیوں کا طرز عمل اور صوفیاء کرام کا طریق کار دونوں عیاں ہیں۔ دونوں کا موازنہ کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ایسے ہی شیعیت کا جائزہ لیا جائے تو صوفیاء کرام کی تعلیمات و عقائد اذکار و اشغال اور شیعہ حضرات کی تعلیمات و نظریات اور افکار و خیالات میں بون بعید دکھائی دیتا ہے۔ اس دور میں مذاہب کے تقابلی جائزہ میں کوئی دشواری بھی نہیں کہ تمام طبقات کا لٹریچر عام ملتا ہے۔ حیرت ہے صوفیاء کے ناقدین نے سچے دل اور ٹھنڈے دماغ سے زحمت تحقیق کیوں گوارا نہیں کی؟ اور صوفیاء کرام کو کیوں ناحق بدنام کرنا شروع کر دیا؟ ہمیں یقین ہے کہ جو شخص بھی صوفیاء کرام کی حقیقی تعلیمات اور ان کے سچے افکار کا جائزہ لے گا وہ کبھی بھی ان معاندین و مخالفین کے دام تزویر کا شکار نہیں ہوگا۔

ہمارے اکابر ہمیشہ سے ناقدین تصوف و صوفیاء کے جوابات دیتے آئے ہیں

اس لیے نئے سرے سے جوابات کی ضرورت نہ تھی لیکن جدید دور کے تقاضے کے پیش نظر راقم الحروف مناسب سمجھتا ہے کہ اس موقع پر تصوف کی حقیقت وماہیت، تصوف کی اساس وبنیاد تصوف کے صحیح خدوخال، صوفیاء کرام کا مقصد، ان کا اتباع شریعت، عمل بالسنت اور اشاعت اسلام کے سلسلہ میں کی جانے والی ان کی کچھ خدمات کا تذکرہ کرے تاکہ عوام الناس اصل حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کریں اور معاندین ومخالفین تصوف کے پھیلائے ہوئے جال کا شکار ہونے سے بچیں۔

تصوف کیا ہے؟ :

"تصوف ایسا علم ہے جس کے ذریعہ نفوس کا تزکیہ، اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر وباطن کی تعمیر کے احوال پہچانے جاتے ہیں جس کی غرض ابدی سعادت کی تحصیل ہے"

غور فرمایئے! اس میں کون سی چیز غلط ہے، نفس کا تزکیہ غلط ہے یا اخلاق کا تصفیہ برا ہے؟ ظاہر وباطن کی تعمیر لغو ہے؟ یا سعادت ابدیہ کی تحصیل بے کار ہے؟ اسی طرح تقویم اخلاق، تہذیب نفس، نیز نفس کو اعمال شرعیہ کا خوگر بنانا اور شریعت کو نفس کے حق میں وجدان بنالینا ان امور میں کونسی شئے مقاصد شرع کے خلاف ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک شئے کتاب وسنت کے عین مطابق اور اللہ ورسول ﷺ کے منشاء ومرضی کو پورا کرنے والی ہے۔

غرض جس تصوف کے اثبات کے ہم قائل ہیں وہ وہی ہے جس کو اصطلاح شرع میں "احسان" کہتے ہیں یا جس کو "علم الاخلاق" کہا جاتا ہے یا "تعمیر الظاہر والباطن" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ ایک بانظم وبااصول چیز ہے اس میں مریدین کے لیے بھی شرائط ہیں اور شیخ کے لیے بھی اصول وآداب ہیں جن کی رعایت کرنے کے بعد اس کو شریعت کا مغز اور دین کا لب لباب کہنا بجا ہے اور جب

ان شرائط وآداب کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ غیر تصوف کو تصوف قرار دیا جائے تو پھر وہ طریق نہیں رہا جو ہمارا موضوع بحث ہے اس لیے کہ ان کی خرابیوں اور ان پر عمل کرنے کی وجہ سے سالک میں جو خرابیاں پیدا ہوں اس کا ذمہ دار کسی طرح بھی حقیقی تصوف اور اصل طریق کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اب اگر جدید مفکرین کو تصوف سے محض اس بنا پر چڑ اور انکار ہے کہ ان کے نزدیک اس کا نام محدث ونیا ہے تو اس میں تصوف ہی متفرد نہیں، کتنی ہی چیزیں اس وقت موجود ہیں اور ان حضرات کا ان سے تعلق بھی ہے حالانکہ وہ ابتداء اسلام میں ان ناموں سے معروف نہ تھیں، اگر آپ کو تصوف کا نام محدث معلوم ہوتا ہے اور یہ آپ کو پسند نہیں تو بے شک آپ اس کو "احسان" سے تعبیر کرلیجیے "علم الاخلاق" اس کا نام رکھ لیجیے اور جو شخص اس صفت سے متصف ہو اس کو محسن متقی اور مخلص کہہ لیجیے احسان ومحسن اور متقی ومخلص کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے اور احادیث مبارکہ میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔

تصوف کا مأخذ اور اس کی اساس وبنیاد

تصوف کا مأخذ کتاب وسنت ہیں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے مناصب میں سے ایک منصب تزکیہ ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

ربنا وابعث فیهم رسولا منهم یتلو علیهم آیاتك و یعلمهم الكتاب و الحكمة و یزكیهمo

(۲:۱۲۹)

"اے ہمارے پروردگار اس جماعت کے اندر انہی میں ایک پیغمبر بھی مقرر کیجیے جو ان لوگوں کو آیات پڑھ کر سنایا کریں اور ان کو کتاب کی اور

حکمت و دانائی کی تعلیم دیا کریں اور ان کو پاک کریں"

اس آیت کریمہ میں "تزکیہ" کا ذکر ہے تزکیہ پاک کرنے کو کہتے ہیں اور ظاہر وباطن دونوں کی پاکی کو شامل ہے۔

ایک مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

قد افلح من تزکی ۵ (۸۷: ۱۴)

"یقیناً وہ شخص کامیاب ہوگیا جس نے پاکی حاصل کی۔"

اس میں بھی ظاہر وباطن دونوں کی پاکی مراد ہے۔ اسی تزکیہ ء ظاہر وباطن کو صوفیاء کرام "تصوف" کہتے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت جبریل امین نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے صحابہ ء کرام کی تعلیم کی غرض سے بہت سے سوالات کئے جن میں ایک اہم سوال یہ بھی تھا کہ "اخبرنی عن الاحسان ' قال ان تعبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك۔"[1] مجھے احسان کے بارے میں بتلایئے کہ احسان کسے کہتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس خیال و دھیان سے عبادت کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اسی کیفیت احسانی پیدا کرنے کو صوفیاء کرام تصوف سے تعبیر کرتے ہیں۔

تصوف کی ضرورت واہمیت :

آیات کریمہ اور حدیث شریف سے معلوم ہو رہا ہے کہ ظاہر وباطن کا تزکیہ کرنا اور کیفیت احسانی کا پیدا کرنا شریعت میں مطلوب و مقصود ہے' سوال یہ ہے تزکیہ ء نفس جس کا کلام اللہ میں ذکر ہے اور کیفیت احسانی جس کا حدیث شریف میں

۱۔ مسلم شریف' بحوالہ مشکوٰۃ ص ۱۱

ذکر ہے۔ ان کا حصول کیونکر ہوگا؟ اس کا جواب سیدھا سادھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں تو آپ کے فیض صحبت سے ایک لحہ میں قلب کا تزکیہ ہو کر کیفیت احسانی حاصل ہو جاتی تھی اور وصول الی اللہ ہو جاتا تھا' لیکن بعد میں زمانہ ء رسالت سے جس قدر بعد ہوتا گیا اسی قدر تزکیہ ء قلب اور کیفیت احسانی میں ضعف و اضمحلال آتا گیا' چونکہ تزکیہ ء قلب اور کیفیت احسانی کا حصول مطلوب شرع ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا اس لیے مصلحین امت صوفیاء کرام نے ان کے حصول اور بقاء کے لیے جدو جہد اور کوشش فرمائی اور ایسے اذکار و اشغال اور مراقبات و مجاہدات تجویز فرمائے جو تزکیہ ء قلب اور کیفیت احسانی کے حصول میں مدو معاون بن سکیں' یہ اذکار و اشغال اور مراقبات و مجاہدات خود مقصود نہیں ہیں بلکہ حصول مقصود کا ذریعہ اور واسطہ ہیں' پھر چونکہ یہ اذکار و اشغال اور مراقبات وغیرہ شیخ سے سیکھے بغیر اور ان کی صحبت میں رہے بغیر صحیح طرح کیے نہیں جا سکتے اس لیے شیخ کی بیعت و ارادت اور ان کی صحبت ضروری ہوئی جس کے لیے پیری مریدی اور خانقاہی نظام اپنانا پڑا' اور چونکہ تعلیم و تربیت کے لیے ہمیشہ ایک ہی شیخ کافی نہیں ہو سکتا اس لیے اس کی نیابت و خلافت کا سلسلہ چلا' پھر چونکہ اس فن کے ائمہ اور مجتہدین اپنے اپنے زمانے میں متعدد اور مختلف ہوئے جو اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق تزکیہ قلب اور کیفیت احسانی کے حصول کے طرق بتلاتے رہے اس لیے ان طرق کی ان کی طرف نسبت کی وجہ سے ان کے سلسلے مختلف اور متعدد ہو گئے اور چشتیہ' قادریہ' سہروردیہ' نقشبندیہ وغیرہ نام سے موسوم ہوئے' پھر جس طرح ہر علم و فن کی اپنی اپنی اصطلاحات ہیں اسی طرح فن تصوف کی بھی بہت سی اصطلاحات وضع ہوئیں۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک کے نظائر کتاب و سنت میں موجود ہیں کوئی امر بھی ایسا نہیں جو کتاب و سنت کے خلاف ہو تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمایئے "**مسائل السلوك من كلام ملك الملوك**"

"التشرف بمعرفة احاديث التصوف" اور "التكشف عن مهمات التصوف" مصنفہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔

خلاصہ ء کلام یہ ہے کہ اصل مقصود "تزکیہ و احسان" ہے جسے "تصوف" کا نام دیا گیا ہے اور چونکہ تزکیہ و احسان شریعت میں مطلوب و مقصود ہیں اس لحاظ سے تصوف بھی مطلوب و مقصود ہوا اور شرعی نقطہ نظر سے اس کی ضرورت و اہمیت ہوئی۔

صوفیائے کرام کے مقاصد :

خانقاہی نظام سے صوفیائے کرام کے مقاصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انسان اپنے قلب کا ایسا تزکیہ کرلے کہ اس کے دل میں اللہ کی محبت کے علاوہ کچھ نہ رہے اور وہ **والذين آمنوا اشد حبا لله** (۲ : ۱۶۵) اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے بڑھ کر محبت ہے۔ کا سچا مصداق بن جائے اس کا اوڑھنا بچھونا اللہ کی محبت اس کا اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا مرنا جینا سب اللہ کی محبت میں ہو۔ وہ جئے تو اللہ کے لیے۔ مرے تو اللہ کے لیے۔ **قل ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی لله رب العلمین** (۶ : ۱۶۲) آپ فرما دیجئے کہ بے شک میری نماز، میری دیگر تمام عبادات، میرا جینا میرا مرنا خالص اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔ صوفیاء کرام چاہتے ہیں کہ انسان کا ہر کام اللہ کی رضا کے لیے ہو وہ خدا آگاہ و خدا شناس ہو اس سے اللہ تبارک و تعالیٰ راضی ہو جائیں اللہ کے حبیب حضرت محمد ﷺ راضی ہو جائیں اور اللہ کی مخلوق راضی ہو جائے اور اس کی دنیا جنت نظیر بن جائے۔

بتلائیے ان مقاصد میں سے کونسا مقصد ہے جو کتاب و سنت کے خلاف اور شریعت سے ہٹا ہوا ہے؟ اور کونسی چیز ہے جو باطنیت سے مستعار اور شیعیت سے ماخوذ ہے؟

تصوف کی حقیقت اور صوفیاء کرام کے مقاصد جنسہ سے معلوم ہوا کہ حقیقی تصوف تزکیہ ء قلب اور کیفیت احسانی کے پیدا کرنے کا نام ہے جو مذہب کی روح، اخلاق کی جان، اور ایمان کا کمال ہے، اس کی اساس شریعت ہے اور اس کا سرچشمہ کتاب و سنت ہے، تصوف کی مستند کتب مثلاً احیاء العلوم، قوت القلوب، رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب، عوارف المعارف، تذکرۃ الاولیاء، فوائد الفواد، خیر المجالس وغیرہ کے صفحے کے صفحے الٹ جائیے صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ عملاً آپ کو صوفیاء کرام کی طرف سے کتاب و سنت پر عمل کی تلقین ملے گی، ذیل میں صوفیاء کرام کی کتابوں سے حفاظت شریعت اور اتباع سنت کی تلقین کے چند حوالہ جات نذر قارئین کیے جاتے ہیں۔

صوفیائے کرام کا حفاظت شریعت اور اتباع سنت کی تلقین کرنا :

تیسری صدی ہجری کے بزرگ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ (م : ۲۹۷ھ) ارشاد فرماتے ہیں :

"این راہ کسے یابد کہ کتاب خدائے بر دست راست گرفتہ باشد، و سنت مصطفی ﷺ بر دست چپ، و در روشنائی این دو شمع می رود تا در مغاک شبہت افتد نہ در ظلمت بدعت"(۱)

"یہ راہ تو صرف وہی پا سکتا ہے جس کے سیدھے ہاتھ میں کتاب اللہ ہو اور بائیں ہاتھ میں سنت مصطفی ہو اور ان دونوں چراغوں کی روشنی میں راستہ طے کرے تاکہ نہ تو شبہے کے گڑھوں میں گرے اور نہ بدعت کے اندھیرے میں پھنسے"

حضرت علی روذباریؒ حضرت جنیدؒ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا :

۱۔ تذکرۃ الاولیاء فارسی ج ۲ ص ۸

"الی الله فهو الصادق المصیب"(۱)

"راستہ کھلا ہوا ہے اور کتاب و سنت ہمارے سامنے موجود ہیں اور صحابہ کرام کی فضیلت بھی معلوم ہے کہ انہوں نے ہجرت میں سبقت کی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت میں رہے' لہٰذا ہم میں سے جو شخص کتاب و سنت کا ساتھ دے اور اپنے نفس اور مخلوق سے دور رہے اور دل سے اللہ کی طرف ہجرت کرے وہی سچا اور راہ راست پر ہے۔"

حضرت ابو علی حسن بن علی جوزجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

"من علامات السعادة علی العبد تیسیر الطاعة علیه و موافقة السنة فی افعاله' و صحبته لاهل الصلاح و حسن اخلاقه مع الاخوان' و بزل معروفه للخلق و اهتمامه للمسلمین و مرعاته لاوقاته"(۲)

"بندہ کی نیک بختی کی علامت یہ ہے کہ اس پر خدا اور رسول کی اطاعت آسان ہو جائے اور اس کے افعال سنت کے مطابق ہو جائیں' اور اس کو نیک لوگوں کی صحبت نصیب ہو جائے' اور اپنے احباب و اخوان کے ساتھ اس کو حسن اخلاق کی توفیق ہو' اور خلق اللہ کے لیے اس کا نیک سلوک عام ہو' مسلمانوں کی غم خواری اس کا شیوہ ہو اور اپنے اوقات کی نگہداشت کرے۔

حضرت ابوالحسن وراق رحمہ اللہ (م :   ) فرماتے ہیں :

"لا یصل العبد الی الله الا بالله و بموافقة حبیبه صلی الله علیه وسلم فی شرائعه' و من جعل الطریق الی الوصول فی غیر الاقتداء یضل من حیث انه مهتدی"(۱)

۱۔ الرسالۃ القشیریہ ص ۳۱   ۲۔ الاعتصام للامام الشاطبی ج ۱ ص ۹۲

"بندہ اللہ تعالیٰ تک اللہ کی مدد اور احکام شرعیہ میں اس کے حبیب ﷺ کی اقتداء کے ذریعہ ہی پہنچ سکتا ہے' اور جو شخص وصول الی اللہ کے لیے سوائے اقتداء رسول کے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے گا تو وہ ہدایت کے حصول میں گمراہ ہو جائے گا۔"

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ (م : ۲۸۳ھ) فرماتے ہیں۔

"کل فعل یفعله العبد بغیر اقتداء طاعة کان او معصیة فهو عیش النفس یعنی باتباع الهوی و کل فعل یفعله العبد بالاقتداء فهو عتاب علی النفس یعنی لا نه لا هوی له فیه و اتباع الهوی هو المذموم و مقصود القوم ترکه البتة و قال اصولنا سبعة اشیاء التمسک بکتاب الله' والا قتداء بسنة رسول الله صلی الله علیه وسلم' و اکل الحلال' و کف الاذی' و اجتناب الآثام التوبة' و اداء الحقوق"(۲)

"بندہ جو فعل بغیر اقتداء کے کرتا ہے خواہ وہ طاعت ہو یا معصیت وہ عیش نفس ہے اور جو فعل اقتداء و اتباع سے کرتا ہے وہ نفس پر عتاب و مشقت ہے کیونکہ نفس کی خواہش کبھی اقتداء و اتباع میں نہیں ہو سکتی' نیز فرمایا ہمارے (یعنی صوفیاء کرام کے) سات اصول ہیں (۱) کتاب اللہ کے ساتھ تمسک (۲) رسول اللہ ﷺ کی سنت کی اتباع (۳) اکل حلال (۴) لوگوں کو ایذاء دہی سے بچنا (۵) گناہوں سے بچنا (۶) توبہ کرتے رہنا (۷) حقوق ادا کرنا۔"

غور فرمائیے : حضرت سہلؒ نے جو سنہری اصول صوفیاء کرام کے بتائے ہیں کیا ان اصولوں پر چلنے والوں کو باطنیت کی پیداوار اور شیعیت کا علمبردار کہا جا سکتا

۱۔ الاعتصام ج ۱ ص ۹۲   ۲۔ ایضاً ج ۱ ص ۹۴

ہے ؟

حضرت شیخ ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ (م : ۲۱۵ھ) فرماتے ہیں :

ربما تقع فی قلبی النکتة من نکتة القوم ایاما فلا اقبل منه الا بشاهدین عدلین– الکتاب و السنة"[۱]

"بسا اوقات میرے قلب میں معارف و حقائق اور علوم صوفیاء میں سے کوئی خاص نکتہ وارد ہوتا ہے- مگر میں اس کو دو عادل گواہوں کی شہادت کے بغیر قبول نہیں کرتا وہ دو عادل گواہ کتاب و سنت ہیں-"

حضرت شیخ احمد بن ابی الحواری رحمہ اللہ (م : ۲۳۰ھ) فرماتے ہیں :

من عمل عملا بلا اتباع سنة فباطل عمله"[۲]

"جو شخص اتباعِ سنت کے بغیر عمل کرتا ہے اس کا عمل باطل و بے کار ہے-"

حضرت ابو عثمان حیری رحمہ اللہ (م : ۲۹۸) فرماتے ہیں :

"الصحبة مع الله تعالیٰ بحسن الادب و دوام الهیبة و المراقبة' والصحبة مع رسول الله صلی الله علیه و سلم باتباع سنة و لزوم ظاهر العلم' و الصحبة مع اولیاء الله بالاحترام و الخدمة---- و لما تغیر علیه الحال مزق ابنه ابو بکر قمیصا علی نفسه ففتح ابو عثمان عینیه و قال خلاف السنة یا بنی فی الظاهر علامة ریاء فی الباطن"[۳]

"اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحبت و معیت تین چیزوں سے حاصل ہوتی ہے (۱) حسن ادب' (۲) دوامِ ہیبت (۳) مراقبہ' اور رسول اللہ صلی اللہ

۱- الاعتصام للامام الشاطبی ج ۱ ص ۹۴ ۲- الاعتصام للامام الشاطبی ج ۱ ص ۹۵
۳- ایضاً ج ۱ ص ۹۶-

علیہ وسلم کے ساتھ صحبت و معیت اتباعِ سنت اور علم ظاہر یعنی شریعت پر التزام کے ساتھ حاصل ہوتی ہے' اور اولیاء کرام کی صحبت و معیت ادب و احترام اور خدمت سے حاصل ہوتی ہے' آپ کی وفات کے وقت جب آپ کا حال متغیر ہوا تو صاحبزادے ابو بکر نے بوجہ شدتِ غم والم کے کپڑے پھاڑ ڈالے' ابو عثمان نے آنکھیں کھولیں اور فرمایا : بیٹا ظاہر اعمال میں سنت کے خلاف کرنا یہ باطن میں ریاء ہونے کی علامت ہے-"

حضرت ابراہیم خواص رحمہ اللہ (م : ۲۹۱ھ) فرماتے ہیں

لیس العلم بکثرة الروایة' و انما العالم من اتبع العلم و استعمل و اقتدی بالسنن و ان کان قلیل العلم[۱]

"علم کثرتِ روایت کا نام نہیں بلکہ عالم وہ ہے جو اپنے علم کا متبع ہو اور اس پر عمل کرے اور سنتوں کی پیروی کرے اگرچہ اس کا علم تھوڑا ہی کیوں نہ ہو-"

حضرت ابو حمزہ بغدادی رحمہ اللہ (م : ۲۸۹ھ) فرماتے ہیں :

" من علم طریق الحق سهل علیه سلوکه' و لا دلیل علی الطریق الی الله الامتابعة سنة الرسول صلی الله علیه وسلم فی احواله و افعاله و اقواله"[۲]

"جس شخص کو حق کا راستہ معلوم ہو جاتا ہے اس پر چلنا بھی آسان ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے راستے کے لیے اپنے تمام حوال و افعال و اقوال میں حضور ﷺ کی سنتوں کی اتباع سے بڑھ کر وئی رہبر و رہنما نہیں"

نام ص ۹۷ ۵- ایضاً ص ۹۷

حضرت ابوالقاسم نصر اباذی رحمہ اللہ (م : ۳۶۷ھ) فرماتے ہیں :

"اصل التصوف ملازمة الکتاب و السنة، و ترك البدع و الاهواء، و تعظیم حرمات المشائخ، و رؤیة اعذار الخلق، والمداو مة علی الاوراد، و ترك ارتکاب الرخص و التاویلات"(۱)

"تصوف کی بنیاد کتاب و سنت پر کاربند رہنا، بدعات اور خواہشات نفسانی کو چھوڑ دینا، مشائخ کی حرمتوں کی تعظیم کرنا، مخلوق کے اعذار کو قبول کرنا، اپنے وظیفہ پر مداومت کرنا، رخصتوں اور تاویلوں کو چھوڑ دینا ہے"

محبوب سبحانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ (م : ۵۶۱ھ) فرماتے ہیں :

"یا غلام صحبتك للاشرار توقعك فی سوء الظن بالاخیار، امش تحت ظل کتاب اللہ عزوجل و سنة رسوله صلی اللہ علیه وسلم و قد افلحت"(۲)

"صاحبزادے تیرا بدکاروں کے ساتھ رہنا تجھ کو نیکو کاروں سے بدگمانی کے اندر ڈال دے گا، اللہ و عزوجل کی کتاب اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی سنت کے سایہ کے نیچے چل یقیناً فلاح پائے گا"

مزید فرماتے ہیں :

"وعلیکم بالاتباع من غیر ابتداع، علیکم بمذهب السلف الصالح، امشوا الجادة المستقیمة لا تشبیه و لا تعطیل، بل اتباعا لسنة رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من غیر تکلف ولا تطبع ولا تشدد ولا تمشدق ولا تمعقل لیسعکم ما و سع من

۱- الاعتصام ج ۱ ص ۹۸ ۲- الفتح الربانی مترجم ص ۴۰

کان قبلکم"(۱)

"اپنے اوپر لازم سمجھو اتباع کو ایجاد و بدعات کے بغیر، لازم پکڑو سلف صالحین کے مذہب کو، چلو راہ مستقیم پر جس میں نہ تشبیہ ہو نہ تعطیل بلکہ اتباع ہو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا بلا تکلف بلا تصنع بلا تشدد اور لسانی و عقل کے تکے چلائے بغیر جس میں تمہارے پہلوں نے گنجائش سمجھی تم بھی گنجائش سمجھو"

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ (م : ۷۲۵ھ) اپنے اتباع و خدام کو اتباع سنت کی بڑی تاکید فرماتے تھے، سنن کے علاوہ تاکید تھی کہ مستحبات و آداب تک فوت نہ ہوں چنانچہ سیر الاولیاء میں آپ کا ارشاد منقول ہے۔

"استقامت می باید کہ بر متابعت رسول اللہ علیہ والصلوۃ باشد، و ہیچ مستحب و آدابے فوت نہ شود"(۲)

"رسول اللہ ﷺ کی پیروی و اتباع پر مضبوطی و ثابت قدمی دکھانی چاہیے اور کوئی مستحب و آداب بھی فوت نہ ہونے پائے۔"

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ (م : ۱۰۳۴ھ) نے اپنے مکاتیب میں جگہ جگہ اتباع سنت پر زور دیا ہے۔ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :

اے فرزند! آنچہ فردا بکار خواہد آمد متابعت صاحب شریعت است علیہ الصلوۃ والسلام والتحیۃ احوال و مواجید، و علوم و معارف، و اشارات و رموز اں متابعت جمع شوند فبہا و نعمت والا جز خرابی واستدراج نیست، سید طائفہ جنید را بعد از فوت شخصے بخواب دید و از حالش پرسید جنید در جواب او گفت :

طاحت العبارات و فنیت الاشارات و ما نفعنا الا رکیعات

۱- الفتح الربانی مترجم ص ۶۸ ۲- سیر الاولیاء ص ۳۱۸

رکعناها فی جو ف اللیل ' فعلیکم بمتابعته و متباعة خلفائه الراشدین علیه وعلیهم الصلوة والسلام و ایاکم و مخالفة شریعته قولا و عملاً و اعتقاداً فان الاولی یمن و برکة و الثانیة شوم و هلکة هذا"(۱)

"فرزند! روز قیامت کام آنے والی چیز صاحب شریعت حضرت محمد ﷺ کا اتباع ہے' صوفیاء کے حال' وجد علوم' معارف' رموز و اشارات اگر اس متابعت کے موافق ہوں تو بہت بہتر ورنہ سراسر خرابی اور عتاب ربانی کا سرمایہ ہیں' سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ کو کسی نے وفات کے بعد خواب میں دیکھا تو ان کی حالت دریافت کی' حضرت جنیدؒ نے جواب دیا:

"سارے رموز و اشارات ختم ہو گئے جملہ علوم و معارف ہیچ ثابت ہوئے' صرف ان چند رکعتوں نے کام دیا جو درمیان شب میں پڑھ لیا کرتا تھا' لہٰذا رسول اللہ ﷺ اور آپ کے خلفاء راشدین کے نقش قدم پر چلنے کو ضروری سمجھو' کیونکہ یہ برکت اور سراسر برکت ہے اور شریعت رسول اللہ ﷺ کی مخالفت سے پوری پوری طرح احتیاط برتو- نہ قولاً مخالفت ہو' نہ عملاً نہ اعتقاداً کیونکہ یہ مخالفت سراسر نحوست اور بربادی ہے-"

ایک اور مکتوب میں ارقام فرماتے ہیں:

"ذرہء ایں متابعت مرضیہ از جمیع تلذذات دنیاوی و تنعمات اخروی ہمراتب بہتر است فضیلت منوط بمتابعت سنت سنیہء اوست' و مزیت مربوط باتیان شریعت او علیہ و علی آلہ الصلوۃ والسلام والتحیۃ' مثلاً خواب

۱- مکتوبات امام ربانی ج ۲ ص ۷۰ حصہ سوم دفتر اول

نیمروزے کہ از روئے ایں متابعت واقع شود' از کرور کرور احیاء لیالی کہ نہ از متابعت ست اولیٰ و افضل است' و ہمچنین افطار یوم فطر کہ شریعت مصطفوی بآں امر فرمودہ است از صیام ابد الاباد کہ نہ ماخوذ از شریعت اند بہتر ست' اعطاء جیتلے بامر شارع از انفاق کوہ زر کہ از خود باشد فاضل تراست' امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ روزے نماز بامداد را جماعت ادا کردہ در اصحاب نگاہ کرد' یک کس را حاضر نیافت' پرسید' اصحاب عرض کردند کہ آنکس تمام شب را زندہ میدارد شاید دریں وقت خوابش بردہ باشد' امیر المومنین فرمود کہ اگر او تمام شب خواب می کردے و نماز با مواد را جماعت می گزاردے بہتر بودے' اہل ضلالت ریاضات و مجاہدات بسیار کردہ اند' اما چوں موافق شریعت حقہ نیستند بے اعتبار و خوار اند' اگر اجرے براں اعمال شاقہ مرتب می شود ہم مقصود بہ بعضے منافع دنیوی ست تمام دنیا چیست تا بعضے منافع او را کسے اعتبار بنہد مثل ایشاں مثل کناسے ست کہ ریاضتش از ہمہ بیش ست و اجرتش از ہمہ کمتر' مثل تابعان شریعت مثل آں جماعت ست کہ در جواہر نفیسہ بالماسات لطیفہ کار می کنند' عمل اینہا در نہایت قلت ست و اجر ایشاں در غایت رفعت' عمل یک ساعت تواند بود کہ باجر صد ہزار برابر بود' سر آنست عمل کہ بموافقت شریعت واقع می شود مرضی حق ست سبحانہ و خلاف آں نامرضی او تعالیٰ پس در نامرضی چہ جائے ثواب بلکہ متوقع عتاب ست ایں معنی را در عالم مجاز شاہد واضح ست باندک التفات ظہور می آید بیت ہرچہ گیرد علتی علت شود' کفر گیرد کاملے ملت شود' پس سرمایہء جمیع سعادات متابعت سنت ست و ہیولائے جمیع فسادات خلاف شریعت"(۱)

۱- مکتوب ۱۱۴ دفتر اول حصہ دوم ص ۱۱۸

اس مبارک اور پسندیدہ متابعت کا ایک ذرہ دنیا کی تمام لذتوں اور آخرت کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے۔ فضیلت صرف آپ ﷺ کی روشن سنت کی متابعت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے' اور درجہ و مرتبہ صرف اور صرف آپ کی لائی ہوئی شریعت پر عمل کرنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ مثلاً قیلولہ جو رسول اکرم ﷺ کی متابعت کی نیت سے کیا جائے وہ ان کروڑوں شب بیداریوں سے افضل ہے جو متابعت رسول اللہ ﷺ سے محروم ہوں عید الفطر کے دن روزہ نہ رکھنا جس کا شریعت نے حکم فرمایا ہے ابد الاباد روزے رکھنے سے افضل ہے' حکم شارع کے مطابق ایک پیسہ خرچ کرنا اپنی مرضی سے سونے کے پہاڑ خرچ کرنے سے افضل ہے' ایک روز امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ کر نمازیوں کو دیکھا تو ایک صاحب کو نہ پایا ان کے متعلق استفسار کیا تو صحابہء کرام نے عرض کیا وہ شخص ساری رات شب بیداری میں گزارتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس وقت نیند غالب آگئی ہو اور سو گیا ہو' امیر المومنین نے فرمایا: اگر وہ شخص ساری رات سوتا رہتا لیکن فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھتا تو یہ بہتر تھا۔ اہل ریاضت بہت کچھ مجاہدے کرتے ہیں لیکن چونکہ وہ شریعت حقہ کے موافق نہیں ہیں اس لیے سب بے کار و بے سود ہیں' اگر ان اعمال شاقہ پر کوئی اجر بھی مرتب ہوتا ہے تو وہ صرف دنیاوی' دنیا کا کوئی نفع تو دُور کنار ساری دنیا ہی بے حقیقت ہے' ایسے لوگوں کی مثال بھتنی جیسی ہے اس کی ریاضت و محنت سب سے زیادہ مگر اس کی اجرت سب سے کم' شریعت مطہرہ کے پیرو گویا جوہری اور صراف ہیں کہ ان کا کام بہت کم ہے لیکن نفع بہت زیادہ۔ ان کی ایک

گھڑی کا عمل ہو سکتا ہے کہ ہزار گھڑیوں کے اجر کے برابر ہو جائے' راز یہ ہے کہ جو فعل شریعت کے موافق ہو گا وہ خداوند عالم کا پسندیدہ ہو گا اور اس کے خلاف ناپسند ہو گا' پس ناپسندیدہ عمل پر کیا ثواب مل سکتا ہے بلکہ وہ تو موجب عقاب و عتاب ہے' اس معنی کا عالم مجاز میں ایک کھلا شاہد موجود ہے جو تھوڑے سے التفات سے معلوم ہو سکتا ہے

شعر:

ہر چہ گیرد علتی علت شود
کفر گیرد کاملے ملت شود

خلاصہء کلام یہ ہے کہ تمام سعادتوں کا سرمایہ اتباع سنت ہے اور جملہ خرابیوں کا ہیولا شریعت کی مخالفت ہے۔"

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ (م: ۱۰۵۲ھ) اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"لازم است اتباع سنت سنیہء او در عبادات و عادات و اعتقاد باید کرد کہ ہر چہ خلاف سنت و طریقہء او است باطل است' و ہر چہ پیدا کردہ اند و ہر کہ پیدا کردہ است از آنچہ بدان تغیر سنت و مخالفت آن لازم آید قولاً و عملاً و اعتقاداً ضلالت است و مردود قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احدث فی امرنا ھذا ما لیس منہ فھو رد' فرمود کل محدث بدعۃ و کل بدعۃ ضلالۃ و گفتہ اند ہر گز در دلے کہ گرفتار بدعت است نور ولایت در نیاید (۱)"

عبادات و عادات میں حضور اکرم ﷺ کی روشن و منور سنت کی اتباع لازم و ضروری ہے اور یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ جو چیز بھی آپ کی سنت

۱۔ ملفوظات شیخ عبدالحق برحاشیہ اخبار الاخیار ص ۹۴

اور آپ کے طریقہ کے خلاف ہے وہ باطل و بے کار ہے جو چیز بھی لوگوں نے دین میں ایجاد کر لی ہے۔ جس نے بھی کی ہے اگر اس چیز سے سنت کی تبدیلی اور اس کی مخالفت لازم آتی ہے خواہ وہ مخالفت قولاً ہو عملاً ہو یا اعتقاداً وہ گمراہی ہے اور مردود ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے جس نے بھی ہمارے اس امر (یعنی دین) میں کوئی بات پیدا کی وہ رد ہے' نیز فرمایا دین میں ایجاد کی جانے والی ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ جو دل بدعت میں گرفتار ہو اس میں ہرگز ہرگز نور ولایت نہیں ہو سکتا"

قارئین محترم ہم نے یہ چند اقوال اکابر صوفیاء کرام کے محافظت شریعت اور متابعت سنت کی تلقین وہدایت سے متعلق ذکر کیے ہیں طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو مزید اقوال بھی نقل کیے جا سکتے تھے' صوفیاء کرام کے ان اقوال پر غور فرمایئے انہوں نے کس قدر صاف صاف فرمادیا ہے کہ ہمارا مذہب کتاب و سنت کے اصولوں کا پابند ہے تصوف کی اساس وبنیاد کتاب و سنت پر کاربند رہنا ہے۔ سلوک طریقت کی راہ وہی شخص پا سکتا ہے جس کے دائیں ہاتھ میں کتاب اللہ اور بائیں ہاتھ میں سنت رسول اللہ ﷺ ہو' آخرت میں کام آنے والی چیز حضور ﷺ کی اتباع ہے اب ایک طرف ان اقوال کو لیجیے اور دوسری طرف زمانہ ء حال کے ناقدین کو لیجیے جو تحقیق و تفتیش کے سارے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر یہ زہر پھیلا رہے ہیں کہ معاذ اللہ صوفیائے کرام شریعت کے خلاف باطنیت کی پیداوار اور شیعیت کے علمبردار ہیں سوچنے کا مقام ہے کہ جو اپنا مذہب کتاب و سنت کے اصولوں کا پابند بتاتے ہوں۔ تصوف کی اساس وبنیاد کتاب و سنت پر کاربند رہنے کو قرار دیتے ہوں ان میں اور باطنیت کے پیروکاروں شیعیت کے علمبرداروں میں کسی قسم کی کوئی مماثلت پائی جاتی ہے جس کی بناء پر صوفیا کرام کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ ہم اس بات

ول دینے کے بجائے قارئین پر چھوڑتے ہیں وہ خود فیصلہ کریں کہ ناقدین تصوف کس حد تک حق جانب ہیں؟

صوفیائے کرام اتباع شریعت و سنت کی روشنی میں:

قارئین کرام اوپر آپ نے کتاب و سنت کی اتباع کی تاکید و تلقین سے متعلق اکابر صوفیاء کرام کے اقوال ملاحظہ فرمائے اب یہ بھی دیکھتے چلیں کہ صوفیاء کرام کے یہ اقوال صرف تلقین و تاکید کی حد تک نہیں ہیں بلکہ ان کی زندگیاں کتاب و سنت کی اتباع سے معمور و مزین ہیں وہ زندگی کے ہر شعبہ میں کتاب و سنت کی اتباع کو ترجیح دیتے نظر آتے ہیں' عقائد ہوں یا اعمال' معاشرت ہو یا معیشت' اجتماعیت ہو یا انفرادیت ہر معاملہ میں ان کی نگاہ کتاب و سنت کی اتباع پر ہے' وہ شریعت کے کسی عقیدہ سے انحراف تو دور کی بات ہے شریعت کے کسی ادب سے انحراف کو بھی گوارا نہیں کرتے' اس سلسلہ میں چند صوفیاء کرام کے واقعات ذکر کیے جاتے ہیں ملاحظہ فرمایئے۔

امام قشیری (م: ۴۶۵ھ) سرخیل صوفیاء حضرت بایزید بسطامی (م: ۲۶۱ھ) کا ایک واقعہ اپنی سند سے ذکر فرماتے ہیں:

"عمی بسطامیؒ کا کہنا ہے کہ میں نے اپنے والد سے سنا وہ فرما رہے تھے کہ مجھ سے حضرت بایزید بسطامیؒ نے فرمایا: چلو ذرا چل کر اس بندہ کی زیارت کر آئیں جس نے اپنے بارے میں یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اسے ولایت حاصل ہے' زہد و عبادت میں بھی اس کی بڑی شہرت ہے' چنانچہ ہم اس کی زیارت کو چلے' جب ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ صاحب گھر سے مسجد میں آئے اور آتے ہوئے راستے میں انہوں نے قبلہ کی طرف منہ کر کے تھوکا' یہ دیکھ کر حضرت بایزید بسطامیؒ واپس چلے آئے اور

اسے سلام تک نہیں کیا' فرمایا: جو شخص رسول اکرم ﷺ کے آداب
میں سے ایک ادب کا بھی خیال نہیں رکھ سکتا وہ اس چیز (ولایت) کا کیا
خیال کرے گا جس کا وہ دعویدار ہے"(۱)

پیچھے آپ پڑھ آئے ہیں کہ حضرت ابو عثمان حیریؒ کی وفات کے وقت جب
حالت متغیر ہونے لگی تو صاحبزادہ نے شدت غم والم کے سبب کپڑے پھاڑ ڈالے'
آپ نے اس حالت میں کہ جان کنی کا عالم تھا آنکھیں کھولیں اور فرمایا:

"بیٹا ظاہر اعمال میں سنت کے خلاف کرنا یہ باطن میں ریاء ہونے کی
علامت ہے"

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ (م: ۲۹۷ھ) کے اقوال اتباع سنت کے
سلسلہ میں آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں اب ذرا حضرت جنیدؒ کا اتباع سنت کا حال بھی
ملاحظہ فرماتے چلیں

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"حضرت جنیدؒ کی خدمت میں ایک شخص دس برس رہا چلتے وقت عرض
کیا کہ حضرت میں نے اتنی مدت خدمت میں قیام کیا لیکن کبھی کوئی
کرامت آپ کی نہیں دیکھی' میں نے سنا تھا کہ آپ بہت بڑے کامل
ہیں اسی لیے خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ کچھ فیض حاصل کر لوں گا مگر
اتنی مدت قیام کو گزر گئی کوئی کرامت آپ سے کبھی صادر نہیں ہوئی یہ
سن کر آپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا' جوش میں آکر فرمایا: کہ اچھا یہ
بتلا جنید سے تو نے اس عرصہ میں کوئی فعل سنت کے خلاف ہوتے بھی
کبھی دیکھا ہے؟' اس نے کہا نہیں یہ بات تو نہیں دیکھی' اس پر آپ نے
جوش میں آکر فرمایا: ارے پھر اس سے بڑھ کر جنید کی اور کیا کرامت

۱- الرسالۃ القشیریہ عربی ص ۱۵

ہو گی کہ اس نے دس برس تک اپنے خدا کو ایک لمحہ کے لیے بھی
ناراض نہیں کیا' اس سے بڑھ کر اور کیا کرامت تو جنید کی دیکھنا چاہتا
ہے"(۱)

حضرت امیر حسن علاء سجزی رحمہ اللہ (م: ۷۳۶ھ) "فوائد الفواد" میں
حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء (م: ۷۲۵ھ) کی ایک مجلس کا تذکرہ کرتے
ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس کے بعد سماع کا ذکر نکلا' حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ
شاید اس وقت حکم ہو گیا ہے کہ مخدوم جب چاہیں سماع سنیں ان کے
لیے حلال ہے۔ خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے فرمایا جو چیز حرام ہے کسی کے
حکم سے حلال نہیں ہو جاتی اور جو چیز حلال ہے وہ کسی کے حکم سے حرام
نہیں ہو سکتی' اور اگر ہم ایسے مسئلہ پر آئیں جس کے بارے میں اختلاف
ہو جیسے کہ یہی سماع کا فتویٰ ہے تو امام شافعیؒ ہمارے علماء کے بر خلاف
سماع کو دف اور چغانہ کے ساتھ مباح رکھتے ہیں' اب اس اختلاف میں
حاکم جس رائے کے مطابق حکم دے ویسا ہی ہو گا۔ حاضرین میں سے
ایک شخص نے کہا: انہی دنوں بعض آستانہ دار درویشوں نے ایک
ایسے مجمع میں جہاں چنگ ورباب اور مزامیر تھے خوب رقص کیا۔ خواجہ
ذکرہ اللہ بالخیر نے فرمایا کہ انہوں نے اچھا نہیں کیا' جو چیز غیر شرعی ہے
ناپسندیدہ ہے اس کے بعد ایک آدمی نے کہا کہ جب وہ لوگ اس جگہ
سے باہر آئے تو ان سے کہا گیا کہ یہ آپ حضرات نے کیا کیا؟ اس محفل
میں مزامیر تھے سماع کیوں سنا اور رقص کیوں سنا کیا؟ انہوں نے جواب
دیا کہ ہم سماع میں ایسے ڈوبے ہوئے تھے کہ پتہ ہی نہ چلا کہ وہاں

۱- حقیقت تصوف و تقویٰ ص ۲۹۵

مزامیر ہیں یا نہیں خواجہ ذکر اللہ بالخیر نے یہ بات سنی تو فرمایا کہ یہ جواب بھی کچھ نہیں ہے۔ یہ بات تو ہر گناہ کے بارے میں لکھی جا سکتی ہے۔"(۱)

حضرت شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ (م: ۱۰۵۲ھ) حضرت سلطان جی کے خلیفہ اعظم حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی رحمہ اللہ (م: ۷۵۷ھ) کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں۔

"نقل ہے کہ ایک روز سلطان نظام الدین اولیاءؒ کے بعض مرید کسی مجلس میں جمع تھے اور عورتوں کا دف سے گانا سنتے تھے، شیخ نصیر الدین محمود مجلس میں تھے اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ باہر چلے جائیں یاران طریقت نے بیٹھنے پر زور دیا تو فرمایا: یہ سنت کے خلاف ہے، لوگوں نے کہا کہ سماع کا انکار کرتے ہو اور پیر کا طریقہ چھوڑتے ہو؟ فرمایا:
"حجت نمی شود، دلیل از کتاب و حدیث می باید" پیر کا طریقہ دلیل اور حجت نہیں، قرآن اور حدیث سے دلیل بیان کرنی چاہیے۔ بعض مخالفوں نے اس واقعہ کی خبر حضرت شیخ نظام الدینؒ کو کر دی کہ شیخ محمود ایسا کہہ رہے ہیں حضرت شیخ کو ان کا صدق معاملہ معلوم تھا، فرمایا: شیخ محمود درست کہتے ہیں حق وہی ہے جو وہ کہتے ہیں،
"سیر الاولیاء" میں لکھا ہے کہ شیخ نظام الدینؒ کی مجلس میں مزامیر نہ ہوتے تھے اور تالی نہ بجاتے تھے، اور اگر کوئی شخص احباب کی طرف سے ان کی خدمت میں عرض کرتا کہ مزامیر سنتے ہیں تو ان کو منع کرتے اور فرماتے کہ یہ کام اچھا نہیں ہے۔"(۲)

حضرت چراغ دہلیؒ کے اتباع شریعت کی شہادت ملاحظہ فرمائیے، حضرت شا

۱۔ فوائد الفواد فارسی اردو ص ۹۵۳ اردو اکادمی دہلی۔ ۲۔ اخبار الاخیار فارسی ص ۸۲

عبدالحقؒ صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"ایک مرتبہ سلطان محمد تغلق نے آپ کے پاس سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھانا بھیجا اور سبب اس کا بجز ایذا دہی کے اور کچھ نہ تھا کہ اگر میرا کھانا نہ کھایا تو اس کو ہی تکلیف پہنچانے کا بہانہ بنادوں گا اور اگر کھا لیا تو مجھے یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ زریں پیالہ میں کھایا شریعت کے خلاف لیا، حضرت شیخ نے منہ سے کچھ نہ فرمایا اور اس طرح کیا کہ سونے کے پیالہ میں سے یخنی نکال کر ہاتھ پر لی پھر ہاتھ پر سے اٹھا کر زبان پر رکھی اور کھا لیا" اس بد اندیش کی اس طرح کھانے سے مراد پوری نہ ہوئی۔"(۱)

ملاحظہ فرمائیے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ کس صاف گوئی سے فرما رہے ہیں کہ:

"جو چیز حرام ہے وہ کسی کے حکم سے حلال نہیں ہو جاتی اور جو چیز حلال ہے وہ کسی کے حکم سے حرام نہیں ہو جاتی"

آپ نے امور منکرہ کی حمایت کے بجائے صاف طور پر فرمایا:

"کہ انہوں نے اچھا نہیں کیا جو چیز غیر شرعی ہے ناپسندیدہ ہے"۔

آپ کے خلیفہ اعظم کے طرز عمل پر بھی نظر ڈالیے وہ کس قدر حق گوئی کا مظاہرہ کر رہے کہ فرماتے ہیں:

"پیر کا طریقہ دلیل و حجت نہیں قرآن و حدیث سے دلیل بیان کرنی چاہیے"

جب بادشاہ ان سے غیر شرعی کام کرانا چاہتا ہے تو کس قدر لطیف انداز سے اس سے بچتے ہیں۔ تصوف کو باطنیت کی پیداوار کہنے والے ذرا فرمائیں کیا باطنیت اسی

۱ اخبار الاخیار ص ۸۱ ۳۔ السنۃ الجلیۃ ص ۴۳

کو کہتے ہیں؟

حضرت چراغ دہلیؒ کے ایک خلیفہ حضرت سید جلال الدین عاریؒ المعروف مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمہ اللہ (م: ۷۸۵ھ) ہیں آپ کے حالات میں شریعت کی پابندی کے عنوان کے تحت پروفیسر صباح الدین رقمطراز ہیں۔

"تصوف و عرفان کے اعلیٰ مدارج طے کرنے کے باوجود زندگی شروع سے آخر تک پابندی شریعت اور اتباع سنت میں گزری، راہ سلوک کی خواہ کسی منزل میں رہے، لیکن شریعت کا دامن کسی حال میں نہیں چھوڑا، خود فرماتے ہیں کہ حقیقت شریعت ہے اور جب تک کوئی شریعت کو مضبوط نہ پکڑے گا ہرگز حقیقت کو نہ پہنچ سکے گا۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ جو شخص شریعت سے عاری ہے، وہ طریقت و حقیقت کو نہیں جان سکتا، شریعت بمنزلہ میوے کے ہے، اور طریقت و حقیقت اس میوہ کے مغز کے مشابہ ہیں۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شیخ طریقت اور حقیقت سے آشنا ہے لیکن شریعت سے واقف نہیں تو وہ شیخ نہیں جاہل ہے، کوئی صالح اور نیک آدمی اس وقت تک ولی نہیں ہو سکتا جب تک شریعت، طریقت اور حقیقت تینوں کا علم اس کو حاصل نہ ہو۔"

آپ جاہل شیخ کو کسی حال میں برداشت نہ کرتے، ایک مرتبہ ایک شہر اچہ میں وارد ہوا، وہ اپنے کو ولی اللہ کہتا تھا، اس کے پاس عوام و خواص کا ہجوم رہنے لگا، حضرت سید جلال الدین بھی اس سے ملنے تشریف لے گئے، جب اس کے پہلو میں جا کر بیٹھے تو اس نے کہا:

"اے سید! ابھی ابھی حق تعالیٰ میرے پاس سے گیا ہے"

حضرت جلال الدین یہ سن کر غضبناک ہوئے، اور فرمایا:

"اے بدبخت! تو تو کافر ہو گیا، پھر سے کلمہ شہادت پڑھ اور اسی وقت اٹھ کر شہر کے قاضی کے پاس آئے کہ اس بدبخت کو طلب کرو، اگر وہ توبہ کرے تو معاف کر دو" ورنہ اس کو قتل کرنے کا حکم دو، مقطع شہر اس شخص کا معتقد ہو چلا تھا اس لیے قاضی نے مقطع کے خوف سے سزا دینے میں پس و پیش کیا، حضرت جلال الدین نے مقطع کے پاس پیام بھیجا کہ ایک جھوٹا شخص کفر پھیلا رہا ہے، اگر تم نے اس کو سزا نہ دلائی تو پھر بادشاہ سے جا کر کہوں گا، بالآخر وہ شخص شہر بدر کیا گیا۔

تارک صلوٰۃ کو بھی ولی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے، اپنے ملفوظات میں فرماتے ہیں کہ مکہ معظمہ سے بھکر واپس آیا تو لوگ مجھ سے ملنے آئے، انہوں نے کہا کہ قصبہ الور کے پاس ایک پہاڑ کے غار میں ایک درویش رہتا ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے نماز معاف کر دی ہے، یہ سن کر میں اس کے پاس گیا، وہاں امراء اور دوسرے اکابر کا ہجوم تھا، اس ہجوم سے گزر کر میں کسی طرح اس کے پاس پہنچا، میں نے اس کو سلام نہیں کیا، بلکہ جا کر بیٹھ گیا، اور پوچھا کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتے، حضور ﷺ کا قول ہے:

الفرق بین المومن و الکافر الصلوٰۃ

یعنی مومن اور کافر کے درمیان صرف نماز فرق کرتی ہے۔

درویش نے جواب دیا۔ سید میرے پاس جبرئیل آتے ہیں، بہشت کا کھانا لاتے ہیں، خدائے تعالیٰ کا سلام پیش کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ تمہارے لیے نماز معاف کر دی گئی اور تم مقرب خاص ہو گئے ہیں (یعنی سید جلال الدین) نے کہا کہ بیہودہ مت بکو محمد رسول ﷺ کے لیے تو نماز معاف ہی نہیں ہوئی تجھ جیسے جاہل کے لیے کیسے معاف ہو سکتی ہے، وہ تو شیطان ہے جو تیرے پاس آ کر کہتا ہے کہ میں جبریل

ہوں' جبریل وحی کے فرشتے ہیں وہ پیغمبر کے سوا کسی اور کے پاس نہیں
آتے' اور وہ جو کھانا تمہارے پاس آتا ہے وہ غلیظ ہے' درویش نے کہا کہ
وہ کھانا بہت ہی لذیذ ہوتا ہے۔ اس میں لذت محسوس کرتا ہوں' میں
نے کہا کہ اب جب وہ فرشتہ آئے تو لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم
پڑھنا' میں دوسرے دن جب اس درویش کے پاس گیا' تو وہ میرے
پاؤں پر گر پڑا' اور کہنے لگا کہ میں نے تمہاری بات پر عمل کیا' اور جب وہ
فرشتہ آیا تو میں نے لاحول پڑھا' وہ میرے سامنے سے غائب ہو گیا' اور
جو کھانا اس نے دیا وہ غلیظ ہو کر میرے ہاتھ سے گر پڑا' اور میرے
سارے کپڑے نجس ہو گئے' اس کے بعد حضرت سید جلال الدین
فرماتے ہیں کہ میں نے اس بے نمازی درویش سے توبہ کرائی اور اس کی
جو نمازیں فوت ہوئی تھیں ان کی قضا پڑھوائی۔

اپنے مریدوں کو نماز باجماعت کی بڑی تاکید فرماتے' اور جماعت کے
تارک کو ارشاد نبویؐ کی بنا پر ملعون اور بدعتی کہتے' اپنی ایک مجلس میں
اس حدیث کی خاص طور پر تصریح کی کہ جو شخص محلے کی مسجد کی اذان
سنے اور نماز کے لیے نہ جائے تو اس کی قبر میں کیڑے نہ مریں گے۔
اور اس کی قبر سے آگ نہ بجھے گی' وہ ہر وقت عذاب میں رہے گا۔

سفر و سیاحت میں تنہا ہوتے تو خود ان کا بیان ہے کہ عین نماز کے وقت
کہیں سے ابدال آجاتے' اور اس طرح جماعت کا ثواب مل جاتا۔(۱)

آگے مصنف اتباع سنت کے عنوان کے تحت رقمطراز ہیں۔

"اپنی ایک مجلس میں فرمایا کہ ایک سالک کو چاہیے کہ سرور عالم ﷺ کی
متابعت کرے' اسی کے ذریعہ سے اللہ تبارک تعالیٰ کی قربت حاصل

۱۔ بزم صوفیہ ص ۴۷۳

ہو گی' اہل بدعت' بدعت کو قربت جانتے ہیں' اور وہ لوہا' تانبا پہنتے ہیں'
ڈاڑھی ترشواتے ہیں' جیسا کہ قلندر کیا کرتے ہیں' لیکن اس طرح
قربت حاصل نہیں ہوتی' بلکہ بعد و ضلالت پیدا ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ
فرماتا ہے۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ' ای
فاتبعونی بالافعال والاقوال والاحوال' یعنی اے محمدؐ! تم لوگوں
سے کہدو کہ اگر تم خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہو' تو تم میرے افعال'
اقوال اور احوال کی پیروی کرو' پس اللہ تم کو دوست رکھے گا۔"(۱)

قارئین محترم انصاف فرمائیے' ان اقتباسات کو پڑھ کر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ
صوفیاء کرام کتاب و سنت سے ہٹ کر شیعیت و باطنیت کے پیروکار تھے۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء رحمہ اللہ (م: ۷۶۵ھ) کے خلیفہ اعظم
حضرت شیخ احمد عبدالحق رودولویؒ (م: ۸۳۶ھ) کے حالات میں پروفیسر
موصوف تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت پیر دستگیر
حضرت شیخ احمد عبدالحق دائم الحال تھے۔ ہر وقت احوال کے دریا میں
غرق رہتے تھے' اگر کوئی قرابت دار' دوست اور ہمسایہ تک آپ سے
ملنے کے لیے آتا تو اس کو نہ پہچانتے' پوچھتے تم کون ہو؟ وہ عرض کرتا
میں فلاں ہوں' فرماتے فلاں کون؟ وہ عرض کرتا فلاں ابن فلاں اس
طرح جب کئی پشتوں کی وضاحت ہو جاتی تو اس وقت آپ پہچانتے' اور
فرماتے ہاں فلاں شخص تو ہمارا ہے۔" (۲)

لیکن اس محویت اور استغراق کے باوجود نماز باجماعت کا بڑا اہتمام تھا'

۱۔ بزم صوفیہ ص ۴۷۳ تا ص ۴۷۷ ۲۔ بزم صوفیہ ص ۶۱۱

پانچوں وقت کی نماز رودولی کی جامع مسجد میں پڑھتے تھے- ایک خادم آگے آگے حق حق کی صدا لگاتا جاتا تھا اور وہ اس کی آواز پر راستہ طے کرتے تھے- چالیس پچاس سال تک جامع مسجد میں نماز (باجماعت) پڑھی لیکن راستے کا اندازہ نہ ہوا، مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے تھے، پوری رات شب بیداری میں بسر ہوتی تھی، کامل بتیس سال تک تکیہ پر سر نہ رکھا-" (۱)

"اس تحیر و استغراق کے باوجود جو حضرت مخدوم پر طاری رہتا حفظ و احترام شریعت کا بڑا اہتمام تھا، ایک مرتبہ وہ پنجاب میں تھے کہ غلبہء حال میں ان کی زبان سے بعض شطحیات نکل گئے، جب ہوش آیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ ایسے ایسے کلمات آپ کی زبان سے نکلے ہیں، انہوں نے سن کر فرمایا: "اعوذ باللہ منہا میں گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو گیا-" اور اس کے کفارہ میں سخت سردی کے موسم میں دریائے سندھ میں گلے گلے پانی میں اتر کر کئی مہینے رات سے صبح تک "دین محمد قائم دائم، دین محمد قائم دائم" کا ورد کرتے رہے- سردی کی شدت سے بدن کی کھال پھٹ کر خون جاری ہو گیا تھا- اس لیے صبح کو تازہ غسل کر کے فجر کی نماز پڑھتے-" (۲)

کہاں ہیں صوفیاء کرام پر تنقید کرنے والے؟ وہ آئیں اور جواب دیں کہ کیا وہ شریعت کی حفاظت کا ایسا تصور بھی کر سکتے ہیں جیسا کہ صوفی کامل حضرت شیخ احمدؒ نے کیا؟ کیا وہ حفظ شریعت میں نفس کا ایسا محاسبہ سوچ سکتے ہیں جو اس ولی کامل نے کیا؟

پروفیسر سید صباح الدین حضرت شیخ احمدؒ کے حالات میں مزید لکھتے ہیں:

۱- بزم صوفیہ ص ۶۱۲   ۲- ایضاً ص ۶۱۲

"مریدوں کو اتباع سنت کی ہدایت فرماتے تھے، اپنے ایک محبوب مرید شیخ ختیار کو مراحل سلوک طے کرانے کے بعد فرمایا کہ تم نے رسول اکرم ﷺ کے اتباع کے طفیل میں خدا کو پا لیا- کما قال اللہ "قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ" دونوں جہان کو زیر قدم چھوڑ کر بلند ترین مقام پر فائز ہو گئے- "من له المولیٰ فله الکل"، شیخ عبدالقدوس لکھتے ہیں کہ شیخ ختیار کی کوئی بات اور کوئی گفتگو کتاب اللہ اور احادیث رسول اللہ ﷺ کے سوا نہیں ہوتی تھی-"(۱)

ذرا آگے چلیے انہی حضرت شیخ احمدؒ سے روحانی فیض پانے والے ایک بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ (م: ۹۴۴ھ) ہیں جو سلسلہ چشتیہ کی رونق ہیں ان کے حالات دیکھیے اور اندازہ کیجیے کہ صوفیاء کرام اتباع سنت اور مذہب اہل سنت کے کس قدر پابند ہیں- حضرت تھانوی رحمہ اللہ آپ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں-

"ایک بار شیخ (عبدالقدوس گنگوہیؒ) دہلی میں آئے ہوئے تھے- شیخ حاجی عبدالوہاب بخاری جو کہ سید جلال الدین بخاری کی اولاد میں سے تھے- عالم اور صاحب حال تھے انہوں نے اپنی لکھی ہوئی تفسیر کو شیخ کے پاس بھیجا، شیخ نے اس کو کھولا تو حضور اقدس ﷺ کے اہل بیت کی طہارت کے متعلق جو آیت ہے وہ نظر پڑی - اس مقام پر شیخ عبدالوہاب نے لکھا تھا کہ نبی کی تمام اولاد خاتمہ سے بے خوف ہے اور ان کا خاتمہ یقیناً بالخیر اور اچھا ہوتا ہے- شیخ عبدالقدوس نے اس کے حاشیہ پر لکھا کہ یہ مضمون مذہب اہل سنت کے خلاف ہے اور کتاب کو

بزم صوفیہ ص ۶۱۳

واپس کر دیا وہاں اس مسئلہ کے اندر بہت دنوں تک علماء میں گفتگو ہوتی رہی - بالآخر جو کچھ شیخ عبدالقدوس نے فرمایا تھا اس کو سب نے برقرار رکھا -"(۱)

نبیرہ قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ رقمطراز ہیں :

"ایک مرتبہ آپ کے سامنے کسی بزرگ کا ذکر کیا گیا' آپ کو ان سے ملنے کا شوق پیدا ہوا اور تشریف لے گئے - وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ وہ صاحب ابھی ابھی اپنے عبادت خانہ سے نکل کر اڑتے ہوئے کسی جگہ تشریف لے گئے ہیں - حضرت شیخ نے ان کے عبادت خانہ ہی کی زیارت غنیمت سمجھی اور اندر تشریف لے گئے' دیکھا کہ کثرت عبادت سے نماز کی جگہ ان کے ہاتھ گھٹنے اور سر ٹیکنے کے نشان پڑ گئے ہیں' لیکن نشانات میں ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان فصل ہے (جو طریقہء مسنونہ کے خلاف ہے) آپ نے فرمایا وہ شخص کیا بزرگ ہوگا جس کا نماز میں بھی سنت نبوی پر عمل نہیں اور واپس تشریف لے آئے -"(۲)

"شریعت کا مسئلہ ہے کہ انبیاء کی نیند ناقض وضوء نہیں کیونکہ فی الحقیقت نیند نہیں' یہ حقیقت انبیاء کے لیے مخصوص ہے لیکن اولیاء بھی اس دولت سے بہرہ مند ہوتے ہیں - یعنی بعض مراتب طے کرنے کے بعد ان کی نیند بھی حقیقتاً نیند نہیں رہتی' لیکن ناقض وضوء نہ ہونے کا حکم اولیاء کو نہیں دیا جاتا' شیخ خان' حضرت شیخ کے ایک خلیفہ تھے - جنہیں یہ نعمت حاصل ہوئی اور نیند کو عین بیداری محسوس کرنے لگے' تو بہ خیال خود تجدید وضوء ترک کر دی' حضرت شیخ کو معلوم ہوا تو منع فرمایا کہ رعایت شرع ضروری ہے تم ہمیشہ تجدید وضوء کیا کرو -"(۳)

۱- السنۃ الجلیہ ص ۷۳ ۲- سیرت قدوسیہ ص ۳۲ ۳- سیرت قدوسیہ ص ۳۲

حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی شخصیت سے کون ناواقف ہے - آپ کے تجدیدی کارناموں سے کسے انکار ہو سکتا ہے ؟ اتباع سنت و شریعت کے بارے میں آپ کے افکار قارئین پیچھے ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ کس شدت کے ساتھ آپ اپنے متعلقین کو اتباع سنت اور اجتناب عن البدعت کی تاکید فرماتے تھے - اب ذرا حضرت مجدد صاحب کے حفظ شریعت اور شعار اہل سنت کی حفاظت کا حال بھی ملاحظہ فرمائیں -

تاریخ بتلاتی ہے کہ حضرت مجدد صاحبؒ کے حاسدین و معاندین نے جب جہانگیر بادشاہ کو حضرت مجدد صاحب پر غلط الزامات لگا کر برگشتہ کیا تو بادشاہ کو بھڑکانے کے لیے یہ بھی کہا کہ :

"یہ ایک مغرور شخص ہے - خرابی نیت کی تصدیق اس سے ہو سکتی ہے کہ سجدہء تحیت جو بادشاہ جہاں پناہ کے لیے جائز مانا جاتا ہے وہ اس کا منکر ہے - اس نے پہلے بھی شاہی احترام سے کنارہ کیا اور آپ آئندہ بھی امتحان فرمالیجیے - وہ بارگاہ میں حاضر ہو کر بھی سر نہیں جھکائے گا -"(۱)

دنیا نے دیکھا کہ حضرت مجدد صاحبؒ دربار شاہی میں بے خوف و خطر تشریف لائے درباری ادب آموزوں نے شاہانہ آداب بجالانے کی ہدایت کی' جب تخت بوسی و سجدہ کی فرمائش کی گئی تو حضرت نے سختی سے انکار فرمادیا' ان کور باطنوں نے آپ کے قتل کے جواز کا فتویٰ دیدیا مگر حضرت مجدد صاحبؒ نے اس کی بھی پروانہ کی' شاہزادہ خرم جسے آپ سے عقیدت تھی اس نے عرض کیا کہ جب کہ علماء نے سجدہ تحیت کو جائز بتلایا ہے اگر جناب بادشاہ سے ملاقات کے وقت سجدہ کرلیں تو میں ذمہ دار ہوں گا کہ جناب کو کوئی گزند نہ پہونچے گا' فرمایا : "ایں رخصت است و عزیمت دراں ست کہ سجدہ بہ غیر اللہ نہ کردہ شود" آپ جو کہہ رہے ہیں جان بچانے کے

۱ علماء ہند کا شاندار ماضی ج ۱ ص ۱۸۹

لیے یہ بھی جائز ہے مگر اصل یہی ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ نہ کیا جائے- الغرض آپ
نے قید ہونا اختیار کیا لیکن سجدہ نہ کرنا تھا نہ کیا' اسی کے بارے میں اقبال کہتے ہیں-

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے

سرہند شریف کے اطراف میں ایک قصبہ ہے "سامانہ" یہاں کے ایک
خطیب نے خطبہء عیدالاضحیٰ میں خلفاء راشدین کا ذکر چھوڑ دیا' حضرت مجدد
صاحبؒ کو علم ہوا تو اس پر سخت ناراض ہوئے' اور آپ نے "سامانہ" کے سادات'
قاضی صاحبان اور عمائدین کو لکھا:

"معلوم ہوا ہے کہ آپ کے یہاں خطیب شہر نے عید قربان میں خلفاء
راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ذکر مبارک چھوڑ دیا ہے اور ان ہستیوں
کے مبارک ناموں کو نہیں پڑھا ہے- نیز یہ بھی شنید ہے کہ جب کچھ
لوگوں نے امام کو توجہ دلائی تو جائے اس کے کہ فراموشی وغیرہ کا کوئی
عذر کرتا نہایت سختی اور متمردانہ انداز میں جواب دیا اور کہا کہ اگر خلفاء
راشدین کے نام نہیں لیے گئے تو کیا ہوا- نیز یہ بھی پتہ چلا ہے کہ وہاں
کے حضرات نے بھی اس معاملہ میں چشم پوشی اور نرمی اختیار کی ہے'
سختی کے ساتھ اس بے انصاف خطیب سے باز پرس نہیں کی سوائے نہ
یک بار کہ صد بار وائے' خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کا ذکر
اگرچہ شرائط خطبہ میں داخل نہیں لیکن اہل سنت کے شعائر میں سے
ہے' شکر اللہ تعالیٰ سعیہم (خطبہ میں خلفاء راشدین کا ذکر) قصداً و
تمرداً وہی شخص چھوڑ سکتا ہے جس کا دل مریض ہو اور باطن خبیث' اگر
ہم مان بھی لیں کہ اس خطیب نے تعصب اور عناد سے ذکر مبارک
نہیں چھوڑا (تاہم چھوڑنے والوں کے ساتھ مشابہت تو ہوئی ایسی
صورت میں) من تشبہ بقوم فھو منھم کا کیا جواب ہوگا- پھر اس

خطیب کا ذکر مبارک کو چھوڑنا تہمت کے مواقع میں سے ہے اور ارشاد
ہے کہ اتقوا مواضع التھم تہمت کے مواقع سے بچو تو اس صورت میں
موقع تہمت سے کس طرح یہ خطیب نجات پا سکتا ہے' اگر اس خطیب
کو حضرات شیخین (حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ) کی تقدیم اور افضلیت میں
توقف ہے تو طریقہء اہل سنت کا تارک ہے اور اگر حضرات ختنین
(حضرت عثمانؓ و علیؓ) کی محبت میں تردد ہے- تب بھی اہل حق سے
خارج' اور چونکہ یہ بے حقیقت خطیب کشمیری ہے تو بعید نہیں کہ کشمیر
کے بدعتیوں سے یہ خبث حاصل کیا ہو' اسے سمجھا دینا چاہیے کہ
حضرات شیخین کی افضلیت صحابہ و تابعین کے اجماع سے ثابت ہے
جیسا کہ اس کو اکابر ائمہ نے نقل کیا ہے- جن میں سے ایک حضرت
امام شافعی رحمہ اللہ بھی ہیں-

اس کے بعد حضرت مجدد صاحبؒ نے اس سے متعلق اکابر ائمہ کی نقول پیش
فرمائی ہیں- ان کے پیش فرمانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں-

"اس بے انصاف خطیب سے کہنا چاہیے کہ تمام صحابہ کرام علیہ و علیہم
الصلوات والتسلیمات کی محبت کا ہم کو حکم دیا گیا ہے اور ان کے بغض و
ایذا دہی کی ممانعت وارد ہوئی ہے اور حضرات ختنین (حضرت عثمانؓ و
حضرت علیؓ) اکابر صحابہ میں سے ہیں- رسول اکرم ﷺ کے رشتے
دار ہیں- لامحالہ محبت و مودت کے سب سے زیادہ مستحق ہیں' رسول
اللہ ﷺ کو خطاب فرماتے ہوئے- حضرت حق جل مجدہ ارشاد
فرماتے ہیں "آپ کہہ دیجئے کہ اقارب اور رشتے داروں کے ساتھ
محبت کا مطالبہ تو میں کرتا ہوں- اس کے علاوہ اپنی تبلیغ و رہنمائی پر کوئی
اجر تم سے نہیں مانگتا-"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے اصحاب اور دوستوں کے بارے میں
خدا سے ڈرو، میرے بعد ان کو نشانہ مت بنالینا، جو ان سے محبت کرتا
ہے در حقیقت اس کو مجھ سے محبت ہے جس کے باعث ان سے محبت
کرتا ہے، اور جو ان سے بغض رکھتا ہے در حقیقت اس کو مجھ سے بغض
ہے جس کے سبب ان سے بغض رکھتا ہے۔ جو ان کو تکلیف دیتا ہے وہ
در حقیقت مجھے تکلیف دیتا ہے اور جو مجھے تکلیف دیتا ہے وہ خدا کو ایذا
پہونچاتا ہے اور جو خدا کو ایذاء پہونچاتا ہے لامحالہ خداوند عالم اس کی
گرفت کرلے گا۔

''ہمیں معلوم نہیں کہ ابتداء اسلام سے اس وقت تک ہندوستان میں
اس قسم کا گل کھلا ہو، بہت ممکن ہے کہ اس معاملہ سے سارا شہر متہم ہو
جائے بلکہ پورے ہندوستان سے اعتماد اٹھ جائے، سلطان وقت سنی اور
حنفی المذہب ہے۔ اس کے زمانہ میں اس قسم کی بدعت در حقیقت بہت
بڑی جرأت ہے۔ بلکہ حقیقتاً دیکھا جائے تو سلطان وقت سے منازعت
اور اولی الامر کی اطاعت سے بغاوت ہے۔''

چند سطر بعد حضرت تحریر فرماتے ہیں:

''اس وحشت انگیز خبر نے میرے اندر جوش پیدا کر دیا، میری رگ
فاروقی پھڑکنے لگی چنانچہ یہ چند جملے لکھ دیئے ہیں۔'' (۱)

ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت مجدد صاحبؒ شعائر اہل سنت میں سے ایک ادنی
شعائر کے چھوڑ دینے پر کس قدر برہم ہو رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ''اس وحشت
انگیز خبر سے میری رگ فاروقی پھڑکنے لگی۔'' کیا ایسی مقدس و پاکباز اور محافظ
دین و شریعت ہستیوں کے بارے میں یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ یہ شریعت کے

۱۔ مکتوبات امام ربانی فارسی ج ۲ ص ۴۱ مکتوب نمبر ۱۵

… جاتی تھیں؟

حضرت مجدد صاحبؒ کے نزدیک اتباع شریعت و سنت کا کیا درجہ و مقام ہے
[اس] کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔

''حضرت محبوب سبحانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک
بزرگ چشتیہ حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ مجھ کو کئی سال نسبت حق
میں قبض تھا، آپ کے حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت
میں حاضر ہوا اور قبض کی شکایت کی تو حضرت خواجہ کی توجہ و دعاء سے
میری حالت قبض بسط سے بدل گئی۔ آپ بھی کچھ توجہ فرمائیں کیونکہ
حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تمام خلفاء اور مریدین کو آپ
کے حوالے کر دیا ہے۔ تو حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے ان کے
جواب میں فرمایا کہ میرے پاس تو اتباع سنت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ
سنتے ہی ان بزرگ پر حال طاری ہوا اور کثرت نسبت اور قوت باطنی
کے اثرات سے سرہند شریف کی زمین جنبش کرنے لگی، حضرت امام
ربانی نے ایک خادم سے فرمایا کہ طاق میں سے مسواک اٹھا لاؤ۔ آپ
نے مسواک کو زمین پر ٹیک دیا۔ اسی وقت زمین ساکن ہو گئی اور ان
بزرگ کی کیفیت جذبی بھی جاتی رہی، اس کے بعد آپ نے ان بزرگ
سے فرمایا کہ تمہاری کرامت سے زمین سرہند جنبش میں آگئی، اور اگر
فقیر دعا کرے تو انشاء اللہ سرہند شریف کے مردے زندہ ہو جائیں،
لیکن میں تمہاری اس کرامت (جنبش زمین) سے اور اپنی اس کرامت
سے کہ دعا سے سرہند شریف کے تمام مردے زندہ ہو جائیں۔ اثناء
وضوء میں بطریق سنت مسواک کرنا بدرجہا افضل جانتا ہوں۔'' (۱)

۱۔ … لاثانی شاہ محمد ہدایت علی جے پوری ج ۳ ص ۶-۷

حضرت مجددؒ صاحبؒ کے بعد خانوادہ ولی اللّٰہی کی طرف آیئے۔ یہاں بھی آپ کو ہر فرد متبع سنت اور محافظ دین و شریعت نظر آئے گا۔ اسی خانوادے کے خوشہ چین حضرات اکابر علماء دیوبند کی طرف نظر ڈالیے جن کے علمی و روحانی فیض سے آج ایک عالم مستنیر و مستفید ہو رہا ہے' اس چمنستان علم و معرفت میں ہر ہستی آپ کو شریعت کی متبع اور سنت کی محافظ نظر آئے گی۔ جی چاہتا تھا کہ ان حضرات کے اتباع سنت و شریعت کے واقعات ذکر کیے جائیں لیکن خوف طوالت مانع ہے۔

معترضین حضرات دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیں کہ جن بزرگوں نے حجۃ اللہ البالغہ' ازالۃ الخفاء' تحفہ اثنا عشریہ وغیرہ جیسی عظیم کتابیں تالیف فرما کر امت پر احسان فرمایا: جنہوں سے دلی سے چل کر بالاکوٹ کے میدان کو اپنے خون شہادت سے رنگین کیا' جنہوں نے ہندوستان میں دین کی ڈوبتی نیا کو کنارے لگایا' جنہوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر منحوس انگریز کو ملک سے رخصت کیا۔ آیا یہ حضرات صوفیاء تھے یا نہیں؟ اگر تھے اور یقیناً تھے۔ تو کیا ان کی یہ ساری جد و جہد العیاذ باللہ دین کے خلاف تھی؟ اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر وہ حضرات جنہوں نے دین کی حفاظت اور اتباع سنت میں اپنی زندگیاں تج دیں ہوں۔ جن کا ہر عمل اتباع شریعت اور حفاظت سنت کا آئینہ دار ہو۔ ان اکابر کے بارے میں یہ زہر افشانی کرنا کہ یہ لوگ باطنیت کی پیداوار اور شیعیت کے علمبردار تھے۔ کیا قیامت سے نہیں؟

میں بات کو مختصر کرتے ہوئے آگے چلتا ہوں ابھی تک آپ نے یہ ملاحظہ فرمایا کہ صوفیاء کرام متبع سنت اور دین و شریعت کے محافظ تھے۔ اب یہ ملاحظہ فرمائیں کہ صوفیاء کرام کے نزدیک کسی شخص کی روحانی عظمت کا معیار اتباع سنت و شریعت ہے۔ اگر کسی میں اتباع شریعت و سنت پائی جاتی ہے تو وہ کامل ہے ورنہ نہیں۔

صوفیاء کے نزدیک کسی شخص کی روحانی عظمت کا معیار

مشائخ کرام نے جگہ جگہ اپنے متعلقین اور مریدین کو ہدایت کی ہے کہ اگر کسی شخص کی روحانی عظمت کا اندازہ لگانا ہو تو اس کی زندگی کو شریعت و سنت کے آئینہ میں دیکھا جائے۔

چنانچہ:

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"لو نظرتم ألی رجل اعطی من الکرامات حتی یرتفع فی الھواء فلا تغتروا به حتی تنظروا كيف تجدونه عند الامرو النهي وحفظ الحدود۔" (۱)

"اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ اسے کرامات دی گئی ہیں یہاں تک کہ وہ ہواؤں میں اڑتا ہے تو پھر بھی اس سے دھوکا نہ کھاؤ یہاں تک کہ تم یہ نہ دیکھ لو کہ وہ اوامر و نواہی اور حدود اللہ کی محافظت میں کیسا ہے۔"

حضرت شیخ ابو الحسین نوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

"من رأیته یدعی مع الله عزوجل حالة تخرجه عن حد علم الشرع فلا تقربنه' ومن رأيته يدعي حالة لا يدل عليها دليل ولا يشهد لها حفظ ظاهر فاتهمه على دينه۔" (۲)

اگر ایک شخص کو دیکھو کہ وہ خداوند تعالیٰ کے ساتھ ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے جو اس کو علم شریعت کی حد سے نکال دیتی ہے تو اس کے قریب بھی نہ پھٹکو' اور اگر ایک شخص کو دیکھو کہ وہ ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں اور ظاہری احکام کی پابندی اس کی شہادت نہیں

۱۔ رسالہ قشیریہ ص ۱۵ ۲۔ تلبیس ابلیس عربی ص ۳۱۸

دیتی تو اس کے دین پر تہمت لگاؤ۔

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی رحمہ اللہ (م : ۱۱۴۲ھ) اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اے برادر! در ثقافت مراتب فقراء اگر امروز خواہی کہ دریابی جانب شریعت او نگاہ کن کہ شریعت معیار است، عیار فقیر بر شریعت روشن می گردد۔"

اے برادر اگر آج تم فقراء کے مراتب کا پتہ لگانا چاہو تو ان کے اتباع شریعت پر نظر کرو کہ شریعت معیار ہے۔ اسی کسوٹی پر فقیر کی حقیقت روشن ہوتی ہے۔

صوفیاء کرام اور اشاعت اسلام

قارئین محترم آپ نے ہماری گذارشات کی روشنی میں اچھی طرح جان لیا ہوگا کہ صوفیاء کرام کے متعلق یہ کہنا کہ یہ باطنیت کی پیداوار اور شیعیت کے علمبردار ہیں۔ شریعت کے خلاف چلتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ سچے صوفیاء کرام کا دامن اس قسم کی باتوں سے بالکل صاف ہے۔ صوفیاء کرام ہمیشہ شریعت و سنت کے متبع رہے۔ اسی کی ہمیشہ تلقین کی اور اسی کو معیار بنا کر ہر ایک کے مرتبہ و مقام کو جانچا پرکھا۔

اب ہم آپ کو یہ بتلائیں گے کہ صوفیاء کرام کے متعلق جو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اشاعت اسلام میں رکاوٹ بنے رہے۔ یہ بات بھی نہایت غلط اور گمراہ کن بات ہے۔ یہ بات وہی لوگ کرتے ہیں جو صوفیاء کرام کی تعلیمات اور ان کی صحیح تاریخ سے ناواقف ہیں۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ صوفیاء کرام نے اپنی سچی تعلیمات اور اپنے اعلیٰ

کردار و حسن سلوک کی بدولت اشاعت اسلام کا وہ کام کیا ہے جو بڑے بڑے سلاطین و حکمران بھی نہیں کر سکے۔

اس موقع پر ہم چند معروف صوفیاء کرام کی اشاعت اسلام کے سلسلہ میں کی جانے والی مساعی کا تذکرہ کرتے ہیں اور تاریخ کے حوالے سے بتلاتے ہیں کہ کس قدر کثرت کے ساتھ لوگ ان حضرات کے طفیل دولت اسلام سے مشرف ہوئے۔

سیدنا شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ (۵۶۱ھ) سلسلہ قادریہ کے پیشوا ہیں۔ آپ نے بغداد میں ۷۳ سال گذارے عباسی خلفاء میں سے پانچ آپ کی نظروں کے سامنے یکے بعد دیگرے مسند خلافت پر بیٹھے، جس وقت آپ بغداد میں رونق افروز ہوئے اس وقت خلیفہ مستظہر باللہ (م ۵۱۲) کا عہد تھا۔ اس کے بعد بالترتیب مسترشد، راشد، المقتفی لامر اللہ اور المستنجد باللہ سلطنت پر متمکن ہوئے، آپ کا عہد اہم تاریخی واقعات سے لبریز اور انتہائی سیاسی اتار چڑھاؤ کا دور تھا، اس دور میں آپ نے بیک وقت مسند درس اور مسند ارشاد کو زینت دی آپ کے درس و تدریس اور وعظ و ارشاد کی بدولت ہزاروں غیر مسلموں کو دولت اسلام نصیب ہوئی اور لاکھوں کی تعداد میں جرائم پیشہ افراد نے آپ کے دست حق پرست پر توبہ کی۔

آپ کے سوانح نگار شیخ عمر الکیسانی لکھتے ہیں :

"شیخ عبد القادر کی کوئی مجلس ایسی نہیں تھی جس میں کوئی نہ کوئی یہودی یا عیسائی مشرف بہ اسلام نہ ہوا ہو یا کسی ڈاکو، قاتل، جرائم پیشہ آوارہ شخص اور دوسرے قسم کے فاسقوں نے توبہ نہ کی ہو، یا کسی بد عقیدہ نے اپنے غلط مسلک سے رجوع نہ کیا ہو، آپ کے ہاتھوں پر جن ڈاکوؤں اور رہزنوں نے توبہ کی ان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔" (۱)

۱۔ قلائد الجواہر ص ۲۲۔

"جبائی کا بیان ہے کہ مجھ سے حضرت شیخ نے ایک روز فرمایا کہ میری تمنا ہوتی ہے کہ زمانہء سابق کی طرح صحراؤں اور جنگلوں میں رہوں' نہ مخلوق مجھے دیکھے نہ میں اس کو دیکھوں لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کا نفع منظور ہے' میرے ہاتھ پر پانچ ہزار سے زائد یہودی اور عیسائی مسلمان ہو چکے ہیں' عیاروں اور جرائم پیشہ لوگوں میں سے ایک لاکھ سے زائد توبہ کر چکے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔"(۱)

پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں۔

"حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور تربیت یافتہ افریقہ کے دور دراز علاقوں میں پھیل گئے۔ جن کے ذریعہ ان علاقوں میں لوگوں نے بکثرت اسلام قبول کیا۔"(۲)

ہندوستان میں مسلمانوں کے دور کا آغاز صوفیاء کرام ہی کی ذات سے ہوا' خاص طور پر حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ (م ۶۲۷ھ) کے مخلص اور پرزور ہاتھوں سے یہاں چشتی سلسلہ کی مضبوط بنیاد پڑی' اس کے بعد سے خواص و عوام شاہ و رعیت سب ہی نے ان بے غرض اور پاک نفس درویشوں اور مردان خدا سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا اور اس برعظیم کے ایک گوشہ سے لے کر دوسرے گوشہ تک خانقاہوں اور روحانی مرکزوں کا ایک جال بچھ گیا' مرکزی شہروں کو چھوڑ کر مشکل سے کوئی قابل ذکر قصبہ اور مقام اس سے محروم رہا ہوگا۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ غزنیں سے چلے لاہور آئے' لاہور سے چل کر دہلی پہونچے اور دہلی سے چل کر اجمیر کو رونق بخشی اور یہیں کے ہو رہے۔ آپ جب تشریف لائے تھے۔ اس وقت اجمیر اور دہلی کا حکمران چوہان خاندان کا مشہور راجہ رائے پتھورا تھا جس کے ظلم و ستم سے مسلمان تنگ

۱۔ قلائد الجواہر بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت ج ۱ ص ۲۰۱ ۲۔ پریچنگ آف اسلام باب (۱۱)

تھے' آپ کے قدوم میمنت لزوم کی برکت سے سلطان شہاب الدین غوری نے ادھر توجہ کی اور راجہ رائے کو عبرت ناک شکست سے دوچار کر کے مسلمانوں کو اس کے ظلم و ستم سے نجات دلائی۔ شہاب الدین غوری کی فتح کے بعد مسلمانوں کے سیاسی اقتدار اور حضرت خواجہ کے فیوض و برکات سے ہندوستان اسلام کے نور سے منور ہو گیا۔ اسی لیے حضرت خواجہ اجمیریؒ کو "وارث النبی فی الہند" کا معزز لقب ملا۔

سیر الاولیاءؒ کے مصنف لکھتے ہیں۔

"بوصول قدم مبارک آں آفتاب اہل یقین کہ بہ حقیقت معین الدین بود' ظلمت ایں دیار بنور اسلام روشن و منور گشت۔"(۱)

"اہل یقین کے اس آفتاب (خواجہ اجمیریؒ) کے مبارک قدم پہونچنے سے جو حقیقت میں معین الدین یعنی دین کا مددگار تھا۔ اس علاقہ کی تاریکی نور اسلام سے منور اور روشن ہوئی۔"

خزینۃ الاصفیاء کے مصنف ------- رقمطراز ہیں۔

"ہزار در ہزار از صغار و کبار خدمت آں محبوب کردگار حاضر شدہ مشرف بہ شرف اسلام ارادت آنحضرت شدند بحدیکہ چراغ اسلام در ہند بطفیل ایں خاندان عالی شان روشن گشت۔" (۲)

"چھوٹے بڑے ہزار ہا ہزار افراد اس اللہ کے محبوب بندے (خواجہ اجمیریؒ) کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اور آپ کے حلقہء ارادت میں شامل ہوئے۔ یہ سلسلہ ایسا پھیلا کہ اس خاندان عالی شان کے طفیل اسلام کا چراغ ہند میں روشن ہو گیا۔

پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں:

۱۔ سیر الاولیاء ص ۴۷ بحوالہ بزم صوفیہ ص ۶۳ ۲۔ خزینۃ الاصفیاء

"حضرت خواجہ تبلیغ اسلام بھی کرتے رہے اور جب وہ دہلی سے اجمیر
جارہے تھے توراستے میں سات سو ہندوؤں کو مسلمان کیا۔"(۱)

پروفیسر آرنلڈ نے صرف سات سو ہندوؤں کے مسلمان ہونے کا تذکرہ کیا ہے لیکن بہت سے بزرگوں نے اس سے کہیں زیادہ تعداد ذکر فرمائی ہے۔ جو ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ حضرت خواجہ اجمیریؒ کے دو خلفاء نامور اور مشہور ہوئے (۱) حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہ اللہ (م: ۶۳۴ھ) (۲) حضرت خواجہ حمید الدین ناگوری رحمہ اللہ (م: ۶۴۱) حضرت خواجہ قطب الدینؒ نے دہلی میں رہ کر کام کیا' آپ اور آپ کے نامور خلفاء سے جو اسلام کو ترقی ہوئی اس کے بیان کے لیے مستقل کتاب درکار ہے۔ یہاں ہم انتہائی اختصار کے ساتھ اشاعت اسلام کے سلسلہ میں آپ کے خلفا کی مساعی کا تذکرہ کریں گے۔

حضرت خواجہ حمید الدین ناگوریؒ کے ذریعہ ماڑواڑ اور راجپوتانہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہ اللہ کے خلیفہء اعظم حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر رحمہ اللہ (م: ۶۶۴ھ) ہیں آپ دہلی سے فیض لے کر مغربی پنجاب کے علاقے پاک پٹن شریف پہونچے' آپ کے دم قدم سے جو اسلام کی اشاعت ہوئی اس کے متعلق سید صباح الدین رقمطراز ہیں۔

"حضرت بابا صاحب کے رشد وہدایت سے نہ صرف مسلمان مسلمان
بنے' بلکہ غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد بھی مشرف بہ اسلام ہوئی'
اجودھن کے قیام کے ابتدائی زمانہ میں ایک جوگی مسمی سھوناتھ
خدمت اقدس میں حاضر ہوا' جو جادو منتر اور استدراج میں مشہور تھا' بابا
صاحب کو دیکھتے ہی اس پر ان کی ہیبت اس قدر غالب ہوئی کہ زبان سے
کچھ بول نہ سکا' پھر حضرت بابا صاحب کے کشف و کرامت سے ایسا

۱۔ پریچنگ آف اسلام مترجم ص ۳۰۱

متاثر ہوا کہ قدموں پر گر پڑا' اور اپنے چیلوں کے ساتھ بابا صاحب کے
ہاتھ پر ایمان لایا۔ کہا جاتا ہے کہ پاک پٹن کے اطراف میں زیادہ تر جو
نو مسلم قومیں ہیں' وہ حضرت بابا صاحب ہی کی برکت سے مسلمان ہوئی
ہیں' جواہر فریدی میں ہے کہ پنجاب میں مربھوالیان' بہلیان' ادہکان'
جکروالیان' بگان' ہکان' سیان' کھوکھران' سیال وغیرہ حضرت بابا ہی کی
برکت سے مسلمان ہوئیں۔ (ورق ۴۴۳)" (۱)

حضرت بابا صاحبؒ کے نامور خلفاء میں دو نام آفتاب و ماہتاب سے بھی زیادہ روشن ہیں (۱) حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ م: ۷۲۵ھ) (۲) حضرت خواجہ علاء الدین صابر کلیری رحمہ اللہ (م: ۶۹۰ھ)

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ نے دارالسلطنت دہلی کو اپنا مسکن بنایا تھا' آپ ناصر الدین محمود کے زمانہ میں دہلی پہونچے تھے اور پھر سلطان محمد بن تغلق کے دور حکومت کے پہلے مہینے تک دہلی میں مسند آرا رہے' اس مدت میں تین شاہی خاندان اور نو فرماں روا دہلی کے تخت پر بیٹھے' ناصر الدین محمود' غیاث الدین بلبن' معز الدین کیقباد' جلال الدین خلجی' علاء الدین خلجی' مبارک خلجی' خسرو خان' غیاث الدین تغلق' محمد بن تغلق' اس مدت میں دہلی کی سیاست نے کتنے ہی رخ بدلے لیکن کوئی سیاسی ہنگامہ یا اقتدار کی تبدیلی حضرت خواجہ کو اپنے گوشہء عافیت سے باہر نہ لاسکی۔ آپ گوشہء عافیت میں بیٹھ کر خلق اللہ کی رشد وہدایت کا نہایت موثر کام انجام دیتے رہے۔

آپ کے معاصر مورخ ضیاء الدین برنی آپ کے عہد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اس زمانہ میں (یعنی عہد علاؤ الدین خلجی میں) شیخ الاسلام نظام الدین

۱۔ بزم صوفیہ ص ۱۷۶

نے بیعت عام کا دروازہ کھول دیا تھا- گنہگاروں سے توبہ کراتے اور ان
کو خرقہ دیتے تھے اور اپنا مرید بناتے تھے- اور (ہر) خاص و عام' امیر اور
غریب' جاہل اور عالم' شریف اور رذیل' شہری اور دیہاتی' غازی'
مجاہد' احرار' غلام کو اپنی ٹوپی عنایت کر کے توبہ کی تلقین اور مسواک
استعمال کرنے کی ہدایت فرماتے تھے- بہت سے لوگ جو اپنے آپ کو
شیخ کے مریدوں میں شمار کرتے تھے بری باتوں سے بچتے تھے- اگر کسی
مرید سے کوئی لغزش ہو جاتی تھی تو وہ تجدید بیعت کر کے خرقہ توبہ
حاصل کرتا تھا- شیخ کے مرید ہونے کی شرم (اور غیرت) لوگوں کو
علانیہ یا چھپ کر منکرات کا ارتکاب کرنے سے بچاتی تھی- عام لوگوں
کو عبادت و طاعت میں رغبت پیدا ہو گئی تھی- عورت اور مرد' بوڑھے
اور جوان' بازاری' عام لوگ' غلام و چاکر' بچے اور کم عمر نماز کی طرف
راغب ہو گئے تھے- اکثر ان میں سے چاشت اور اشراق کی پابندی بھی
کرتے تھے- معتقدین نے شہر سے غیاث پور تک مختلف مواضعات میں
چبوترے بنوا کر ان پر چھپر ڈال دیئے تھے اور کنوئیں کھدوا کر وہاں مٹکے'
کٹورے اور مٹی کے لوٹے رکھ دیئے تھے- بوریئے بچھے رہتے تھے- ہر
چبوترہ پر حافظ اور خادم نصب تھے تاکہ آستانہ شیخ پر آنے جانے والے
وضو کر کے نماز ادا کر سکیں- ہر چبوترہ پر جو راہ میں بنا ہوا تھا نوافل
پڑھنے والوں کا ہجوم رہتا تھا---- اس طرح لوگوں میں گناہ کی رغبت
کم ہو گئی تھی- اور عوام و خواص کے دل نیکی کی طرف راغب ہو گئے
تھے---- شیخ نظام الدین اس زمانہ میں نظیر جنید و شیخ بایزید تھے-
(تاریخ فیروز شاہی)" (۱)

۱- شیخ نظام الدین اولیاء از پروفیسر خلیق احمد نظامی

حضرت نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ نے کم و بیش نصف صدی دار السلطنت
دہلی میں بیٹھ کر انسانی دلوں کو ایک رشتہ ء الفت میں پرونے اور خالق کائنات سے
ان کا ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے میں بسر کی' آپ کے خلفاء کی فہرست لمبی ہے- بعض کے
اسماء گرامی یہ ہیں - (۱) حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ (۲) حضرت قطب
الدین منورؒ (۳) حضرت شیخ حسام الدین ملتانیؒ (۴) حضرت شیخ برہان الدین
غریبؒ (۵) شیخ اخی سراج الدینؒ (۶) مولانا علاء الدین نیلیؒ (۷) مولانا
فخر الدین زرادیؒ (۸) قاضی محی الدین کاشانیؒ (۹) مولانا شمس الدین یحییٰؒ
ان حضرات میں سے ہر فرد آسمان رشد و ہدایت کا روشن ستارہ اور علم و عرفان کے
مقام بلند پر فائز تھا- قدرت نے اشاعت اسلام کا جو کام ان حضرات سے مختلف
اکناف و اطراف میں لیا اس کی تفصیل کے لیے دفتر کے دفتر بھی تھوڑے ہیں-

حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے دہلی' اودھ' پنجاب اور گجرات میں
مذہبی و روحانی اثرات پیدا کیے-

حضرت خواجہ برہان الدین منورؒ ہانسی تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں کو
فیض یاب کیا-

حضرت خواجہ برہان الدین غریبؒ مرشد کے حکم سے سات سو درویشوں کی
جماعت کے ساتھ دولت آباد (دکن) تشریف لے گئے' اٹھائیس انتیس سال یہاں
قیام فرمایا یہیں واصل بحق ہوئے' حضرت خواجہؒ غریب اور ان کے ہمراہیوں کی
مساعی جمیلہ سے بہت سے غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے- دکن کے مشہور علمی
اور روحانی شہر "برہان پور" کی نسبت آپ ہی کی طرف ہے-

حضرت شیخ اخی سراجؒ نے بنگال اور اس کے اطراف بہار اور آسام میں اسلامی
تعلیمات پھیلائیں-

حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے دو خلفاء نہایت مشہور ہوئے-

حضرت سید جلال الدین بخاری المعروف مخدوم جہانیاں جہاں گشت (م ۷۸۵ھ) ۔حضرت سید محمد گیسو دراز (م ۸۲۵ھ) حضرت مخدوم جہانیاں کے وجود مسعود سے ایک عالم مستفید ہوا۔ آپ کے تذکرہ میں اشاعت اسلام کی سرخی کے تحت سید صباح تحریر فرماتے ہیں:

"غیر مسلم خصوصاً ہندو خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوتے ایک ہندو عورت مسلمان ہو کر ولیہ ہو گئی۔ تمام رات بیدار رہ کر عبادت کرتی، اور اکثر مکہ معظمہ جا کر خانہ کعبہ کے طواف میں روحانی لذت حاصل کرتی، حضرت مخدوم جہانیاں اچ سے تشریف لائے تو راستے میں بہت سے غیر مسلم ان کے دست مبارک پر اسلام لائے۔" (۱)

حضرت خواجہ گیسو درازؒ دہلی میں تقریباً چوالیس سال کے قیام کے بعد تیمور کے حملہ کے زمانے یعنی ۸۰۱ھ میں گلبرگہ (دکن) منتقل ہو گئے، دکن کے خواص و عوام دونوں حضرت گیسو درازؒ کے فیوض و برکات کے سرچشمہ سے فیض یاب ہوتے رہے اور آپ کو ان دیار میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

حضرت شیخ اخی سراجؒ کے ایک خلیفہ حضرت شیخ علاء الدین علاء الحقؒ بنگال میں مرجع عوام و خواص تھے، آپ کے خلفاء میں ایک نامور بزرگ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی رحمہ اللہ ہوئے ہیں، تاریخ بتاتی ہے کہ آپ کے وجود مسعود سے ایک جہاں فیض یاب ہوا ہے، آپ کثرت سے سیاحت فرماتے تھے۔ جس [illegible] سب اطراف و جوانب کے لوگ آپ سے فیض یاب ہوتے تھے۔

آپ دوران سیاحت "کھدونڈ؟" تشریف لائے تو ایک ہندو جوگی سے آپ کا مقابلہ ہوا جوگی کو ہوا میں اڑنے کا دعویٰ تھا لیکن وہ حضرت اشرف جہانگیر

۱۔ بزم صوفیہ ص ۶ ۵

روحانیت سے ایسا مرعوب اور مغلوب ہوا کہ اپنے تمام باطل دعوؤں سے باز آیا، اور اپنی ساری مذہبی کتابوں کو جلا کر پانچ ہزار چیلوں کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہو گیا، اسلام لانے کے بعد جوگی نے بابا کمال پنڈت کے نام سے شہرت پائی۔" (۱)

یہ مختصر تذکرہ تو حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے ایک خلیفہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور ان کے خلفاء کی اشاعت اسلام کے سلسلہ میں کی جانے والی مساعی جمیلہ کا تھا۔

اب دوسرے خلیفہ حضرت خواجہ علاء الدین صابر کلیریؒ کے خلفاء کی خدمات کا مختصر تذکرہ بھی سنتے چلیں۔ حضرت خواجہ علاؤالدینؒ مغربی پنجاب کے علاقہ پاکپتن شریف میں اپنے ماموں حضرت خواجہ فرید الدینؒ سے فیض یاب ہو کر کلیر شریف تشریف لائے، یہاں آپ کے دست حق پرست پر حضرت خواجہ شمس الدین ترک (م : ۷۱۸ھ) بیعت ہوئے۔ حضرت خواجہ ترکستان سے چل کر ہندوستان آئے تھے، شیخ کی وفات تک کلیر میں رہے۔ وفات کے بعد پانی پت تشریف لے آئے۔ یہاں مستقل قیام فرمایا اور باشندگان پانی پت کو اپنے علوم و معارف سے سیراب کرتے رہے۔ یہیں پر آپ کے حلقۂ فیض سے حضرت جلال الدین کبیر الاولیاء (م : ۷۶۵ھ) وابستہ ہوئے۔ آپ نسباً عثمانی تھے دیوبند کے عثمانی شیوخ آپ ہی کی اولاد امجاد میں سے ہیں۔ آپ کے چالیس خلفاء میں سے ایک نامور خلیفہ حضرت شیخ احمد عبدالحقؒ (م : ۸۳۶ھ) ہیں آپ پانی پت سے قصبہ رودولی ضلع بارہ بنکی تشریف لے گئے اور وہاں ایسے زمانہ میں اپنی خانقاہ قائم کی جب کہ سلسلہ چشتیہ کا مرکزی نظام ختم ہو چکا تھا۔ رودولی میں آپ کی خانقاہ رشد و ہدایت کا بڑا اہم مرکز بن گئی اور شمالی ہندوستان کے لوگ کثرت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض پانے لگے۔ آپ کے خانوادہ سے ایک بزرگ حضرت خواجہ

۱۔ بزم صوفیہ ص ۵۲۸

عبدالقدوسؒ (م: ۹۴۴ھ) فیض یاب ہو کر گنگوہ ضلع سہانپور پہونچے اور اپنے انفاس طیبہ سے خلق خدا کو روحانی فیض پہونچایا۔ آپ کا سلسلہ اس قدر وسعت پذیر ہوا کہ آج عالم کے گوشہ گوشہ میں آپ کے سلسلہ کے فیض یافتگان موجود نظر آتے ہیں جو اشاعت اسلام اور خدمت دین متین میں مصروف ہیں۔

آٹھویں صدی ہجری میں امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ (م ۷۸۶ھ) سمنان سے فیض لے کر ہندوستان تشریف لائے آپ کے بارے میں پروفیسر محمد اسلم صاحب مرحوم تحریر فرماتے ہیں۔

"سید علی ہمدانی نے تین بار کشمیر کا دورہ کیا اور وہ کشمیر کو دین، فن اور تہذیب و ثقافت دے گئے' ایک بار وہ وادی میں ایک درے سے داخل ہوئے اور دوسرے درے سے باہر نکل گئے اور راستے میں سینتیس ہزار غیر مسلموں کو مشرف بہ اسلام کر گئے۔" (۱)

پروفیسر صاحب نے آپ کے ہاتھوں مسلمان ہونے والوں کی تعداد ۳۷۰۰۰ لکھی ہے لیکن دوسرے مورخین پچاس ہزار کے قریب بتلاتے ہیں۔

گیارہویں صدی ہجری کے شروع میں سلسلہ' نقشبندیہ کے ایک بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہؒ (م: ۱۰۱۲ھ) ماوراء النہر سے فیض حاصل کر کے دارالسلطنت دہلی پہونچے' یہاں آپ سے خلق خدا نے فیض پایا اور آپ کا فیض آپ کے خلفاء کے ذریعہ عرب و عجم میں پھیلا' آپ کے خلفاء میں سے ایک جلیل القدر خلیفہ محبوب سبحانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ آپ نے اپنے دور میں جو تجدیدی کارنامے انجام دیئے؟ اور آپ کے وجود مسعود سے خلق خدا کو فیض پہونچا اس کے تذکرہ کے لیے دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہیں' مشہور مورخ و ناقد پروفیسر محمد اسلم آپ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

۱۔ سفر نامہء ہند ص ۲۱۰

"حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اکبر اور جہانگیر کا زمانہ پایا تھا۔ انہوں نے اکبر کی بے دینی اور الحاد کے خلاف آواز اٹھائی اور اسلام کی سربلندی اور اسلامی شعائر کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو گئے' انہوں نے اکبر کی بے دینی کے علاوہ علماء سوء' صوفیاء' خام' بھگتی تحریک' بڑھتے ہوئے ایرانی اثرات اور ہندوؤں کی چیرہ دستیوں کے خلاف محاذ قائم کیا' اس سلسلہ میں انہیں جہانگیر کے عہد میں قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کرنی پڑی لیکن ان کے پائے استقلال میں کوئی لغزش نہیں آئی' حضرت مجدد الف ثانیؒ شاہی دربار میں اپنے ہم خیال امراء کا ایک پریشر گروپ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جنہوں نے احیاء دین کے لیے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی وفات کے بعد ان کے فرزندوں خواجہ محمد سعید' خواجہ محمد معصوم اور خواجہ محمد یحیٰ نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا۔" (۱)

حضرت مجدد صاحبؒ کے فرزند رشید حضرت خواجہ محمد معصوم رحمہ اللہ (م ۱۰۷۹ھ) کے متعلق مولانا حکیم سید عبدالحیؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"مجدد صاحبؒ کے نامور خلیفہ اور صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم کے ہاتھ پر ۹ لاکھ انسانوں نے بیعت و توبہ کی اور سات ہزار آدمی خلافت سے مشرف ہوئے۔" (۲)

حضرت مجدد صاحبؒ کے خلفاء میں سے ایک حضرت سید آدم بنوریؒ (م: ۱۰۵۳ھ) ہیں۔ آپ کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"ان سے لاتعداد خلق خدا فیض یاب ہوئی' کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ

۱۔ سفر نامہء ہند ص ۳۲۳ ۲۔ نزہۃ الخواطر ج ۵

پر چار لاکھ مسلمانوں نے اتباع سنت محمدیہ پر بیعت کی اور ایک لاکھ طالبین خدا ان کے ذریعہ علم و معرفت کے بلند مقام پر پہونچے' کہا جاتا ہے کہ ان کی خانقاہ کسی دن ایک ہزار آدمیوں سے خالی نہیں رہتی تھی اور سب کا کھانا آپ ہی کے لنگر سے آتا اور سب یکسوئی کے ساتھ روحانی و باطنی استفادہ میں مشغول رہتے- ۱۰۵۲ء میں آپ لاہور تشریف لائے دس ہزار مشائخ اور ہر طبقہ کے علماء و صوفیاء اس سفر میں آپ کے ہمرکاب تھے- اس جم غفیر اور رجوع خلائق کو دیکھ کر بادشاہ وقت شاہ جہان کو فکر لاحق ہو گئی (جو اس وقت لاہور ہی میں تھے) کہ ایسا مرجع خلائق شخص سلطنت کے لیے خطرہ بھی بن سکتا ہے- ان کو (مناسب و مہذب طریقہ پر) سفر حج کا اشارہ کیا- آپ نے حجاز مقدس کا قصد فرمایا اور حج و زیارت سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ میں مستقل اقامت اختیار کر لی جہاں ۱۰۵۳ھ میں وفات پائی-" (۱)

حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ سے فیض پانے والوں میں ان کے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ کے فرزند گرامی حضرت خواجہ عبیداللہ المعروف خواجہ خرد بھی ہیں- جن سے حضرت شاہ عبدالرحیم والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ نے فیض پایا ہے- حضرت شاہ ولی اللہ نے روحانی فیض والد ماجد سے پایا اور آپ سے آپکے صاحبزادگان نے فیض پایا- آپ کے صاحبزادگان کے فیض سے ایک جہان مستفیض ہوا اور اس خانوادہ نے اشاعت اسلام کے سلسلہ میں جو مساعی کیں ان کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی اس موقع پر ہم صرف حضرت سید احمد شہیدؒ کی خدمات پیش کر کے بات کو ختم کرتے ہیں- حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ جو برصغیر میں عظیم المرتبت شیخ داعی الی اللہ اور آیۃ من آیات اللہ تھے- آپ کے بارے میں نواب صدیق حسن خان

۱- المرتضی ص ۳۰۸

صاحب بھوپالی جنھوں نے سید صاحب کے بعض خلفاء اور ان کی مساعی کے آثار کو دیکھا تھا تحریر فرماتے ہیں:

"خلق خدا کی رہنمائی اور خدا کی طرف رجوع کرنے میں وہ خدا کی ایک نشانی تھے' ایک بڑی خلقت اور ایک دنیا آپ کی قلبی و جسمانی توجہ سے درجہء ولایت کو پہونچی' آپ کے خلفاء کے مواعظ نے سرزمین ہند کو شرک و بدعت کے خس و خاشاک سے پاک کر دیا اور کتاب و سنت کی شاہراہ پر ڈال دیا' ابھی تک ان کے وعظ و پند کے برکات جاری و ساری ہیں-" (۱)

کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں:

"خلاصہ یہ کہ اس زمانہ میں دنیا کے کسی ملک میں بھی ایسا صاحب کمال سنا نہیں گیا' اور جو فیوض اس گروہ حق سے خلق خدا کو پہونچے ان کا عشر عشیر بھی اس زمانہ کے علماء و مشائخ سے نہیں پہونچا-" (۲)

ہندوستان کے ایک باخبر ثقہ عالم دین جنھوں نے اس جماعت قدسیہ کے بہت سے افراد کی زیارت کی تھی اور جن کا زمانہ قریب تھا یعنی مولوی عبدالاحد صاحب لکھتے ہیں-

"حضرت سید صاحب کے ہاتھ پر چالیس ہزار سے زیادہ غیر مسلم مسلمان ہوئے اور تیس لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور جو سلسلہء بیعت آپ کے خلفاء کے ذریعہ تمام روئے زمین پر جاری ہے- اس سلسلہ میں تو کروڑوں آدمی آپ کی بیعت میں داخل ہوئے-" (۳)

۱- تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار ص ۱۰۹
۲- تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار ص ۱۱۰ ۳- سوانح احمدی از مولوی محمد جعفر تھانیسری ص ۹۵

سید صاحبؒ کی دعوت و تربیت اور ان کی خلفاء کی سعی و کوشش سے مجاہدین و
مبلغین کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس کے بارے میں اس جماعت کا ایک شدید
مخالف سرولیم ہنٹر لکھتا ہے:

"اس جماعت کے ایک ایک مبلغ کے پیرو اسی اسی ہزار ہیں' ان میں
آپس میں مکمل مساوات ہے' ہر ایک دوسرے کے کام کو اپنا ذاتی کام
سمجھتا ہے اور مصیبت کے وقت کسی بھائی کی مدد میں کسی بات سے عذر
نہیں ہوتا۔" (۱)

قارئین محترم: یہاں یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ تحریک دیوبند کوئی نئی
تحریک نہیں بلکہ حضرت مجدد صاحبؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تحریک کا
تسلسل ہے۔ اکابر علماء دیوبند کے علوم و معارف اور سلوک و طریقت کے سلسلے
انہی حضرات سے وابستہ ہیں۔ اس دور میں اشاعت اسلام کے سلسلہ میں اکابر دیوبند
کی خدمات اظہر من الشمس ہیں۔ ان کے ذکر کے لیے طویل وقت درکار ہے اور یہ
حقیر مضمون ان کی خدمات کے ذکر کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ان کے ذکر
کو پس انداز کرتے ہوئے ہم بات کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ کبھی فرصت سے سن لینا
بڑی ہے داستاں میری

کتاب کا تعارف

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اخیر میں اس کتاب کا مختصر تعارف بھی کرا دیا
جائے جس کے دیباچہ کے طور پر یہ مضمون لکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے مصنف
حضرت مولانا سید محمد میاں رحمہ اللہ ہیں۔ آپ نے کم و بیش ایک سو کتابیں تصنیف
فرمائی ہیں جن میں سے ایک اہم کتاب "پانی پت اور بزرگان پانی پت" ہے اس کتاب

۱۔ مسلمانان ہند از ڈاکٹر ہنٹر خط نمبر ۵۰

میں آپ نے "پانی پت" کا تعارف کرانے کے بعد وہاں پر مدفون اولیاء اللہ کا تذکرہ
نہایت عاشقانہ انداز میں تحریر فرمایا ہے۔

خاص پانی پت کے بزرگوں کا تذکرہ لکھنے کا کیا سبب بنا؟ اس کی تفصیل تو آپ
خود اصل کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تقسیم ہند کے موقع پر
وہاں بسنے والے تمام مسلمان ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے جس کی وجہ سے
مساجد ویران اور مشاہد و مقابر اجڑ گئے تھے۔ ہندو سکھوں نے وہاں ڈیرا ڈال لیا تھا اور
وہ ان مقامات کی بے حرمتی کرتے تھے' پورے پانی پت میں صرف ایک مرد مجاہد
مسلمان مولانا لقاء اللہ عثمانیؒ تھے جنہوں نے وہاں رہ کر حالات کا مقابلہ کیا اور جان
کی بازی لگا کر شعائر اللہ کی حفاظت کی انہی بزرگ کی سعی و کوشش سے وہاں دوبارہ
احیاء اسلام ہوا مساجد آباد اور مزارات و مقابر بحال ہوئے۔ جزاہ اللہ عنا و عن جمیع
المسلمین خیراً۔ مولانا لقاء اللہ عثمانی مرحوم کا جمعیت علماء ہند سے تعلق ہونے کی
بناء پر سید الملت حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ سے گہرا تعلق تھا۔ آپ نے مولانا
کو پانی پت آنے کی دعوت دی اور اولیاء پانی پت کے حالات لکھنے کا شدید تقاضا کیا۔
آپ کے تقاضے کی بناء پر حضرت مولانا محمد میاں صاحبؒ نے یہ عظیم کتاب تالیف
فرمائی جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ حضرت مولانا کی یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں چھپی
اور چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی۔ دوبارہ شائع ہونے کی نوبت نہ آنے کے
سبب یہ کتاب نایاب ہو گئی۔ حتیٰ کہ مصنف کے گھر تک میں اس کا وجود نہ رہا' راقم
الحروف کو عرصہ سے اس کتاب کے مطالعہ کا اشتیاق تھا۔ تلاش بسیار کے بعد
دستیاب ہوئی تو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ کتاب ناقص ہے۔ چند صفحات بیچ میں سے
غائب ہیں۔ ۱۹۹۸ء میں ناچیز ہندوستان کے سفر کے دوران دیوبند گیا تو
دارالعلوم کی لائبریری سے کتاب حاصل کر کے گم شدہ اوراق کی فوٹو اسٹیٹ
کروائی اس کتاب کو دیکھنے سے پتہ چلا کہ اصل کتاب میں بزرگان پانی پت کے

مزارات کی نہایت خوبصورت تصاویر بھی تھیں جو پاکستانی نسخے سے کاٹ لی گئی تھیں۔ راقم نے حضرت نفیس الحسینی شاہ صاحب دامت برکاتہم سے اس کا تذکرہ کیا۔ آپ نے ذاتی دلچسپی لے کر اپنے ایک دوست سے کتاب حاصل کی، اس کتاب سے تصاویر اخذ کر کے اس ایڈیشن میں شامل کر دی گئیں، بہر کیف جب کتاب مکمل ہوئی تو راقم نے مولانا ریاض درانی کے اصرار پر طباعت کے لیے کتاب انہیں دیدی اور انہی کے اصرار پر اس کتاب کا دیباچہ لکھا۔ اللہ کے حضور میں دعا ہے کہ وہ ہماری اس سعی و کاوش کو قبول و منظور فرمائے اور آخرت میں ان بزرگان دین کا ساتھ اور ان کی معیت نصیب فرمائے۔ آمین!

نعیم الدین
۴ شوال المکرم ۱۴۲۰ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الّذین اصطفیٰ

پانی پت اور بزرگانِ پانی پت

عام عقیدت کے اسباب

پانی پت ہندوستان کا مشہور شہر ہے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مشہور سپہ سالار اور فاتح راجہ "ارجن" نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔

دہلی یہاں سے جنوب کی جانب ۵۳ میل کے فاصلہ پر ہے اور جانب شمال میں تقریباً ۴۰ میل کے فاصلہ پر برادران وطن کا مشہور "تیرتھ" کورک شیتر ہے۔ جس کا دوسرا نام "تھان ایشور" تھا۔ جو بعد میں "تھانیسر" ہو گیا۔

ہندوستان کی تاریخ قدیم میں اگر "کورک شیتر" اس لیے شہرت رکھتا ہے کہ یہاں ایک خونریز معرکہ نے "حق و ناحق" کا فیصلہ کیا تھا، تو بعد کی تاریخ میں پانی پت اس لیے مشہور ہے کہ یہ بہت سی فیصلہ کن لڑائیوں کا میدان جنگ بنا۔ جہاں متعدد بار حکمران خاندانوں یا جنگجو قوموں کی قسمت کا فیصلہ کیا گیا۔ جس کی قیامت خیز اور خونریز لڑائیوں کے بعد پورے ملک میں بار بار علم انقلاب بلند ہوا۔

انقلاب ۱۹۴۷ء

دنیا کی چشم حیرت نگار نے ۱۹۴۷ء جیسا کوئی انقلاب نہیں دیکھا ہو گا۔ کہ نہ دو بادشاہتوں میں تصادم ہوا، نہ حاکم اور محکوم کے آپس میں خونریزی ہوئی۔ حکمران محفوظ، فوجیں محفوظ، مگر پنجاب و بنگال کے عوام تباہ و برباد۔ اس انقلاب نے پانی پت کا بھی روپ بدل دیا۔ تقریباً ۵۰ ہزار کی مسلم اکثریت شہر بدر، مسجدیں ویران،

مدرسے برباد' مقابر و مزارات تباہ' جس شہر میں ہزاروں حافظ قرآن اور نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی حافظ قرآن' اس شہر میں صرف ایک کلمہ گو باقی رہ گیا۔ جس کی قوت ایمانی نے اس کے قدم استقلال کو پہاڑ سے زیادہ مضبوط بنادیا۔ یہ مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کا نفس نفیس تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تقریباً دو سال بعد اسی ایک جڑ سے شاخیں پھوٹنی شروع ہوئیں۔ جمعیۃ علماء ہند نے آبیاری کا فرض انجام دیا۔ جس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک اسلامی مدرسہ قائم کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مدرسہ کو بہترین استاذ قاری محمد عمر عطا فرمادیا۔ ابتداً جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے کچھ امداد دی گئی۔ پھر وقف نواب عظمت علی خاں صاحب (آف کرنال) سے امداد مقرر ہوئی۔ اس طرح ایک تعلیمی مرکز قائم ہوا۔ پھر خدا کے فضل سے کچھ اور مسلمان بھی مختلف پیشوں کے سلسلہ میں یہاں آنے لگے۔ اب مسلمانوں کی تعداد چند سو تک پہونچ چکی ہے۔ لیکن ایک مسجد کے علاوہ باقی تمام مساجد ویران پڑی ہیں یا دوسروں کے قبضہ میں ہیں۔ اسی طرح مقدس مزارات کے گنبد اور حجرے رہائشی مکان بنے ہوئے ہیں۔ کافی جدوجہد کے بعد حضرت شاہ بو علی قلندرؒ کی درگاہ خالی کرائی گئی ہے۔

وجہ تالیف

ان حالات کی بناء پر حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کا اصرار ہوا کہ پانی پت اور بزرگان پانی پت کے حالات یکجا شائع کردیئے جائیں تاکہ چشم عبرت کے لیے ذخیرہ رہیں۔

اگرچہ علمی بے مائیگی کے ساتھ وقت کی قلت بلکہ وقت کا صحیح معنی میں قحط احقر کے لیے معقول عذر تھا۔ لیکن حضرت مولانا کے ارشاد گرامی اور حضرات اکابر اولیاء اللہ رحمہم اللہ سے فطری انس نے مجبور کیا کہ تعمیل کی کوشش کی جائے۔ لہٰذا نہایت انتشار اور پراگندگی میں اس گلدستہ کی شیرازہ بندی کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ تکمیل کی توفیق بخشے اور خود اپنی جناب میں اور اپنی مخلوق کی نظر میں اس کو مقبول

بنائے۔ (آمین)

تاریخ پانی پت کا ایک نظر انداز پہلو

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں "پانی پت" کی شہرت انہیں سیاسی لڑائیوں کی وجہ سے ہے۔ مگر افسوس' اس اقتدار پرست سیاسی تاریخ کے وحشت خیز اور نفرت انگیز ہنگاموں میں تاریخ پانی پت کا وہ پہلو قطعاً نظر انداز ہوتا رہا جس کا تعلق اخلاق' روحانیت اور سماجی زندگی سے تھا۔ اور کسی ایک سیاسی یا مذہبی فرقہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ انسانی شرافت و عظمت اور خود ہندوستان کے مذہب پرست مزاج کے لحاظ سے اس کا بیان کرنا بہت ضروری تھا۔

چودھواں سال چل رہا ہے کہ پانی پت ۱۹۴۷ء کے اس طوفان سے گذرا تھا۔ جس نے "انقلاب" کے نام پر بھائی کو بھائی سے جدا کیا۔ یہاں تک کہ وطن عزیز کے جسم پاک کے دو ٹکڑے کردیئے۔ یکہ و تنہا صرف ایک مولانا لقاء اللہ صاحب کے علاوہ پوری مسلم آبادی یہاں سے اجڑی۔ اور مادر وطن نے وطنیت کے جس دھاگے سے ہندو اور مسلمانوں کو باندھ رکھا تھا وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ کیونکہ ہندو مسلم منافرت کے وہ بیج جو انگریزی دور حکومت میں تقریباً ایک صدی پہلے بوئے گئے تھے۔ اس وقت ان کے کڑوے پھل پوری طرح پک چکے تھے۔

لیکن کیا حیرت کی بات نہیں ہے کہ عقیدت کے وہ رشتے جو بزرگان پانی پت سے ہندو اور مسلمانوں کے مشترک طور پر صدہا سال سے جڑے چلے آرہے تھے' ان کی ایک گرہ بھی نہیں ٹوٹی۔

ایک دلچسپ معمہ

مسلمانوں کی حکومت عرصہ ہوا ختم ہوچکی' ان کا اقتدار مٹ چکا' ۱۹۴۷ء نے ان کے اس پلہ کو بھی بے وزن کردیا جو مردم شماری کے لحاظ سے پانی پت میں بھاری تھا۔ لیکن بزرگان پانی پت سے عقیدت و محبت کے وہ چراغ جو برادران وطن کے دلوں میں شروع سے روشن ہیں۔ آج بھی ان کی لو اسی طرح بھبک رہی ہے۔

اور عقیدت کے پھول جس طرح پہلے چڑھائے جاتے تھے آج بھی ان کے ہار اسی طرح پہنائے جارہے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب معمہ ہے جو اگر آج تک حل نہیں ہوا تھا تو جمہوریت کے اس دور میں جس کی بنیاد میل ملاپ' انسانی بھائی چارے' ہمدردی' غمخواری اور مساوات پر رکھی جارہی ہے' ضرور حل ہونا چاہیے۔

معمہ کا حل

حقیقت یہ ہے کہ فوجی اقتدار اور شوکت و حشمت کے سامنے مغلوب انسانوں کی گردنیں ضرور جھک جاتی ہیں' مگر دل کبھی نہیں جھکتے۔ انسانوں کے دل صرف اسی کے سامنے جھکتے ہیں جو خود اپنے خالق اور معبود کے سامنے جھکا ہوا ہو۔ جس کے دل میں انسانوں سے ہمدردی ہو۔ جو ساری مخلوق کو خالق کا کنبہ اور اس کی عیال سمجھتا ہو۔ جس نے خلق خدا کی محبت کی وادی سے اپنے خالق اور معبود تک پہونچنے کا راستہ نکالا ہو۔ جس کا عقیدہ یہ ہو کہ تخلقوا باخلاق الله (الله کی خصلتیں اختیار کرو) جس کا عملی پہلو یہ ہے کہ جس طرح اللہ رب العالمین' ارحم الراحمین ہے۔ وہ بھی اسی طرح مخلوق خدا کے لیے سراسر رحم اور پیکر شفقت بنا رہے۔ اس کی آغوش شفقت ہر مصیبت زدہ کے لیے کھلی ہوئی ہو۔ اور اس کا کاشانہ رحم' ہر ستائے ہوئے کی پناہ گاہ ہو۔ جہاں نہ رنگ و نسل کا کوئی فرق ہو اور نہ مذہب و ملت کا کوئی امتیاز ہو۔

ایک مثال

ابھی پندرہویں صدی عیسوی ختم نہیں ہوئی تھی کہ یورپ کے سفید فام' ہندوستان آنے لگے۔ ان کے تاجر آئے' ان کے مبلغ آئے' روحانی پیشوا آئے' پھر ان کے حکمران آئے' ان کی حکومت قائم ہوئی اور ان کے اقتدار کا جھنڈا ایسا بلند ہوا کہ اس کے سامنے مسلمانوں کی شوکت و حشمت کے افسانے بھی فراموش ہو گئے۔ عیسائی مشنریوں نے انتھک کوشش اور بے شمار روپیہ خرچ کر کے اپنا مذہب پھیلانے کی کوشش کی۔ جگہ جگہ مشن اسکول' کالج اور ہسپتال بنا کر لوگوں کو اپنی

طرف مائل کیا۔ اور اس پانچ سو سالہ دور (۱۴۸۵ء تا ۱۹۴۷ء) میں چند لاکھ پسماندہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنا بھی لیا۔ لیکن باہمی تعلقات کے اس طویل دور میں عیسائیوں کا کوئی ایک روحانی پیشوا بھی ایسا نہیں گزرا جس کی پاک زندگی اور روحانی عظمت نے ہندو اور مسلمانوں کے دلوں کو جھکایا ہو۔ جس کی زندگی میں سب نے مل کر اس کے "چرن" چھوئے ہوں اور مرنے کے بعد کسی بھی ہندو یا مسلمان نے اس کی تربت پر عقیدت کے پھول چڑھائے ہوں۔ اس کے برعکس پورے ہندوستان کے سینکڑوں مزارات اور درگاہوں کو چھوڑ کر صرف "پانی پت" کو لیجئے کہ یہاں بہت سے بزرگوں کی درگاہیں آج بھی ایسی ہیں جن کی طرف "خلق خدا" امنڈ امنڈ کر آتی ہے۔ اور مسلمانوں سے زیادہ نہ سہی تو کم از کم مسلمانوں کے برابر اور ۱۹۴۷ء کے بعد جہاں مسلمان نہیں رہے وہاں صرف ہندو ہی ان کی خدمت کرتے ہیں۔ ان پر چادریں چڑھاتے ہیں' چراغ جلاتے ہیں منتیں مانتے ہیں۔ اور جب خدا کے فضل سے منتیں پوری ہو جاتی ہیں تو چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ نذریں گزارتے ہیں۔ آخر یہ کیا بات ہے؟ عقیدت کا ترکہ پشتہا پشت سے ان کو کیوں ملا؟ کس طرح ملا؟

اب آیئے واقعات کی دنیا کا رخ کیجئے۔ محض خیالی باتوں اور بناوٹی کہانیوں سے نہیں۔ بلکہ تاریخ کی سچی حقیقتوں سے اس عقیدت اور محبت کی وجہ معلوم کیجئے۔

تاریخی حقیقت

مسلمان ناراض نہ ہوں آج ہمیں صاف اور سچی بات کہنی ہے۔ جب مسلمانوں نے دہلی فتح کیا تو "ملکیت اور شہنشاہیت" کی وہ ساری آن بان اختیار کر چکے تھے جس سے اسلام نے نفرت کی تھی۔

ملوکیت اور بادشاہت در حقیقت بہت بڑی خود غرضی ہے اور خود غرضی بھی زہریلی قسم کی۔ جس میں بھائی بھائی کا دشمن بن جاتا ہے۔ بیٹا باپ سے بغاوت کرتا ہے۔ ضرورت پڑے تو باپ بیٹے کا سر قلم کراتا ہے اور ماں بیٹے کے حق میں ناگن بن جاتی ہے۔

انہیں بادشاہوں کا مقولہ بلکہ عقیدہ تھا کہ "الملک عقیم" یعنی بادشاہت کوئی رشتہ نہیں رکھتی"

یہ خود پرست بادشاہ صرف بادشاہت ہی کو سب سے بڑا رشتہ اور ناتہ سمجھتے ہیں- جو ان کی بادشاہت کی حفاظت کرے- وہ اگر غیر بھی ہے تو عزیز رشتہ دار' اور جو اس سے کچھ بھی بیر رکھے' کچھ بھی اختلاف کرے- وہ اگر ماں جایا بھائی یا خود اپنے جگر کا ٹکڑا بھی ہے تو خونی دشمن-

بارہویں صدی عیسوی کے آخیر میں یعنی ۱۱۹۳ء میں مسلمانوں نے دہلی پر قبضہ کیا- جب رسول خدا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی وفات (۶۳۲ء) پر ساڑھے پانچ صدی سے زیادہ مدت گزر چکی تھی- اور اتفاق سے یہ فتح کرنے والے بھی عرب نہیں تھے- بلکہ عربوں کے بعد دوسری قوموں کے اور دوسرے ملکوں کے جنگجو اور لڑاکو سپاہی تھے جو عربوں کے اقتدار کو بھی ختم کر چکے تھے-

بیشک انہوں نے ہندوستان میں بہت سی بلند بلند عمارتیں بنوائیں- بہت سی مسجدیں اور جامع مسجدیں تعمیر کرائیں' مزارات کے بڑے بڑے قبے اور گنبد بنوائے' رعایا کے فائدے کے بھی بہت سے کام کیے- ملک کی صنعت- تجارت اور زراعت کو ترقی دی- ہندو مسلمانوں کی تفریق مٹائی- مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کو بھی فوجوں میں بھرتی کیا- ان کو اونچے اونچے عہدے اور منصب بھی دیئے- ان کے مندروں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں- یہ سب کچھ کیا مگر ان سب کی تہ میں جو جذبہ سب سے زیادہ کارفرما تھا' وہ بادشاہت کا جذبہ تھا اور یہ جذبہ ایسا تھا کہ جب ابھرتا تھا تو جس طرح کبھی سخاوت کے دریا بہاتا تھا- اسی طرح وہ کبھی خون کی ندیاں بھی بہا دیتا تھا- جس میں ڈوبنے والے غیر نہیں بلکہ بسا اوقات خود اپنے ہوتے تھے- اپنے ہی عزیز رشتہ دار ایک دوسرے کے قاتل- ایک دوسرے کے حق میں جلاد اور درندے بن جاتے تھے-

ہمیں یہاں بادشاہت کی تاریخ لکھنی نہیں ہے کہ ثبوت کے لیے مثالیں لکھیں ہمیں بزرگانِ پانی پت اور سردست حضرت قلندر صاحب کے کچھ حالات لکھنے ہیں

اور اسی مناسبت سے اس زمانہ کی بادشاہت کا مختصر سا نقشہ کھینچا ہے- تاکہ یہ معمہ حل ہو سکے کہ ہندو بھائیوں کے دلوں میں ان بزرگوں کی اتنی عقیدت کیوں ہے کہ سینکڑوں سال اور پچاسوں پشتیں گزر گئیں- اور یہ عقیدت ختم نہیں ہوئی-

حضرت قلندر صاحب کے زمانہ کا سیاسی ماحول

حضرت قلندر صاحب کے بچپن میں اس خاندان کی بادشاہت تھی جس کو 'غلاموں کا خاندان کہا جاتا ہے اور اتفاق سے اس زمانہ میں وہ بادشاہ حکمراں تھا جو صرف اس خاندان میں نہیں بلکہ دہلی کے تمام بادشاہوں میں اپنی طبیعت کی نیکی اور دل کی بھلائی میں مشہور ہے-

یہ شمس الدین التمش کا سب سے چھوٹا لڑکا "ناصر الدین محمود" تھا-

اس نے اگرچہ دولت کے پوتڑوں میں جنم لیا تھا- بادشاہت کے گہوارے میں پلا بڑھا- اور ہمیشہ شان و شوکت کے جھولوں میں جھولتا رہا تھا- مگر طبیعت فقیرانہ پائی تھی- (۱۲۴۶ء - ۶۴۴ء) میں اس کو بادشاہ بنایا گیا- بائیس سال حکومت کی مگر اس پورے دور میں اس نے خزانہ شاہی سے اپنے لیے ایک پیسہ بھی کبھی نہیں لیا- اسلامی تعلیم کے مطابق اس کا عقیدہ یہی تھا- کہ جس کو خزانہ شاہی کہا جاتا ہے- وہ بادشاہ کا نہیں بلکہ رعایا کا ہے' بادشاہ صرف امانت دار ہے اور محافظ-

بادشاہ اگر اس میں سے لے سکتا ہے تو صرف اتنا جتنا کوئی ایک کارپرداز حکومت یا رعایا کا کوئی ایک فرد لے سکتا ہے- بعنوان دیگر جو اوسطاً ملک کے کسی ایک باشندہ کی گذران ہو سکتی ہے- اور اچھا یہ ہے کہ اتنا بھی نہ لے-

من كان غنيا فليستعفف ومن كان فقيرا فليأكل بالمعروف (سورہ نساء ع ۱)

یعنی جو مستغنی ہو (ضرورتمند نہ ہو) اس کو پاک دامن رہنا چاہیے- (اس دولت کو ہاتھ نہ لگانا چاہیے) اور جو ضرورتمند ہے وہ کھا سکتا ہے عام گذاران کے بموجب-

ناصر الدین نے اسی پہلی صورت کو اختیار کیا تھا- اس نے ملکی خزانہ سے کبھی بھی اپنے یا اپنے اہل و عیال کے لیے کچھ لینا گوارا نہیں کیا وہ بہترین خطاط اور اعلیٰ درجہ کا خوش نویس تھا- اس زمانہ میں خوشخطی بھی ایک شریفانہ اور اجلا پیشہ تھا- چھاپہ اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا تھا- کتابیں کاتبوں سے اجرت پر لکھوائی جاتی تھیں- ناصر الدین عمر بھر یہی پیشہ کرتا رہا- وہ بہترین خط سے قرآن شریف لکھ کر اجرت حاصل کرتا اور اپنا خرچ چلاتا تھا- اس نے اپنے لیے کبھی نوکر نہیں رکھا کھانا اس کی بیوی خود بناتی تھی- وہ اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتی اور گھر کا تمام کام خود کرتی تھی- ایسے بادشاہ کا دور حکومت جس قدر بھی آسودہ اور پر امن ہو کم ہے چنانچہ اس کے بائیس سالہ دور حکومت میں چین اور آرام ہی کی رنگ رلیاں رہیں-

ناصر الدین کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا یا بھائی نہیں بلکہ پرانا رفیق "غیاث الدین بلبن" جو وزیر اعظم تھا بادشاہ بنا دیا گیا- کیونکہ یہی سب سے زیادہ قابل اور مستحق اور ناصر الدین کی کامیابی میں اس کی قابلیت' جانفشانی' ایمانداری اور دیانتداری بہت بڑا دخل رہا تھا-

غیاث الدین بلبن ۶۶۶ھ (۱۲۶۷ء) سے ۶۸۷ھ (۱۲۸۸ء) تک بادشاہ رہا

ناصر الدین محمود کی طرح غیاث الدین بلبن کا دور بھی امن سے گذرا- اس کے بعد وہ پر آشوب دور شروع ہوا جس کا تصور بھی دہشت انگیز اور بھیانک اس کی فتنہ سامانی اور ہولناکی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے- ۱۲۸۷ء سے حضرت قلندر صاحبؒ کی وفات ۷۲۴ھ (۱۳۲۴ء) تک صرف ۳۸ سال کے عرصہ دہلی کے اسی تخت پر دہلی کے اسی شاہی محل میں جو جمنا کے کنارے "کلوکھڑی" تھا (جہاں آج کل ہمایوں کا مقبرہ ہے) نو بادشاہوں نے سروں پر تاج رکھا بعد دیگرے خود اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ہاتھوں قتل کر دیئے گئے- اور عبرتناک صورت سے کہ مثلاً شائستہ خاں (جس نے بعد میں اپنا نام فیروز شاہ اس کا عظیم الشان کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اپنے بادشاہ معزالدین کو ۹ (۱۲۹۰ء) میں اس کہڑی کے محل میں موت کے گھاٹ اتارا' اس کی نعش

پھنکوائی' اس کے لڑکے "شمس الدین کیومرشاہ" کو جو چند سال کا معصوم بچہ تھا قتل کر ڈالا- پھر خود بھی صرف پانچ سال حکومت کرنے پایا تھا کہ ۶۹۵ھ مطابق ۱۲۹۵ء میں اپنے بھتیجے علاؤ الدین کے ہاتھوں جو داماد بھی تھا' کڑہ مانکپور کے قریب گنگا کے کنارے کشتی میں قتل کر دیا گیا- فرق صرف گنگا اور جمنا کا رہا- نتیجہ ایک ہی رہا- کنواں نہیں کھاتی چاہ کندہ را چاہ در پیش-

حضرت قلندر صاحب کے تذکرہ میں علاوہ الدین کا ذکر بار بار آتا ہے- کہ اس کو حضرت قلندر سے عقیدت تھی- یہ علاؤ الدین یہی بزرگ ہیں-

بہر حال علاؤ الدین کی بادشاہت ۶۹۵ھ (۱۲۹۵ء) سے ۷۱۵ھ (۱۳۱۵ء) تک بیس سال رہی- کہا جاتا ہے کہ اس کو بھی زہر دیدیا گیا- اس کے مرنے کے بعد ۷۱۵ھ سے حضرت قلندر صاحب کی سال وفات ۷۲۴ھ مطابق ۱۳۲۴ء تک یعنی صرف نو سال کے عرصہ میں چار بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت پر بٹھائے گئے اور قتل کر دیئے گئے- بیشک یہ قتل ملک میں خفیہ سازشوں کے ذریعے ہوئے- فوجوں کی چڑھائی نہیں ہوئی- اس وجہ سے شہروں میں مار دھاڑ اور آبادیوں کی تباہی و بربادی کی نوبت بھی نہیں آئی- مگر جب بادشاہ قتل ہوتا ہے تو نیا بادشاہ مقتول کے عزیزوں ہی کو نہیں بلکہ جن جن پر مقتول کی حمایت کا شبہ ہوتا ہے- ان سب ہی کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے- اس کے وزیروں اور افسروں کو معزول' معطل اور قتل وغیرہ طرح طرح کی سزاؤں کے شکنجہ میں کستا ہے- تاکہ اس کا رعب قائم ہو اور اس کی دھاک بیٹھے-

ظاہر ہے اس افراتفری سے عوام میں کتنا خوف و ہراس اور کتنی پریشانیاں اور سراسیمگی پھیلتی ہے-

اس سلسلہ میں اسی علاؤ الدین کے دو قصے سن لیجئے- ان سے معلوم ہوتا کہ بادشاہت کیا چیز ہے- اور اسلام نے اس پر کیوں لعنت بھیجی ہے- یہاں تک کہ بادشاہ شاہنشاہ (ملک' ملک الاملاک) کے نام تک پسند نہیں کیے-

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

ان اختی الاسماء الی الله ان یسمیٰ ملک
الملوك رواكما قال صلی الله علیه وسلم
(بحواله ترمذی)

یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ مستحق ملامت و نفرت
ملک الملوک (شاہنشاہ) کا خطاب ہے۔

پہلا واقعہ جنگ گجرات کے نتیجہ میں پیش آیا تھا۔ گجرات پر حملہ کے لیے ج
فوج بھیجی گئی تھی اس میں ایک کمپنی ان تاتاری نوجوانوں کی بھی تھی جو مسلما
ہو گئے تھے۔ ان کو نو مسلم مغل کہا جاتا تھا۔ فوج کی قیادت ملک نصرت کے سپر
تھی۔ جو علاؤالدین کا مقرب اور عزیز تھا، گجرات فتح ہوا تو مال غنیمت کی تقسیم م
کچھ جھگڑا ہو گیا۔ بات یہاں تک بڑھی کہ نو مسلم مغلوں نے ملک نصرت خاں ک
بھائی "ملک اعزالدین" کو مار ڈالا۔ دہلی واپس ہو کر یہ قصہ بادشاہ کے سامنے پ
ہوا۔ بادشاہ نے تو یہی فیصلہ کیا تھا کہ مجرموں کو گرفتار کر کے جیل خانوں میں ڈ
دیا جائے۔ مگر ملک نصرت خاں اپنے اختیارات یہاں تک کام میں لایا کہ ان ک
عورتوں اور بچوں کو بھی گرفتار کیا اور بھنگیوں کو حکم دیا کہ شیر خوار بچوں کو پکڑ کر
کی ماؤں اور بہنوں کے سروں پر اس زور سے پٹخیں کہ ان کے بدن پاش پاش
جائیں۔ (معاذ اللہ)

اس قسم کا ایک اور واقعہ فتح کرناٹک اور مالابار کے بعد پیش آیا۔ بادشاہ
مسلم مغلوں کو فوج سے برطرف کرنا چاہا۔ ان مغلوں نے بادشاہ ہی کو ختم کر ڈ
کی سازش شروع کر دی۔ بادشاہ کا اقبال سامنے تھا اس کو سازش کا قبل از وقت
ہو گیا۔ پھر کیا تھا حکم دیدیا کہ پورے قلمرو میں جس قدر مغل نو مسلم ہوں،
ایک دن کے اندر قتل کر دیا جائے۔ فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۶
ہزار مغل نو مسلم ایک دن میں موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ان کی عورتو
بچوں کو ذلیل اور خوار کر کے منتشر کر دیا گیا۔

بہرحال بادشاہ اور ان کے شاہ پرست ساتھی خواہ کتنے ہی عدل و انصاف

خدا پرستی کے تخت پر جلوہ افروز ہوں۔ مگر جب بھی ان کی خود غرضی کی آخری تمنا
یعنی بادشاہت کے لیے کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے وہ درندوں سے بھی زیادہ درندہ
بن کر نمودار ہوتے ہیں اور وہ سب کچھ کر ڈالتے ہیں جس کا تصور بھی رونگٹے کھڑے
کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

یہ خود مسلمانوں کا حال تھا۔ جو اس وقت حکمران تھے۔ اب ہندوؤں کو لیجئے۔
اگرچہ حکمران طبقہ کے آپس کی مار دھاڑ اور کشت و خون کا ان پر اثر نہیں پڑتا تھا۔ اور
اب مسلمانوں سے جنگ کی حالت بھی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ سو سال سے زیادہ کا
عرصہ ہو گیا تھا کہ پورے شمالی ہند پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ لیکن ظاہر ہے اپنے
پرانے راج کی یاد ان کے دلوں میں ہمیشہ سلگتی رہتی تھی۔ اس وجہ سے ان میں اپنی
مجبوری اور کمتری کا احساس قدرتی امر تھا۔ اس کے علاوہ جنوبی ہند کے راجاؤں سے
چھیڑ چھاڑ چلی جاتی تھی۔ خاص علاؤالدین خلجی کا دور تو بہت ہی زیادہ طوفانی اور
ہیبت انگیز تھا۔ مہارانا چتوڑ سے علاؤالدین کی لڑائی کے قصے آج تک مشہور ہیں، اور
راجکماری پدمنی سے علاؤالدین کے عشق و محبت کے افسانے کو اگر شاعروں کی من
گھڑت مان لیا جائے، تب بھی یہ تو صحیح ہے کہ چتوڑ فتح ہونے پر بہت سے راجپوت
مردوں اور عورتوں نے موت کو زندگی پر ترجیح دی۔ کیا عام ہندوؤں کے لیے یہ درد
انگیز صورت، رنج اور صدمہ کی بات نہیں تھی۔ بہرحال علاؤالدین کے حملے چتوڑ
تک ہی نہیں رہے وہ اس سے پہلے دہلی سے ایک ہزار میل کرناٹک تک پہنچ کر دیوگیر
پر قبضہ کر چکا تھا۔ اور وہاں کے راجہ رام دیو سے سینکڑوں من سونے کے علاوہ سات
من موتی دو من جواہر (لعل، یاقوت، الماس، زمرد وغیرہ) وصول کر چکا تھا۔ جس
سے پورے ملک میں ایک تہلکہ مچ چکا تھا۔ ظاہر ہے اس قسم کی لڑائیوں سے کتنی
پریشانی ہندوؤں کو ہوگی اور وہ اپنے آپ کو کتنا بے پناہ سمجھتے ہوں گے۔

اس وقت ایک طبقہ تھا۔ جو ان بے پناہوں کی پناہ تھا۔ جو سب ہی انسانوں کا
ہمدرد اور بے سہاروں کا سہارا تھا۔ جس کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے
تھے۔ جس کی محبت بھری گود ہر فریادی کے لیے پھیلی ہوئی تھی۔ جو یتیموں کے سر

پر ہاتھ رکھتا- بچھڑے ہوؤں کو سینے سے لگاتا- ان کی ڈھارس بندھاتا- ان کی مایوسیوں کو ختم کر کے زندگی کی دشواریوں کو حل کرتا- یہ انہیں اولیاء اللہ کا طبقہ تھا- جن کے پاس نہ تو فوجیں تھیں نہ حکومت کا کروفر تھا اور نہ دولت کے خزانے تھے' نہ ان کے پاس قلعے اور محل تھے- مگر یہ شاہ کہلاتے تھے- کیونکہ بادشاہوں کی بادشاہی ظاہری دنیا پر تھی اور دلوں کی دنیا پر جو بادشاہت کرتے تھے- وہ یہی گدڑیوں کے لعل تھے- جو ہاتھ خالی تھے' مگر دولت بداماں کیونکہ ہزاروں انسان دونوں وقت ان کے لنگر خانوں سے سیر ہوتے تھے-

یہ کچے کوٹھوں چھپروں اور جھونپڑوں میں رہتے مگر قلعہ میں رہنے والوں سے زیادہ محفوظ تھے- کیونکہ ان کا دشمن وہی ہوتا جو خود اپنا دشمن ہوتا- اور اپنی تباہی خود اپنے ہاتھوں مول لیتا-

بادشاہ ان کے محتاج ہوتے تھے- کیونکہ بادشاہوں کو عوام کی ضرورت ہوتی تھی- اور عوام ان درویشوں کے ساتھ تھے- وہ انہیں کے جھونپڑوں کو اپنا قلعہ سمجھتے تھے- اور انہیں کے کچے کچے گھروندوں کو دربار اور درگاہ کہا کرتے تھے- آپ کو تعجب ہوگا- مگر یہ حقیقت ہے کہ بادشاہ ان سے ملاقات کی درخواست کرتے اور یہ ان سے کترا جاتے- بادشاہ ان کو جاگیریں پیش کرتے اور یہ معذرت کر کے اپنا دامن جھاڑ لیتے تھے-

انگریزوں کے زمانے میں جو مصیبتیں عوام پر آئیں- انگریزوں کے نہ کسی پادری نے عوام کی مدد کی اور نہ ان کے کسی پوپ کا دامن رحم مظلوموں کے لیے کشادہ ہوا- مگر مسلمانوں کے دور حکومت میں حکومت کے ذمہ داروں سے جو مصیبتیں پہونچیں' یہ اللہ والے فقیر ان مصیبتوں میں بادشاہوں کے ساتھ نہیں بلکہ عام مظلوموں کے ساتھ ہوتے ان کے فریاد رس بنتے اور ان کی بگڑی کو سنوارنے کی پوری کوشش کرتے تھے-

یہی رام دیو' جس کو لوٹ کھسوٹ کر علاؤالدین خلجی نے اپنا باجگذار بنا لیا تھا- اسی کے معاصر راجاؤں کے فرزند ہردیو' سیتل دیو' چیتل دیو اور سنبھل دیو

تھے- "ہردیو" تو ایک فوجی افسر "خواجہ حسن علامہ سنجری" سے (جو خراج وصول کرنے کے لیے "دیوگڈھ" گیا تھا) مانوس ہو گیا تھا- اور خواجہ حسن کی زبانی حضرت خواجہ نظام الدین سلطان الاولیاء کی تعریفیں سن کر ان کی زیارت کے لیے دہلی آیا تھا- مگر باقی تینوں جو ایک ہی راجہ کے بیٹے تھے اور آپس میں حقیقی بھائی تھے- ایک عرصہ کے بعد اپنے وطن سے جلاوطن ہو کر مصیبتیں جھیلتے ہوئے دہلی پہونچے تھے- اور ایک ہی دفعہ میں اتنے مالا مال ہو گئے کہ ان کی ساری مصیبت دور ہو گئی- اور اگرچہ حضرت خواجہ کا خود اپنا کوئی مکان نہیں تھا- مگر ان تینوں نے حضرت خواجہ کی معمولی مہربانی سے اپنے لیے محل تعمیر کرا لیے- اس کی تفصیل نہایت پر لطف ہے' مطالعہ فرمایئے اور ان بزرگوں کی عام شفقت و محبت کا اندازہ کر لیجئے-

واقعہ یہ ہوا کہ سیتل دیو اور اس کے بھائیوں کو دہلی پہونچے ہوئے دو ایک دن ہی ہوئے تھے- کہ حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی تعریفیں سن کر ان کی زیارت کے لیے خانقاہ میں پہونچے- حضرت کے یہاں مریدوں کا مجمع تھا- جہاں حضرت تشریف فرماتے وہ سارا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا- دو بھائی باہر کھڑے رہ گئے اندر نہیں جا سکے- سیتل دیو اندر پہونچ کر اس مجمع میں بیٹھ گیا-

غربت افلاس اور مصیبتوں کے سفر کے سبب سے چہرہ جھلسا ہوا' سادھوانہ وضع' کپڑے پھٹے ہوئے' میلے کچیلے' اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا- کہ کسی ریاست کا راجکمار ہوگا- لوگوں نے یہی سمجھا کہ کوئی سادھو ہے جو مجلس کی رونق دیکھنے آگیا ہے- اتفاق سے اسی وقت علاؤالدین بادشاہ کے دو افسر ملک نصرت خاں اور خضر خاں بادشاہ کے بھیجے ہوئے حاضر ہوئے- ان کے ساتھ دو خادم تھے جن کے سروں پر دو تھال (طشت) تھے- جن پر زربفت کے خوان پوش پڑے ہوئے تھے- حضرت امیر خسرو ان کی قیادت کر رہے تھے- ان تینوں نے حضرت خواجہ نظام الدین سلطان الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے قریب پہونچ کر بادشاہ کا سلام عرض کیا- خادموں کے سروں پر سے تھال اتار کر حضرت کے سامنے رکھے اور ان کے خوان پوش ہٹائے- دونوں تھال آبدار موتیوں سے لبالب بھرے ہوئے تھے- حضرت نے ان

دونوں تھالوں کو دیکھا اور خاموش رہے ان شاہی افسران نے یہ ہدیہ پیش کرنے کے بعد اجازت چاہی اور واپس چلے گئے- حضرت خواجہ کا ایک خادم جس کا نام اقبال تھا وہ سامنے آیا- اور دونوں تھالوں کو اٹھوانے لگا- کہ اس فقیر نے جو سادھوانہ لباس میں تھا- اور کچھ فارسی عربی سیکھ چکا تھا- بلند آواز سے کہا "یا بانظام الہدایا مشترک" یہ عربی زبان کا مقولہ اس سادھو کو یاد تھا- جس کا مطلب یہ ہے کہ مجمع میں جو ہدیہ پیش ہو اس میں سب کا حصہ ہونا چاہیے -یہ درست نہیں کہ تنہا صاحب مجمع اس چیز کو استعمال کرے- اس طرح لطیف پیرایہ میں اس سادھو نے کچھ موتی مانگے-

حضرت خواجہ نے فوراً جواب دیا- "بل تنہا خوشترک" یعنی پورا مجمع نہیں بلکہ صرف تنہا آپ کے لیے یہ ہدیہ خوشی پیش ہے- سادھو نے اول اس کو مذاق سمجھا- مگر حضرت خواجہ نے دوبارہ پوری سنجیدگی سے فرمایا کہ دونوں تھال آپ ہی کے ہیں-

جب سادھو کو یقین ہو گیا کہ یہ دولت اس کو صرف اس کے ایک فقرہ پر عطاء کر دی گئی تو ان کو اٹھانے کے لیے آگے بڑھا- حضرت خواجہ نے حاضرین سے فرمایا- اس قلندر سے دونوں تھال نہیں اٹھیں گے کوئی ان کی مدد کرے- اس مجمع میں "ہر دیو" بھی موجود تھے- انہوں نے آگے بڑھ کر یہ تھال اٹھوائے اور اس خیال سے ساتھ ساتھ چلے کہ اس کو باہر جا کر سمجھا دیں کہ یہ بہت قیمتی موتی ہیں- ان کو یوں ہی کسی معمولی قیمت پر نہ دیدینا- ہر دیو خود جوہری تھا- وہ جوہر کی قدر جانتا تھا- جب یہ دونوں باہر نکلے تب ہر دیو نے سادھو کو غور سے دیکھا تو اس کو شبہ ہوا کہ یہ اس کی جان پہچان کا کوئی آدمی ہے اور وہ اس کو کہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہے- غرض باہر نکل کر بات چیت شروع ہوئی تب ہر دیو کو معلوم ہوا کہ یہ اسی کے وطن کا راجکمار ہے جو گردش زمانہ سے گرتا پڑتا کسی طرح یہاں پہونچا ہے- ہر دیو جب باہر نکلا تو وہاں ستیل دیو کے دونوں بھائی بھی تھے ان سے بھی ملاقات ہوئی-

مختصر یہ کہ یہ راج کمار جو بادشاہ کے اقدام سے تباہ ہو چکے تھے- حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمہ اللہ علیہ کی معمولی توجہ سے پھر دولت مند ہو گئے-

اور جو اپنی زندگی سے آزردہ ہو چکے تھے- جن کے لیے زندگی بوجھ بن گئی تھی- وہ معمولی نظر لطف و کرم کے طفیل میں عیش و آرام کے جھولے میں جھولنے لگے اور ان کی زندگی سدا بہار بن گئی-

یہ ایک واقعہ ہے اس قسم کے بہت سے واقعات تاریخ کے اوراق میں پھیلے ہوئے ہیں- ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ درویش یہ گدا' بے نوا یہ فاقہ مست اولیاء اللہ جو خود جو کی سوکھی روٹی کھا کر زندگی گزارتے تھے- دوسروں کے لیے خصوصاً بادشاہوں کے ستائے ہوئے مصیبتوں کے مارے ہوئے دکھی انسانوں کے لیے ابر رحمت اور بخشش و سخاوت کے دریاء بے پایاں ہوا کرتے تھے-

یہ کیا چاہتے تھے ؟ یہ بھی سن لیجئے :

اسی واقعہ کو لیجئے- اگلے روز جب ہر دیو نے آ کر پھر حضرت خواجہ کو ان سادھوؤں کی حقیقت بتائی کہ یہ اسی ملک کے راج کمار ہیں- جہاں سے علاؤالدین بادشاہ سات من موتی لے کر آیا ہے- تو حضرت خواجہ نے فرمایا :

ہر دیو سنو! اللہ تعالیٰ کی شان نرالی ہے- ہر دن اس کی شان جدا ہوتی ہے- ایک شان ہے کہ ایک سے دوسرے کو دلوایا- دوسری شان یہ ہے کہ جس کو دلوایا تھا- اس نے اس کو واپس کر دیئے- جس کے یہ موتی تھے-

دیکھو! ہر دیو یہ موتی سمندروں کی تہہ میں سیپ کے پیٹ میں پیدا ہوئے- غوطہ لگانے والوں نے سیپ دریا سے نکالے ان کا جگر چاک کر کے ان سے موتی نکالے' موتی بازار میں بکے- جوہریوں سے امیروں نے خریدے- امیروں سے بادشاہوں نے چھینے- بادشاہوں سے یہ موتی درویشوں کے یہاں آئے- درویشوں نے دیکھا کہ ان کے دل میں ان موتیوں کی کوئی جگہ نہیں ہے- کیونکہ وہاں خدا کی محبت کے بہت سے آبدار موتی بھرے ہوئے ہیں- بس درویشوں نے یہ موتی ان کے حوالے کر دیئے جن کو ان کی ضرورت تھی- جو کہہ رہے تھے کہ موتی ہمارے اور ہم موتیوں کے ہیں- ہم نے ان کے دلوں کی آواز سنی- ہم نے کہا موتی تمہارے ہی ہوں گے- مگر تم موتیوں کے ہرگز نہیں ہو- کیونکہ ہر آدمی خدا کے

لیے پیدا ہوا ہے ہم نے موتی دیدیئے حق بحق دار رسید- مگر ہم نے مفت نہیں
دیئے- ان موتیوں کے بدلے ہم نے تین دل لے لیے' دل کی محبت موتیوں سے
کہیں زیادہ ہے- ایک دل پوری دنیا اور مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے- دل رب ذوالجلال
کا جلوہ گاہ ہے اس کو جیت لیا تو پوری دنیا کو جیت لیا-

یہ ہے درویش کا تصور-

یہی دل جو بادشاہ کی نظر میں گھاس کے تنکے کی برابر بھی نہیں جس کو وہ جب
چاہتا ہے مسل دیتا ہے-

یہی دل درویش کی نظر میں پوری دنیا اور اس کی تمام دولتوں سے زیادہ قیمتی
ہے- کیونکہ یہ انسانیت و شرافت کا مرکز اور اس کے محبوب حقیقی کی جلوہ گاہ ہے-

بیشک ان درویشوں اور قلندروں کو اپنے خدا سے محبت تھی' یہ خدا کے
عاشق تھے- اور اسی کے عشق میں رات دن مست رہتے تھے- ایسے مست کہ ان
اپنے تن من کی خبر نہ رہتی تھی نہ اپنے فرزند و زن کی- مگر یہ عشق خدا' عشق خلق
خدا کے رنگ میں ظاہر ہوتا تھا-

ان کی بارگاہ میں نیک و بد' اچھے برے' مسلمان اور ہندو کا سوال نہیں تھا' بلکہ
برا ہوتا تھا اس سے ان کی ہمدردیاں اور زیادہ ہوتی تھیں- کیونکہ یہ بزرگ انسانی
اور روحانیت کے طبیب حاذق ہوتے تھے- برے آدمی روحانیت کے مریض
بیمار' طبیب اور ڈاکٹر بیماروں سے نفرت نہیں کرتے بلکہ جو زیادہ بیمار ہوتا
اس سے ان کی ہمدردیاں اور زیادہ ہوتی ہیں-

حضرت محمد رسول ﷺ نے فتح مکہ اور جنگ حنین کے بعد مال غنیمت تقسیم
تو مکہ کے ان سرداروں کو زیادہ انعامات دیئے جو ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے
اور وفادار انصار کو (جنہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی وفاداری میں اپنا سب
قربان کر دیا تھا) یہ فرما کر مطمئن کر دیا- "کیا تم اس پر راضی نہیں کہ مکہ کے یہ
دنیا کا مال و متاع لے کر اپنے گھروں کو لوٹیں اور تم محمد رسول اللہ ﷺ (
محبوب) کو لے کر اپنے وطن واپس ہو-"

یہ انصار صفت درویش اور قلندر جن کے نہاں خانہ دل میں اللہ کی محبت کے
بعد اگر کسی کی محبت تھی تو وہ اس کے رسول ﷺ اور نبی ﷺ تھے- ان کو اپنے نبی
اور رسول کا بتایا ہوا یہ سبق ہمیشہ یاد رہتا تھا کہ تخلقوا باخلاق اللہ- یعنی
عاشق اپنے معشوق اور محبوب کا رنگ ڈھنگ اختیار کیا کرتا ہے- اس کو اپنے محبوب
کی خصلتوں سے بھی ایسا ہی عشق ہوتا ہے جیسا کہ اپنے محبوب سے- بس تمہیں اللہ
سے عشق ہے تو تم اللہ کی خصلتیں اپنے اندر پیدا کرو- اور انہیں خصلتوں کو اپنا
محبوب و معشوق بنالو-

اللہ تعالیٰ کی خصلتیں کیا ہیں؟ اس کی پہلی خصلت یہ ہے کہ وہ رب العالمین
ہے- یعنی اچھے برے' مسلمان غیر مسلمان' انسان غیر انسان سب کا رب' سب کا
پالنہار- یعنی وہ اپنے سے بے نیاز ہے- لیکن ہر ایک کا کارساز- وہ خود نہ کھاتا ہے نہ
پیتا ہے نہ راحت و آرام کی اس کو ضرورت ہے- مگر ہر ایک کے لیے رزاق ہے'
روزی رساں ہے- ہر ایک کے لیے راحت و آرام کے سامان مہیا کرتا ہے وہ ارحم
الراحمین ہے- بلا امتیاز مذہب و ملت اور بلا امتیاز رنگ و نسل' ہر ایک پر رحم کرتا ہے-

بس ان بزرگوں کا نصب العین بھی یہی تھا- یعنی اپنی فکر نہیں' ہر ایک کی فکر'
خود اپنے سے بے نیاز' اور ہر ایک کے کام آنے والے' ہر ایک کے لیے رحم و کرم
کے دیوتا- ہر ایک کے کارساز-

ان بزرگوں نے قرآن شریف سے یہ سبق لیا تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو
نوع انسان کے ساتھ وہ ہمدردی تھی کہ اس کی فلاح و بہبود کی فکر میں خود اپنی جان
کی فکر سے بے نیاز ہو گئے تھے- وہ خلق خدا کی ہمدردی اور غمخواری میں اپنی جان
قربان کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے- بلکہ ان کی تمنا اور آرزو تھی کہ وہ اپنی جان
قربان کر دیں- اپنے تن' من' دھن کو اس کی راہ میں کھپا دیں- وہ اسی کے لیے
رات دن بے چین رہتے تھے-

ان بزرگوں نے محمد رسول اللہ ﷺ سے محبت کر کے یہی سوز و گداز' یہی
ہمدردی' اسی طرح عوام کے لیے کھپنا' ان کے غم میں گھلنا سیکھا تھا- اور اسی غم

خواری خلق اللہ نے ان کو خلق خدا کا محبوب بنادیا تھا- بس یہ ایک قدرتی بات تھی ک
جس طرح ان کو انسانوں سے محبت تھی- انسانوں نے ان سے محبت کی- نہ صرف
زندگی میں بلکہ وفات کے بعد بھی محبت کی اور کر رہے ہیں- سیکڑوں برس کی تار
نے ہزاروں لاکھوں واقعات پر پردہ ڈال دیا- مگر جس حقیقت پر کوئی پردہ نہ پڑ سکا
وہ ان درویشوں کی محبت ہے-

لاکھوں باتیں انسانی ذہن سے محو ہو گئیں- دلوں کی تختیوں پر ان کے م
ہوئے نشان بھی باقی نہیں رہے- مگر ان بزرگوں کی محبت کچھ اس طرح پتھر کی لکی
ن چکی ہے کہ آج تک مٹی ہے نہ آئندہ مٹے گی- جس طرح ان پاک بندوں
عشق خدا اور ہمدردی خلق خدا میں ابدی زندگی حاصل کی- اسی طرح ان کی محب
ان کے دلوں میں زندہ و جاوید ہو گی- جن کے لیے یہ مٹے تھے اور فنا ہوئے تھے-

بادشاہ کے متعلق ان بزرگوں کے خیالات

راج کمار "ہردیو" سے آپ واقف ہو چکے ہیں- یہ حضرت سلطان الاولیاءؒ
خدمت میں حاضر رہتے تھے- اور جب موقع ملتا تو حضرت امیر خسرو کی باتوں
دل بہلایا کرتے تھے- ہردیو کی ایک ڈائری بھی ہے جس میں وہ روزمرہ کے واقعا
اور ملفوظات لکھ لیا کرتا تھا-

ایک مجلس کی دلچسپ گفتگو آپ بھی سن لیجئے- اس سے ان بزرگوں کی
زندگی کا نقشہ بھی سامنے آجاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گا کہ ان کے خیالا
بادشاہوں کے متعلق کیا ہوا کرتے تھے-

ہردیو- میں نے کہا حضرت (سلطان الاولیاءؒ) دن بھر روزے رکھتے ہیں
رات کو فقط جو کی روٹی کھاتے ہیں اس سے ان کی جسمانی طاقت بہت کم ہو جا
کا ڈر ہے-

حضرت امیر خسرو نے جواب دیا- خدا کی یاد ان کے جسم کی طاقت کے
کافی ہے-

ہردیو کہتے ہیں- میں نے امیر خسرو سے علاؤالدین خلجی کی برائی کرنی شروع
کی اور کہا کہ وہ بہت ہی برا بادشاہ ہے-

امیر خسروؒ نے میری بات سنی تو وہ بہت ہنسے اور انہوں نے کہا "ہردیو" تو نے
کبھی کسی ڈاکو کو دیکھا ہے- میں نے جواب دیا- ایک نہیں بہت سے ڈاکو دیکھے ہیں-
امیر خسرو نے پوچھا ڈاکو کس کو کہتے ہیں- میں نے کہا جو دوسروں کا مال لوٹ لے اور
جان لے لے عورتوں اور بچوں پر رحم نہ کرے اس کو ڈاکو کہتے ہیں-

امیر خسرو نے مسکرا کر کہا- کہ اور تو نے یہ بھی سنا ہو گا کہ ڈاکو سوائے اس گناہ
کے کہ وہ دوسروں کا مال لوٹ لیتے ہیں اور بغیر رحم کے دوسروں کو مار ڈالتے ہیں-
اور زخمی کر دیتے ہیں- اور برائیاں ان میں نہیں ہوتیں مثلاً وہ کبھی جھوٹ نہیں
بولتے جو کچھ ان کے دل میں ہوتا ہے وہی ان کی زبان پر ہوتا ہے- وہ اپنا لوٹا ہوا مال
غریبوں اور محتاجوں کو بانٹ دیتے ہیں- مہمانوں اور مسافروں کو کھانا کھلاتے ہیں
لاوارث عورتوں اور بچوں کی مدد کرتے ہیں- اور ہر وقت خدا کی مخلوق کو فائدہ
پہونچاتے رہتے ہیں- خدا کی عبادت کرتے ہیں- نماز پڑھتے ہیں- اور اگر ہندو
ہوں تو ہمیشہ مندروں میں جاتے ہیں- گنگا میں نہاتے ہیں- تم مجھے بتاؤ کہ ان
ڈاکوؤں کی یہ اچھی باتیں اچھا کہنے کے قابل ہیں یا نہیں-؟

میں نے جواب دیا- "جو اچھی بات ہے وہ اچھی بات ہے اور جو بری بات ہے-
وہ بری ہے- پس ڈاکہ مارنا برا ہے اور جتنے کام آپ نے بتائے وہ سب اچھے-

امیر خسرو نے کہا کہ اگر میں کسی ڈاکو کے نیک کاموں کی تعریف کروں تو تم یہ
تو نہیں کہو گے کہ وہ ڈاکو ہے بے رحم ہے- اس کی اچھی بات کی تعریف نہ کرو- میں
تم سے یہ کہتا ہوں کہ یہ سب بادشاہ ڈاکو ہوتے ہیں- اور بہت بڑھیا قسم کے ڈاکو
ہوتے ہیں- دوسروں کا ملک چھین لیتے ہیں- ان کو مفلس و کنگال بنا دیتے ہیں- اور
ان کی عورتوں اور بچوں پر بھی رحم نہیں کرتے- مگر اس عیب کے سوا ان میں
ہزاروں خوبیاں بھی ہوتی ہیں- وہ نماز بھی پڑھتے ہیں- روزے بھی رکھتے ہیں-
خیرات بھی کرتے ہیں، بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں، ننگوں کو کپڑے بانٹتے ہیں- اور

کسی کی تکلیف نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن جب ان کو شک ہو جاتا ہے کہ کسی شخص سے ان کی بادشاہی کو خطرہ ہے تو پھر وہ رحم اور انصاف کو بھول جاتے ہیں۔ چاہے وہ شخص پیر ہو یا ان کا باپ ہو یا ان کی ماں یا ان کی اولاد ہو یا ان کا بھائی ہو۔ وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے اور سب کو فنا کر دینا اپنا بادشاہی کا ایمان و قانون سمجھتے ہیں۔

یہی حال علاؤالدین خلجی کا بھی سمجھو کہ وہ بھی دنیا کے بڑے سے بڑے ڈاکوؤں میں سے ایک بڑا ڈاکو ہے۔

ہر دیو! تم دہلی میں ابھی نئے آئے ہو۔ تم کو معلوم نہیں ہے کہ خود مختار بادشاہوں کے پایہ تخت میں زندگی بسر کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ چند روز کے بعد تم کو معلوم ہو جائے گا کہ علاؤالدین کے اکثر مصاحب اور اکثر بڑے بڑے امیر اور فوجی سردار میرے حضورؒ کے مرید ہیں۔ سوائے چند آدمیوں کے کہ وہ فقط بادشاہ کے مرید ہیں۔ اور بادشاہ کے سوائے ان کو خدا کی ضرورت ہے نہ رسول ﷺ کی ضرورت ہے تو اگر کبھی خدا کو یاد کرتے ہیں تو فقط اس لیے کہ بادشاہ ان کو خدا پرست سمجھے، وہ رسولؐ سے محبت ظاہر کرتے ہیں تو اس لیے کہ بادشاہ کو بھی رسول ﷺ سے محبت ہے۔ وہ دلی کے پیروں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ زمین پر سر جھکاتے ہیں۔ ان پیروں کو نذریں دیتے ہیں۔ ان پیروں سے دعائیں کراتے ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ بادشاہوں کی نوکری کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ کیونکہ بادشاہ ایسے سب لوگوں سے باخبر رہنا چاہتے ہیں۔ جن کا عوام پر اثر ہے۔ یہ ایک طرف پیروں کے قدموں میں سر رکھتے ہیں۔ اور دوسری طرف بادشاہ کے یہاں انہیں پیروں اور بزرگوں کی مخبری کرتے ہیں۔

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی اس گفتگو سے اندازہ کیجئے کہ یہ بزرگ اور ان کے مصاحبین شکستہ دل اور دکھی انسانوں کی کس طرح دلداری کیا کرتے تھے۔

عربی زبان کی یہ مشہور کہاوت بالکل صحیح ہے کہ "الا نسان عبد الاحسان"، یعنی "احسان کے جواب میں انسان غلام بن جاتا ہے۔" ان بزرگوں کے بھی احسانات ہوتے تھے جو احسان شناس انسانوں کو "بندہ بے دام" بنا لیتے تھے۔

ان کی محبت اور گرویدگی دل کے ہر ایک گوشہ اور بدن کے ہر ایک رگ پٹھے میں یہاں تک سرایت کر جاتی تھی کہ آنے والی نسلیں بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی تھیں۔ یہی اثرات ہیں جو پشتیں گذر جانے کے بعد بھی ان کے اندر موجود ہیں۔ ان کے دادا پڑدادا پشتہاپشت پہلے ان بزرگوں کے احسانات سے متاثر ہوئے تھے۔

باب اول

حضرت شاہ بوعلی قلندرؒ

خاندان اور نسب

آپ کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے 'دین و مذہب کے سب سے بڑے مزا[ج] شناس' وحی الٰہی کے عظیم المرتبت مفکر' منشاء شریعت کے سب سے بڑے مبصر' مذہبی قانون کے سب سے بڑے نکتہ داں' تفقہ فی الدین کے جلیل القدر مقتدا' اعظم حضرت نعمان بن ثابت ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ و رضی اللہ عنہ تک پہو[نچتا] ہے۔

والد ماجد کا اسم گرامی فخر الدین ہے۔ چند پشتوں سے غالباً فوجی خدمات کی و[جہ] سے سالار کا خطاب نام کا جزو بن گیا ہے۔ چنانچہ فخر الدین صاحب بھی سا[لار] فخر الدین کے نام و خطاب سے مشہور ہیں۔ اور ان کے والد ماجد اور جد امجد کو سالار لکھا جاتا ہے۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ تک سلسلہ نسب یہ ہے۔

شیخ شرف الدین بوعلی قلندر خلف سالار فخر الدین بن سالار حسن بن سالار' بن ابوبکر غازی بن فارس بن عبد الرحمن بن عبد الرحیم بن محمد بن دانک بن امام نعما[ن] حنیفہ کوفی بن ثابت بن نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ (سر الاقطاب ص ۲۷)

والدہ ماجدہ کا اسم گرامی جمال بی نہایت متقی' با اوقات عابدہ و زاہدہ اللہ نے حفظ کلام اللہ شریف کی دولت بھی عطا فرمائی ہے۔ اس لیے آپ کو بی بی

جمال کہا جاتا ہے۔ (خزینۃ الاصفیاء ص ۳۲۷)

ننہالی سلسلہ

شیخ محمد ابن احمد بن عثمان پانی پتی تیرھویں صدی ہجری کے صاحب قلم ہیں وہ حضرت قلندر صاحبؒ کے ہم جد ہیں۔ یعنی قلندر صاحب کے برادر بزرگ حضرت نظام الدین صاحب عراقی کے اخلاف میں سے ہیں۔ آپ نے حضرت قلندر کے حالات و مناقب میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اور حضرت قلندر صاحب کے اسم گرامی کی نسبت سے اس کا نام "شرف المناقب" تجویز فرمایا ہے۔ تصنیف کی تاریخ اور سنہ کا تو علم نہیں ہو سکا۔ البتہ ایک نسخہ جو حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی نے بڑی احتیاط سے احقر کو مرحمت فرمایا ہے۔ اس کے آخر میں تحریر ہے۔ "بتاریخ نہم ماہ صفر ۱۲۵۳ھ نسخہ ہذا شرف المناقب۔ مطابق ۱۲۴۵ء فصلی وقت سعید ختم شد۔ کاتب العاصی و مالک ہذا الکتاب بندہ ضعیف شیخ محمد یٰسین پانی پتی عفی عنہ۔"

بہر حال جب یہ قلمی نسخہ آج (۱۳۸۱ھ) سے ۱۲۸ سال پرانا ہے۔ تو تصنیف تو تقریباً دو سو برس پیشتر کی ہوگی۔

یہ شیخ محمد بن احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

شیخ فخر الدین صاحب عراقی کو حضرت خواجہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی قدس اللہ سرہ العزیز سے شرف دامادی حاصل تھا۔ لیکن یہ اہلیہ لاولد فوت ہو گئیں تو حضرت فخر الدین صاحب ہمدان تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت سید نعمت اللہ ہمدانی کرمانی کی ہمشیرہ سے آپ نے عقد کر لیا۔ آپ اس حرم کو ساتھ لے کر عراق تشریف لے گئے۔ وہاں اس حرم سے آپ کو ایک فرزند نصیب ہوا۔ آپ نے اس کا نام "نظام الدین" رکھا۔ نظام الدین صاحب نے عراق ہی میں پرورش پائی۔ جب آپ کی عمر بارہ تیرہ سال کی ہوئی تو والدین سے اجازت لے کر بسلسلہ تجارت ہندوستان تشریف لائے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے گھوڑوں کی

تجارت شروع کی اور ہندوستان گھوڑے لے کر آئے تھے- بہر حال جب آپ پانی پت پہونچے تو اس شہر اور اس کے قرب و جوار کے سرسبز و شاداب خطوں نے آپ کا دل موہ لیا- آپ یہیں رہ پڑے- کچھ دنوں بعد والدین سے بھی نہیں رہا گیا- اور وہ بھی یہیں پانی پت اپنے فرزند رشید نظام الدین صاحب کے پاس آگئے- یہیں حضرت شیخ بو علی قلندر کی ولادت ہوئی-

شیخ فخر الدین کے متعلق "جامع العلوم" کے حوالے سے لکھا ہے:

"دانشمند کامل حال بود- در علم معقول و منقول ممتاز و مشہور-"
(ترجمہ: بہت بڑے صاحب عقل و ہوش اور باکمال بزرگ تھے- جو عقلی اور نقلی علوم میں نہایت مشہور اور ممتاز تھے-)

اس کے بعد آپ کے ملتان پہونچنے کا ایک نہایت عجیب واقعہ لکھا ہے کہ آپ اپنے مدرسہ میں تشریف فرما تھے- کہ قلندروں کا ایک گروہ آیا- شیخ نے ان کی خاطر مدارات کی- ان میں ایک نوجوان سے آپ کو اتنا انس ہو گیا کہ جب یہ قافلہ روانہ ہوا- تو آپ اس کے ساتھ ہو لیے- دو چار روز اپنی اصلی وضع پر رہے- پھر ان قلندروں نے کہا کہ اگر آپ اس نوجوان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو شرط یہ ہے کہ آپ بھی چار ابرو کا صفایا کریں اور ہماری وضع اختیار کر لیں-

شیخ فخر الدین کچھ اس درجہ وارفتہ تھے کہ یہ شرط قبول کر لی- یہ قافلہ منزلیں طے کرتا ہوا خراسان سے ملتان پہونچ گیا- یہاں حضرت شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا دستر خوان اتنا وسیع تھا کہ روزانہ سینکڑوں درویش آپ کے لنگر خانے سے کھانا کھاتے تھے- یہ قافلہ بھی حضرت خواجہ ملتانی کے وسیع دستر خوان سے فیض یاب ہوا-

حضرت خواجہ مولانا فخر الدین صاحبؒ عراقی سے کسی طرح پہلے سے واقف تھے یا آپ نے نظر کشفی سے ان کو تاڑ لیا تھا- بہر حال حضرت شیخ ملتانی کو شیخ فخر الدین کی موجودہ حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا- آپ نے مولانا فخر الدین صاحب کو تخلیہ میں طلب فرما کر گفتگو کی- اور توجہ باطنی سے ایسا تصرف کیا کہ

مولانا فخر الدین صاحب کو اس حالت سے نجات مل گئی اور یہ عالم سکر ختم ہوا- اب شیخ فخر الدین، حضرت خواجہ بہاء الدینؒ کے ممنون احسان بھی تھے اور حد درجہ معتقد بھی، جس کا لازمی تقاضہ یہ تھا کہ آپ نے حضرت خواجہ ملتانی سے بیعت ہونے کی درخواست کی جو منظور ہوئی، اور آپ داخل سلسلہ ہو گئے-

طبیعت کی یکسوئی اور مقصد کے لیے جذبہ فنا، عشق مجازی میں حاصل ہو چکا تھا- صرف رخ بدلنے کی دیر تھی- حضرت خواجہ ملتانیؒ کے فیض تصرف سے وہ رخ بدل لیا- تو چند روز ہی میں مراحل سلوک طے کر کے درجہ کمال کو پہنچ گئے- یہاں تک کہ خود حضرت بہاء الدینؒ نے آپ کو دامادی کے لیے منتخب فرما لیا-

یہ ایک رخ تھا کہ کس طرح عشق مجازی سے عشق حقیقی تک پہونچے- اور یہ کہ حضرت خواجہ بہاء الدین نے کس طرح آپ کے کمال کی قدر کی، یہاں تک کہ اپنی نور چشم کو آپ کے حبالہ عقد میں منسلک کر دیا-

اب ایک اور لطیفہ کمال احتیاط کا ملاحظہ فرمایئے- اگر ادب مانع نہ ہو تو آپ اس کو "تقشف" سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں-

واقعہ یہ ہے کہ جب ان صاحبزادی صاحبہ کی وفات ہو گئی تو حضرت خواجہ بہاء الدین صاحب نے چاہا کہ دوسری لڑکی انہیں سے منسوب فرما دیں- آپ نے اپنے فرزند رشید حضرت خواجہ صدر الدین صاحب سے مشورہ فرمایا-

حضرت خواجہ صدر الدین صاحب نے سختی سے مخالفت کی- مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ آپ کے خیال میں شیخ فخر الدین صاحب "بندہ نفس" تھے- دلیل یہ بیان فرمائی کہ:

"ایک روز میں خانقاہ کے مہمان خانہ میں کھڑا ہوا تھا- صبح کا وقت تھا- میں نے بھائی فخر الدین صاحب کو دیکھا کہ کرتا اتارے نسیم صباء سے محظوظ ہو رہے ہیں- جو شخص اس درجہ حظ نفس میں مبتلا ہو- اس کو پہلے ہی لڑکی دینی مناسب نہیں تھی- چہ جائیکہ دوسری لڑکی بھی اسی کے حوالہ کر دی جائے-"

والد صاحب نے بہت سمجھایا کہ میاں صدر الدین یہ حظ نفس ایسا نہیں جو ناجائز ہو۔ فخر الدین صاحب کے لیے اتنا حظ نفس مباح ہے۔ مگر صدر الدین صاحب راضی نہیں ہوئے۔ بالآخر والد صاحب نے بھی صاحبزادے کی مرضی کے خلاف نکاح کر دینا مناسب نہیں سمجھا۔

اب شیخ فخر الدین صاحب آزاد ہو گئے تو حضرت شیخ سے رخصت ہو کر ہمدان پہونچے۔ وہاں سید نعمت اللہ صاحب ہمدانی کی بہن سے دوسرا نکاح کیا۔

پیٹ کھول کر گھومنا یا کرتا اتار دینا تنہائی میں یا مجمع میں شرعاً ناجائز نہیں ہے۔ کیونکہ مرد کا پیٹ اور پیٹھ ستر میں داخل نہیں ہے۔ جس کا کھولنا ناجائز ہو۔ البتہ مجمع میں خلاف ادب ہے۔ لیکن حضرات صوفیا کرام کا نصب العین نفس کشی ہوتا ہے ان کے اصول کے مطابق اس طرح کا حظ نفس بھی ممنوع ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں مشائخ طریقت کیسے کیسے مجاہدے اور ریاضتیں کرایا کرتے تھے۔

سید نعمت اللہ صاحب کے متعلق شرف المناقب میں تحریر ہے کہ:

"سید نعمت اللہ ہمدانی کرمانی کہ مرقدش ظاہر اور قصبہ ہانسی است"

(ترجمہ: سید نعمت اللہ ہمدانی کرمانی جن کا مزار بظاہر قصبہ ہانسی میں ہے۔)

لیکن یہ تفصیل نہیں ہے کہ ہانسی میں یہ پہلے سے تھے یا بعد میں تشریف لائے ہانسی مشرقی پنجاب کا ایک مشہور قصبہ ہے۔

سید نعمت اللہ صاحب کی ہمشیرہ جو شیخ فخر الدین صاحب سے منسوب ہوئیں۔ وہ حافظ قرآن تھیں نہایت متقی، پابند اوقات، ذاکر و مشاغل، غالباً جمال النساء نام ہوگا۔ حافظ بی بی جمال کے نام سے مشہور ہوئیں۔

صاحب شرف المناقب یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ بہت سے معتبر حضرات کا خیال ہے کہ حضرت شاہ شرف بو علی قلندر پانی پتی۔ حضرت قطب جمال ہانسوی سلطان شاہ فرخ گوہانوی اور شاہ صوفی کیتھلی یہ سب خالہ زاد بھائی ہیں۔ یہاں یہ بھی

واضح ہو جانا چاہیے کہ پانی پت، ہانسی، حصار، گوہانہ، کیتھل یہ سب مشرقی پنجاب کے قصبات ہیں اور ایک دوسرے سے تقریباً بیس بیس میل کے فاصلہ پر یا اس سے کچھ کم و بیش ہیں۔

سال ولادت

حضرت شیخ فخر الدین صاحب اس دوسرے عقد کے بعد ۶۰۰ھ میں ہندوستان تشریف لائے۔ اور تشریف آوری سے چار سال بعد ۶۰۴ھ میں دوسرے فرزند پیدا ہوئے جن کا نام شرف الدین رکھا گیا۔ بعد میں پورا نام یہ ہو گیا۔ "شیخ شرف الدین بو علی قلندر قتال۔"

ولادت کے بعد کثرت گریہ اور تسکین کی عجیب و غریب صورت

شرف المناقب کی روایت ہے کہ ولات کے بعد تین دن ایسے گزرے کہ یہ ہونے والے قلندر برابر روتے ہی رہے۔ تیسرے روز شیخ فخر الدین صاحب کے مکان کے دروازے پر ایک "چرم پوش" درویش کو دیکھا، سلام کیا۔ درویش نے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"مبارک ہو، لڑکا ہوا ہے میں اسی کو دیکھنے کے لیے منتظر کھڑا ہوں۔ فخر الدین صاحب درویش کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔ درویش نے بچہ کو دیکھا تو پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر دونوں کانوں میں یہ آیت پڑھی۔"

فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔

(جس طرف کو منہ کرلو ادھر ہی اللہ ہے۔)

اس آیت کی آواز جیسے ہی کانوں میں پڑی گریہ موقوف ہو گیا، آنکھیں کھل گئیں اور دودھ چوسنا بھی شروع کر دیا۔

درویش صاحب نے شیخ فخر الدین صاحب کو بشارت دی کہ یہ بچہ صاحب کمال عاشق خدا ہوگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ درویش نظروں سے غائب ہو گئے۔

تعلیم

فارسی آپ کی مادری زبان تھی اور عربی علمی اور قانونی زبان' آپ دونو
زبانوں کے ماہر تھے- اور اس زمانہ میں جو علوم و فنون ایک فاضل کے لیے ضرور
مانے جاتے تھے- آپ نے ان میں بھی دسترس حاصل کی- شعر و سخن متمدن
مہذب انسان کا فطری ذوق ہوتا ہے اور جذبہ عشق اس سونے پر سہاگے کا کام ک
ہے- آپ کا ادبی ذوق ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے آپ کا کلام نہایت سلیس پر
اور پر مغز' یعنی سہل ممتنع' آپ کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ اس وقت میرے سا
ہے اور غالباً یہ مطبوعہ بھی ہے- مگر عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا- البتہ آپ
مثنوی یہاں تک مشہور اور متداول ہے کہ اب سے تقریباً پچاس سال پیشتر تک
کریما سعدی کی طرح فارسی کے ابتدائی کورس میں داخل تھی-

اساتذہ

آپ کے اساتذہ کے نام معلوم نہیں ہیں- بظاہر آپ نے پانی پت ہی میں
کے اساتذہ سے تعلیم پائی- شرف المناقب کے ایک جملہ سے آپ کے ایک
مولانا سراج الدین مکی کا نام معلوم ہوتا ہے- جو آپ کی وفات کے بعد بھی
تک زندہ رہے اور بروایت مصنف "شرف المناقب" دو سو تیس سال کی عمر پا

"مولانا سراج الدین مکی کہ استاد آں عاشق الٰہی بود دو صد
دسی سال عمر شان بود-"

پانی پت سے دہلی اور سلسلہ درس و قضاء

عمر عزیز کے چالیس سال آپ نے اسی پانی پت میں گذار دیے جہاں کی
اور کوچوں میں آپ نے بچپن کے دن گزارے تھے- پھر آپ دہلی تشریف
سب سے پہلے آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس اللہ سرہ ک
میں حاضر ہوئے اور مسجد میں پہنچ کر دوگانہ شکر ادا کیا- خود آپ کی تحریر ہے-

"چوں ایں درویش ضعیف الضعیف فقیر الحقیر شرف الدین بو

علی قلندر پانی پتی از خطہ پانی پت در شہر دہلی رفت در مقام خواجہ
قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس اللہ سرہ العزیز در نماز گاہ دو
گانہ گذاردم و سر بسجدہ بردم-"

ترجمہ: جب یہ ضعیف و کمزور و حقیر شرف الدین بو علی قلندر
پانی پتی- پانی پت سے دہلی پہونچا- حضرت خواجہ قطب الدین
بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی قیام گاہ پر پہونچ کر دوگانہ شکر ادا کیا
اور سر بسجود ہوا-

پھر آپ تحریر فرماتے ہیں:

"آں روز عمر ایں درویش چہل سالہ بود در مینارہ دہلی سکونت
کردم- و آنچہ مطلوب بود از خدائے تعالیٰ خواستم-"

ترجمہ: اس وقت اس درویش کی عمر چالیس سال تھی- دہلی کے
مینارہ--- (قطب مینار) کے علاقہ میں' میں نے سکونت اختیار
کی- اور اللہ تعالیٰ سے اپنے مقصود میں کامیابی کی دعا کی-"

مگر صرف مینارہ دہلی میں سکونت ہی نہیں' بلکہ سوانح نگاروں نے تو یہ لکھا ہے
کہ آپ نے مسجد "قوت الاسلام" کو درس و تدریس کا مرکز بنا لیا- اور چالیس سال
"قطب مینارہ" کے نیچے درس و تدریس میں گذار دیئے-

اتنے طویل عرصہ تک درس و تدریس کا سلسلہ اس دور میں جب اللہ اور
رسول ﷺ کے بعد استاد اور پیر ہی کا درجہ مانا جاتا تھا- اس کے اثرات لامحالہ یہ
ہوتے تھے کہ دہلی کے تمام علمی اور سیاسی حلقوں مین آپ کی عزت و عظمت کا سکہ
جم جائے چنانچہ کہا جاتا ہے کہ امرائے دولت اور ارباب حکومت بھی یہاں تک متاثر
تھے- کہ انہوں نے پایہ تخت کا منصب قضا (جج) آپ کے سپرد کر دیا- پھر آپ بیس
سال تک فرائض قضا' پوری احتیاط اور دیانت سے انجام دیتے رہے- مگر آپ نے
خود اپنی تحریر میں جس کا عنوان حکم نامہ ہے- چالیس سال تک درس و تدریس کا
ذکر نہیں کیا- البتہ اہل علم و دانش اور ارباب فقر کے حلقہ میں جو عظمت آپ کو

حاصل تھی- اور اس وقت کے نامور مشائخ اور علماء و فضلا جس طرح آپ کو ا
مسلم مقتدا اور پیشوا سمجھتے تھے- اس کے متعلق آپ نے تحریر فرمایا ہے-

جمیع (۱) درویشان و دانشمندان جمع شدہ بایں درویش گفتند - کہ
میان ما "بزرگ" توئی- مولانا وجیہ الدین پائلی- مولانا
ظہیر الدین حتاری- مولانا صدر الدین و شریعت الدین و
مولانا فخر الدین ناقلی و مولانا شریعت الدین ترکی و مولانا معین
الدین دولت آبادی و مولانا نجم الدین سمرقندی و مولانا قطب
الدین کمی و مولانا احمد حتاری و علمایان دیگر رحمۃ اللہ علیہم
والغفران ہریک باتفاق بریں آمدند اجازت فتویٰ کردند-

لیکن یہ اثر ورسوخ کہ اکابر علماء اور مشائخ نے متفقہ طور پر آپ کو اپنا بزر
اور بڑا مان لیا- اور شرعی نقطہ نظر سے آپ ہی کے فیصلے اور فتوے کو حرف آخر
دیا- ظاہر ہے دو چار سال میں حاصل نہیں ہوتا- اس کے لیے ایک طویل مد
درکار ہے اور بظاہر یہ بات صحیح ہے کہ چالیس سال تک آپ کے حلقہ درس کی
بازاری نے دانشوروں اور علماء کو مجبور کر دیا تھا کہ آپ کو عظمت و قیادت کا
پہنائیں اور اپنی گردنیں آپ کی عزت و حرمت کے لیے خم کریں- پھر آپ
تاجپوشی اس زمانے کے بادشاہوں کی طرح چندروزہ نہیں تھی- بلکہ بیس سال
آپ کے انفاس قدسی سے مسند افتاء آراستہ رہی- خود آپ کا ارشاد ہے-

"بست سال فتویٰ دادم وسبقہ گفتم-"

بیس سال کے بعد بھی کسی باہر کے حریف نے یہ مسند نہیں چھینی' بلکہ خود
صاحب کی گیتی فطرت سے سندان عشق حملہ آور ہوا اور اس نے آبگینہ علم
پارہ کر دیا- پھر اہرمن شوق کی دست درازی یہاں تک بڑھی کہ علم کے
سفینوں کو آپ نے دریائے استغراق میں غرق کر دیا- آپ حکم نامہ میں

۱- سب درویشوں اور علماء نے اکٹھے ہو کر اس فقیر سے فرمایا- کہ ہم سب سے زیادہ
اور افضل آپ ہیں- اس اجتماع میں یہ حضرات شریک تھے-

فرماتے ہیں کہ :

"اس درویش کو چار علم بتمام و کمال عطا ہوئے- علم شریعت'
علم طریقت' علم حقیقت اور علم معرفت-"

دہلی کے جملہ فضلا نے مل کر مجھ سے درخواست کی کہ ہمیں ایک ماہ عطا کر دیا
جائے کہ ہم متفرق کتابوں کے کچھ اسباق آپ سے پڑھ لیں- مگر مجھ پر جذبہ شوق کا
غلبہ ہوا- میں دہلی سے نکل کھڑا ہوا- صحرا کی راہ لی- اول "وزیر آباد" پہونچا وہاں
دریائے جمنا کے کنارے قیام کیا- رات وہیں گزاری جب صبح ہوئی تو جتنی کتابیں
میرے پاس تھیں سب کو دریا میں ڈال دیا-

دوہا :

پنڈت لکھیا بانچ کر پوتھی مالی تو
سکھرے انجھر میٹ کر من میں سائیں لوڑ

ترک فتوے وکتاب کردم و مشغول بزہد و طاعت گشتم-

اس کے بعد آپ پانی پت تشریف لائے- پانی پت پہونچنے کی تاریخ ۱۴ محرم
الحرام تحریر فرمائی ہے- مگر سنہ تحریر نہیں ہے-

حکم نامہ کیا ہے ؟

یہاں بطور معترضہ حکم نامہ کا تعارف کرایا جاتا ہے جس کا تذکرہ سطور بالا میں
چندبار آیا ہے-

حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب نے "دیوان حضرت شاہ بو علی قلندر" کا ایک
قلمی نسخہ احقر کو مرحمت فرمایا ہے- اس کے آخر میں یہ حکم نامہ درج ہے- جس کے
کل ۵ صفحات ہیں- یہ گویا حضرت شاہ قلندر صاحب کی خود نوشت مختصر سوانح
ہے- پہلے اور دوسرے صفحہ کے چند اقتباسات سطور بالا میں پیش کیے گئے- چھ
اقتباسات آئندہ سطور میں پیش کیے جائیں گے- اب شان قلندری ملاحظہ فرمائیے
کہ اس مختصر کا بھی تقریباً ڈیڑھ صفحہ اشعار سے بھرا ہوا ہے جو ایک مغنی نے آپ کی

فرمائش پر پڑھے ہیں- گویا خود آپ کی نظر میں اپنی سوانح کا یہ ایسا واقعہ ہے جس کو مختصر سے مختصر سوانح میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا-

اب واقعہ ملاحظ فرمایئے اور دلچسپی لیجئے- واقعہ یہ ہے کہ رمضان شریف کی ستائیسویں شب اور جمعہ کی رات تھی کہ شوق الٰہی نے ایک کیفیت پیدا کی- آپ نے اسی عالم کیف میں اپنے مخلص مولانا سراج الدین رکوعی سے فرمایا:

"کسے را بیار تا چند غزل در علم موسیقی خواند تا وقت ما خوش و خرم شود-"

ترجمہ: (کسی کو بلالو تاکہ فن موسیقی کے ساتھ چند غزلیں سنا دے جس سے ہمارا یہ وقت پر فرحت و پر نشاط ہو جائے-)

مولانا نے دریافت فرمایا: کس کو بلاؤں- آپ نے فرمایا: ابراہیم کے لڑکے کو بلالو جس کا نام زکریا ہے اور شہید الشہیدی تو سین میں شان ہے-؟ کے روضہ کے قریب اس کا مکان ہے-"

مولانا سراج الدین صاحب اس لڑکے کو لے آئے- اس کی عمر ۱۴ سال تھی- اس نے دو غزلیں پڑھیں- پانچ شعر ایک غزل میں ہیں جس کا مطلع ہے-

ساربان با اشتران مست در رفتار مست
میر مست و خواجہ مست و یار مست اغیار مست

پندرہ شعر دوسری غزل میں ہیں، یہ غزل خود حضرت قلندر صاحب کی اس کا مطلع ہے-

باصورت آدم نبرد سجدہ عزازیل
زاں مدعی آرد بتو در سجدہ ماتیل

اور آخری مقطع یہ ہے-

در روئے تو دیدہ شرف اسرار عجائب
کزدے نتواں کرد حکایات بہ تمثیل

ہاں بو علی از مدعیان ہیچ زنجی
باصورت آدم نبرد سجدہ عزازیل

حضرت قلندر صاحب اتنے محظوظ ہوئے کہ آپ نے لڑکے کو قریب بلا کر اس کی کمر پر ہاتھ رکھا اور فرمایا:

"بیٹا تم ہمارے ہو- لڑکوں بالوں کا ایک انبوہ تمہیں اللہ تعالیٰ بخشے گا- تمہارے گھوڑوں کا اصطبل (خیل خانہ) بہت بڑا ہوگا-"

پھر آپ نے مولانا سراج الدین رکوعی سے فرمایا:

"جبہ و دستار ابیار تا من بریں پسر عطا کنم-"

ترجمہ: (جبہ و دستار لے آؤ تاکہ اس لڑکے کو دے دوں-"

مولانا سراج الدین صاحب نے حکم کی تعمیل کی- جبہ و دستار لا کر پیش کر دیا آپ نے یہ خلعت اس لڑکے کو عنایت فرمایا- اس کی برکت یہ تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں لوگوں نے دیکھ لیا-

"آں پسر در حضرت صدیت مقبول شد-"

ترجمہ: (وہ لڑکا مقبول بارگاہ اور خدا رسیدہ بزرگ ہو گیا-)

یہ تو حکم نامہ ہوا اب اس کی تاثیر ملاحظہ فرمایئے جو تاثیر علماء کرام نے "حزب البحر" کی بیان کی ہے- تقریباً اسی قسم کی تاثیر اس حکم نامہ کی بھی تحریر کی گئی ہے- اور اسی وجہ سے شیخ محمد عرف غلام یٰسین نے اس کو اپنے پاس محفوظ رکھنے کے لیے تبرکاً و تیمناً نقل کیا ہے-

(بتاریخ نوزدہم ۱۲۳۶ھ شعبان المعظم (یوم جمعہ) بعہد والا سپہر جاہ محمد اکبر بادشاہ غازی خلف حضرت شاہ عالم عالی گوہر مغفور)

یعنی آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے- مگر "خود غلط بود آنچہ ما پنداشتیم"

ایک طرف شیخ محمد صاحب کا یہ حسن اعتقاد ہے- دوسری جانب ایک محقق کی تحقیق ملاحظہ فرمائیے- حضرت مولانا عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں-

> رسالہ دیگر در عوام الناس شہرت دارد کہ اور احکمنامہ شیخ شرف الدین می گویند- ظاہر آنست کہ آن از مخترعات عوام است- واللہ اعلم-
>
> (اخبار الاخبار)

یعنی یہ حکم نامہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا- حضرت قلندر صاحب کی طرف اس کا انتساب بھی غلط ہے- یہ محض عوام کی گھڑی ہوئی تحریر ہے- (واللہ اعلم بالصواب)

مشائخ اور مریدین

مصنف شرف المناقب (مولانا محمد بن احمد بن عثمان) کی رائے یہ ہے کہ آپ اگرچہ اپنے زمانہ کے متعدد مشائخ کی خدمت میں حاضر رہے مگر در حقیقت آپ کی تربیت براہ راست، صدر نشین منصف ولایت جناب حضرت علی بن ابی طالبؓ کی روح مقدس سے ہوئی ہے- مولانا محمد صاحب فرماتے ہیں کہ "اگرچہ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بیعت تھے- کسی کا خیال ہے کہ آپ شیخ شہاب الدین عاشق خدا (خلیفہ امام الدین ابدالی) سے بیعت تھے (جن کا مزار دہلی میں ہے) مگر

> "انچہ بہ فقیر تحقیق پیوست ہمیں ست کہ از روح مقدس حضرت امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ، تربیت شدہ واز علوم اولین وآخرین بہرہ یاب گشتہ اند-"
>
> ترجمہ (اس فقیر کی تحقیق میں جو بات ثابت ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی روح

> مقدس سے تربیت ہوئی- اور آپ کے ان علوم سے جو اگلے پچھلے علوم پر حاوی تھے- حضرت قلندر صاحب فیض یاب ہوئے ہیں-

مولانا موصوف نے اپنے اس دعوے کی تین دلیلیں پیش کی ہیں- اول یہ کہ کسی کتاب یا رسالہ میں یہ میری نظر سے نہیں گذرا کہ آپ کسی سے بیعت ہوئے ہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے-

دوم مولانا شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی اپنی مشہور تصنیف "اخبار الاخبار" میں تحریر فرماتے ہیں-

> "نسبت ارادت او از یکے ازیں مشائخ مشہور نیست- بعضے گویند خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ارادت داشت- بعضے گویند شیخ نظام الدین اولیاء وہیچ یکے ازیں روصحبت نرسیدہ است-"
>
> ترجمہ: اس زمانہ کے مشہور مشائخ میں سے کسی سے بھی ان کو ارادت وبیعت کا تعلق نہیں ہے- بعض علماء کہتے ہیں کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے بیعت تھے- کسی کا خیال ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے تعلق ارادت رکھتے تھے- ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے-

تیسری دلیل- شیخ کالہ کی ایک روایت ہے- شیخ کالہ حضرت قلندر صاحب کے برادر زادے تھے وہ فرماتے ہیں کہ شیخ عثمان جو حضرت قلندر کے مخصوص ارادت مندوں میں سے تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک دن حضرت قلندر صاحب کے استاد مولانا سراج الدین صاحب مکی سے دریافت کیا کہ آن عاشق الٰہی (قلندر صاحب) کس کے مرید تھے- مولانا سراج الدین صاحب نے برجستہ جواب دیا- "امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے-" اس شخص نے پھر عرض کیا- مشہور تو یہ ہے کہ شاہ شہاب الدینؒ سے مرید تھے-

مولانا سراج الدین نے جواب میں فرمایا:

برادر من! بیشک عوام کو اسی بیعت و ارادت کا علم ہوتا ہے جو ظاہر میں کسی سے ہوتی ہے۔ لیکن اصل ارادت وہ ہے جو روحانیت کے لحاظ سے ہو۔ جس سے کسی کی روحانیت کی تعمیر و تربیت ہو۔ اس کا ہر ایک کو علوم نہیں ہوتا۔ اس کو وہی جانتے ہیں جو اس کے رازداں ہوتے ہیں۔

پھر مولانا نے فرمایا: میں نے خود شیخ شرف الدین صاحبؒ کی زبان سے بارہا سنا ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔

"مرا فیض روحانی از جناب حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ رسیدہ است۔ چنانچہ پرتو آفتاب بر دیوار می تابد و او منور می شود۔ (شرف المناقب)

یعنی: جس طرح آفتاب کی کرنیں دیوار پر پڑتی ہیں تو دیوار منور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آفتاب فیض کی شعاعوں نے میری تربیت فرمائی ہے۔"

صاحب شرف المناقب کی رائے سے اس حد تک تو ہمیں بھی اتفاق ہے کہ حضرت قلندر صاحب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت نہیں تھے۔ کیونکہ حکم نامہ کی تصریح کے بموجب حضرت قلندر صاحب چالیس سال کی عمر میں دہلی تشریف لے گئے ہیں۔ یعنی ۶۴۴ھ میں اور حضرت قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس سے گیارہ سال پہلے ۶۳۳ھ میں وفات پا چکے ہیں۔ لہٰذا بلاواسطہ حضرت قطب صاحب سے بیعت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اس تحقیق کی بنا پر شرف المناقب کا یہ ارشاد بھی صحیح نہیں ہے کہ:

"گاہ گاہ آں عاشق الٰہی خدمت خواجہ قطب الدین دہلوی می رفتند۔ و آنحضرت بر ایشاں توجہ و الطاف می فرمودند و در انجمن شوق و مجلس صحبت خواجہ صاحب موصوف حاضر می شدند۔"

ترجمہ: یعنی کبھی کبھی قلندر صاحب حضرت قطب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور قطب صاحب خاص توجہ اور لطف و کرم فرماتے تھے۔ اور حضرت قطب صاحب کی انجمن شوق اور مجلس تلقین میں بھی حاضر ہوا کرتے تھے۔"

بہر حال صاحب شرف المناقب کی رائے کے اتنے حصے سے ہمیں اتفاق ہے۔ کہ آپ حضرت قطب صاحبؒ سے بلاواسطہ بیعت نہیں تھے۔ لیکن اس سے ہمیں اتفاق نہیں کہ آپ کسی سے بھی بیعت نہیں تھے۔

صاحب شرف المناقب فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا۔ یہ درست ہے آپ نے اپنی زیر مطالعہ کتابوں میں سے کسی کتاب میں نہیں دیکھا ہوگا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ آپ نے حضرت مولانا سراج الدین مکی کا مکالمہ نقل کر کے خود اپنی کتاب میں قلندر صاحب کے بیعت ہونے کی تصدیق فرما دی ہے۔ کیونکہ مولانا مکی نے اس سے انکار نہیں فرمایا کہ قلندر صاحب حضرت شاہ شہاب الدین صاحب سے بیعت نہیں تھے۔ آپ نے یہ فرمایا کہ تربیت آپ کی شاہ شہاب الدین نے نہیں فرمائی۔ بلکہ تربیت حضرت شیر خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فیض روحانی سے ہوئی ہے۔ اس سے بیعت کی نفی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ انہیں کے وطن عزیز "پانی پت" کے سوانح نگار شیخ اللہ دیا (بن شیخ عبدالرحیم۔ ابن شیخ پناہ، حکیم چشتی عثمانی) اپنی مشہور تصنیف سیرت الاقطاب میں تحریر فرماتے ہیں:

"و نسبت شجرہ و خلافت کہ بقطب الشاہدین حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس اللہ سرہ العزیز مے پیوندد۔ بدیں طریق حضرت قطب ابدال مخدوم شیخ شرف الدین بو علی قلندر مرید و خلیفہ حضرت شیخ شہاب الدین عاشق خدا است و ہو من شیخ امام الدین ابدال و ہو من حضرت شیخ بدر الدین غزنوی و ہو من قطب الاقطاب حضرت خواجہ

قطب الدین بختیار کاکی اوشی قدس اللہ سرہ العزیز رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

ترجمہ: آپ کا شجرہ بیعت و خلافت جو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ تک پہونچتا ہے۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت قلندر شیخ شہاب الدین کے خلیفہ ہیں جو عاشق خدا' کے لقب سے مشہور تھے۔ شیخ شہاب الدین شیخ امام الدین ابدال کے خلیفہ۔ شیخ امام الدین نے شیخ بدر الدین غزنوی سے خرقہ خلافت حاصل کیا اور شیخ بدر الدین حضرت قطب صاحب کے خلیفہ مجاز تھے رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

صاحب شرف المناقب (محمد بن احمد عثمان) غالباً تیرہویں صدی ہجری مصنف ہیں اور سیر الاقطاب اس سے دو سو سال پہلے (در سنہ ہشت و ثلا[illegible] الف) ۱۰۳۸ھ (جہانگیر بادشاہ) کے زمانہ کی تصنیف ہے۔ تعجب ہے صا[illegible] شرف المناقب کے مطالعہ سے نہیں گذری۔باقی رہا حضرت شیخ عبدالحق محد[illegible] دہلویؒ کا ارشاد کہ "نسبت ارادت او بیکے ازیں مشائخ مشہور نیست۔" تو مح[illegible] صاحب نے اس زمانہ کے مشہور مشائخ طریقت سے بیعت کی نفی کی ہے۔ حض[illegible] شیخ شہاب الدین صاحب اس زمانہ کے مشہور مشائخ طریقت میں نہیں تھے۔ اسی وجہ سے حضرت محدث صاحب نے اپنی مشہور تصنیف "اخبار الاخیار" میں کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔

مختصر یہ کہ حضرت قلندر صاحب قاعدے کے مطابق حضرت شیخ ش[illegible] الدین عاشق خدا سے بیعت تھے۔ البتہ فیض روحانی آپ کو سیدنا حضرت علی [illegible] اللہ عنہ سے حاصل ہوا ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب) اس کے علاوہ ایک اور رو[illegible] بھی ہے جس کو اعراسنامہ کے حوالہ سے حضرت مولانا عبدالحی صاحب نے نق[illegible] ہے کہ آپ نے شیخ شمس الدین تبریزی سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ حضرت [illegible] الدین تبریزی۔ حضرت شیخ قطب الدین البری کے خلیفہ تھے اور حضرت شیخ

الدین۔ حضرت شیخ ضیاء الدین ابی النجیب عبدالقاہر سہروردی کے خلیفہ تھے۔اگر یہ روایت صحیح مانی جائے تو اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ سلسلہ چشتیہ میں آپ نے حضرت شیخ شہاب الدین سے نسبت حاصل کی ہو اور سلسلہ سہروردیہ میں حضرت شیخ شمس الدین تبریزی سے۔واللہ اعلم۔

مریدین

اس سلسلہ میں پہلے "حکم نامہ" کا اقتباس پیش کیا جارہا ہے ارشاد ہے۔

"میں مرید بھی کیا کرتا تھا اس درویش کے کچھ مرید سلاطین اور خوانین تھے جیسے سلطان جلال الدین' سلطان علاؤالدین' خضر خاں' آصف خاں' اور سیف خاں۔

اس کے بعد "حکم نامہ" کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے۔

"جو شخص اس درویش (قلندر صاحب) کے پاس آتا تھا اپنی مراد میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ چنانچہ میرے کچھ مرید ایسے ہوئے ہیں جو گرم تنور میں نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ کچھ مرید ایسے تھے جو آب رواں پر مصلیٰ بچھالیا کرتے تھے اور وہ مصلیٰ تر نہیں ہوتا تھا۔"

اس کے بعد قلندر صاحب کا ارشاد حکم نامہ میں نقل کیا گیا ہے کہ پانچ چھ تاجدار بادشاہ اس درویش کے آستانہ پر حاضر ہو کر آستانہ بوسی کیا کرتے تھے۔

آستانۂ قلندری پر بادشاہوں کی حاضری مسلم ہے۔باقی جہاں تک تنور میں نماز پڑھنے اور آب رواں پر مصلیٰ بچھانے کا تعلق ہے تو اگرچہ ہمارا عقیدہ ہے۔کہ "کرامات الاولیاء حق" مگر یہ بھی نظر انداز نہ ہونا چاہیے۔کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان جیسے دوسرے اکابر' اس طرح کی کرامتوں کو "مقبولیت" اور "تقرب الی اللہ" کا مدار قرار نہیں دیتے۔بلکہ ان حضرات کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کی کرامتیں بسا اوقات تقرب کے بجائے بعد کا سبب بن جاتی ہیں۔ کیونکہ اگر کسی شخص

کو اس طرح کی کرامتوں پر ناز ہو گیا- تو یہ فخر و ناز خدا بینی کے بجائے خود بینی کے دام میں الجھا دیتا ہے-

حضرات علماء کرام کے عقیدہ کے مطابق قرب اور مقبولیت عنداللہ کا مدار اتباع سنت ہے- کیونکہ ظاہر ہے آنحضرت ﷺ جملہ مقربین کے سر تاج ہیں- آپ کے اخلاق کی تعریف خود قرآن پاک میں موجود ہے- اور آپ کے کردار اور اسوہ کو نشان مقبولیت بتایا گیا ہے- لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ نیز ارشاد ہے- قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی- اس کے علاوہ حضرت شیخ عبدالحق صاحبؒ کی یہ تحقیق بھی فراموش نہ ہونی چاہیے کہ "حکم نامہ از مخترعات عوام ست بہر حال قلندر صاحب کے متعلق "حکم نامہ" کی شہادت یہ ہے کہ وہ مرید بھی کیا کرتے تھے- بظاہر "قیام دہلی" کے زمانہ میں یہ سلسلہ جاری رہا- یہاں تک کہ جب ہاتف جذب نے صحرا نوردی کی دعوت دی اور آپ نے وزیر آباد کے قریب دریائے جمن کے کنارے رات گزار کر صبح کو "سفینہ علم" اور "اوراق دانش" کو غرقاب کیا- پھر آپ حدود پانی پت میں داخل ہوئے تو اس وقت بھی ڈیڑھ ہزار نفوس آپ کے ساتھ تھے- جن کو آپ نے مفارقت کی تلخی چکھائی-

"ترک فتوے و کتاب گرفتم و مشغول بزہد و طاعت شدم چہار دہم ماہ محرم بود کہ در حد پانی پت در آمدم- پانصد و ہزار نفر ہمراہ بودند گذرانیدم بعد ازاں در خط پانی پت نزول خود کردم- (حکم نامہ)

ترجمہ: فتویٰ لکھنا بھی چھوڑ دیا اور کتابوں کا مطالعہ بھی ترک کر دیا اور زہد و طاعت میں مشغول ہو گیا- محرم کی چودھویں کو پانی پت میں داخل ہوا- ڈیڑھ ہزار آدمی ساتھ تھے- سب کو رخصت کر دیا- اس کے بعد پانی پت کے علاقہ میں فروکش ہو گیا-

اب نہ پیری ہے نہ مریدی- جو کچھ ہے قلندری ہی قلندری ہے جس تفصیل (آگے آئے گی انشاء اللہ) مختصر یہ کہ-

عشق اول، عشق آخر، عشق کل
عشق شاخ و عشق نخل و عشق گل

استغناء اور بے نیازی

بے نیازی یہی نہیں ہے کہ کتابوں کو دریا برد کر دیا- بلکہ اس سے پہلے ہزار دینار از خزانہ بیت المال کشیدہ در راہ خدا تعالیٰ صدقہ دادم- (حکم نامہ)

پھر اس کے بعد:

پنج شش بادشاہان و تاجداران در آستانہ ایں درویش آمدہ آستاں بوسی می کردند- از کسے دانگے درمے قبول نمی کردم کہ مرا خزانہ الٰہی موجود بود- ہر کہ مے خواستم میدادم و نصیب خود مے بردند وایں خزانہ برابر خود میداشتم-

ترجمہ: پانچ چھ بادشاہ اور تاجدار اس فقیر کی چوکھٹ پر حاضر ہو کر آستانہ بوسی کرتے تھے- میں کسی سے کبھی ایک حبہ یا ایک درہم بھی منظور نہیں کرتا تھا- کہ میرے لیے اللہ تعالیٰ کا خزانہ کافی ہے- جس کو جو چاہتا تھا دے دیتا تھا- ہر شخص اپنا حصہ مجھ سے لے جاتا تھا- میرا خزانہ جوں کا توں باقی رہتا تھا-"

یہ خزانہ کیسا تھا؟ خزانہ تھا یا قلندرانہ تصور تھا- ہم تو سمجھتے ہیں سب سے بڑا خزانہ وہ ضمیر منیر تھا جو ہر ایک خزانہ سے مستغنی ہو چکا تھا- سرور کائنات فخر موجودات کا ارشاد ہے ﷺ-

خیرالغناضنا القلب (سب سے بہتر دولت مندی قلب کا استغناء ہے-)

اے کہ پرسی چہ کسانیم و چہ سامان داریم
آنچہ ہیچ نیرزد جہاں آں داریم

ترجمہ: تم پوچھتے ہو ہم کون ہیں؟ کیا سامان رکھتے ہیں- ہم وہ رکھتے ہیں کہ دنیا

کی کوئی چیز اس کی قیمت کو نہیں پہونچتی-

خود قلندر صاحب کے الفاظ میں اس حدیث کی تفسیر ملاحظہ ہو ارشاد ہے-

زہد و تقویٰ چیست اے مرد فقیر!
لاطمع بودن ز سلطان و امیر
گر بدست آید تر گنج نقود
ورنداری ہمت عالی چہ سود

ترجمہ: اے مرد فقیر زہد و تقویٰ کیا ہے؟ زہد و تقویٰ یہ ہے کہ کسی بادشاہ دولت مند سے کوئی توقع نہ رکھنا- اگر بیشمار سکوں کا خزانہ تمہیں مل جائے' اگر تمہاری ہمت بلند نہیں ہے تو یہ دولت مندی بے فائدہ ہے-

تصنیفات

دیوان کا تذکرہ پہلے آچکا- مثنوی بو علی شاہ قلندر ایک مشہور مثنوی ہے- اس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانہ میں لکھی گئی جب بقول قلندر صاحب "ترک فتوے و کتاب گرفتم-"

چنانچہ پہلا شعر ملاحظہ فرمائیے وہ اسی عشق کل کی غمازی کر رہا ہے جس کا قلندری ہے- ارشاد ہے-

مرحبا اے بلبل باغ کہن
از گل رعنا بگو با ما سخن

ترجمہ: اے پرانے باغ کی بلبل خوب آئی- اس گل رعنا کی کچھ باتیں ہم سے کہو

پھر ارشاد ہے:

عشق بازی می کنم با او مدام
یافت آدم از طفیل عشق کام

ترجمہ: میں ہمیشہ اس سے عشق بازی کرتا ہوں- عشق بازی وہ جوہر ہے

اس کی بنیاد پر حضرت آدمؑ مقصد میں کامیاب ہوئے-

(۳) حال ہی میں غزلوں اور مثنویوں کا ایک مجموعہ کتب خانہ یوسف احمد شاہ نے شائع کیا ہے- کلام قلندری اس کا نام ہے- اس میں مثنوی اور دیوان مذکور کے اشعار بھی ہیں اور ان کے علاوہ بھی تقریباً سترہ سو شعر ہیں- کل مجموعہ میں تقریبا چار ہزار شعر ہیں- ملنے کا پتہ: مولانا محمد بشارت علی- روبروئے تل گنبد سلطان شاہی حیدر آباد (دکن)

(۴) حکم نامہ کا نہ صرف تذکرہ بلکہ اس کے اقتباسات بھی آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں- اس کو حکم نامہ شیخ شرف الدین بو علی قلندر کہا جاتا ہے- مگر یہ بھی آپ پڑھ چکے ہیں- کہ حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ دہلوی کی رائے اس کے متعلق یہ ہے کہ:

"از مخترعات عوام است"

البتہ حضرت مولانا دہلویؒ ایک مکتوب کی تصدیق کرتے ہیں کہ:

"اور المکتوب ست بزبان عشق و محبت- مشتمل بر معارف و حقائق توحید و ترک دنیا و طلب آخرت و محبت مولیٰ- جملہ آں بنام اختیار الدین می گویند-"

ترجمہ: آپ کا ایک مکتوب ہے- یہ مکتوب عشق و محبت کی زبان میں لکھا ہے- معارف و حقائق توحید' ترک دنیا' طلب آخرت اور محبت مولیٰ کے مضامین اس میں سمو دیئے گئے ہیں- اختیار الدین صاحب مکتوب الیہ ہیں جن کے نام یہ خط لکھا گیا ہے-"

اللہ دیا صاحب سیر الاقطاب میں فرماتے ہیں:

"یا اشعار آبدار و پر اسرار صاحب دیوان ست و مکتوبات نادر و رنگین وارد-"

بہر حال مکتوبات کا تو پتہ نہیں- البتہ محدث صاحب دہلویؒ نے ایک مکتوب نقل فرمایا ہے- یہ مکتوب خود ایک چھوٹا سا رسالہ ہے- یہاں پورا مکتوب تو نقل

نہیں کیا جاسکتا- البتہ اس کے چند فقروں کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے- تاکہ آپ بھی' کچھ اندازہ کرلیں کہ عشق و محبت کی زبان کیسی ہوتی ہے-

عشق کب پیدا ہو سکتا ہے- عنایت خصوصی متوجہ ہو- جذبہ پیدا ہو اور انانیت ختم ہو جائے- "میں کچھ ہوں" یہ احساس فنا ہو جائے-

اے برادر چوں عنایت درکار تو کنند و جذبہ در تو نہند' وترا از توئی برپایند آنگاہ عشق در تو آید-

مثنوی میں آپ کا ارشاد ہے:

تا توئی کے یار گردد یار تو
چوں نباشی یار باشد یار تو
تو مباش اصلاً کمال این ست و بس
تو در و گم شو وصال این ست و بس

ترجمہ: جب تک تو اپنی توئی اور اپنی شخصیت باقی رکھے ہوئے ہے- یار کب ہو سکتا ہے- جب تم نہ رہو گے تب یار یار ہو سکتا ہے-

تم اپنی ہستی اور اپنی شخصیت کو ختم کردو- قطعاً اپنے اوپر نظر نہ رکھو بس یہ ہے کمال- تم بالکل اپنے آپ کو فنا کردو صرف اسی کا نام کمال ہے تم محبوب میں ہو جاؤ- یہی ہے وصال اور بس-

اور ہاں جب عشق پیدا ہو جائے- جب ہی جلوہ حسن بھی نمودار ہو گا- جب پہچان سکو گے "حسن کیا ہے- تب ہی معشوق کو پہچان سکتے ہو- اور اسی و[قت] معشوق کے صحیح عاشق بن سکتے ہو اور جو امانت عاشق حقیقی نے معشوق کے سپرد ہے- اس پر عمل کرسکتے ہو-

اے برادر! معشوق کو تمہاری ہی صورت میں پیدا کیا ہے- اور تمہارے زمرے میں مبعوث فرمایا ہے تاکہ صراط مستقیم کی

دعوت دے-

"اے برادر! باری عزوجل نے بہشت و دوزخ پیدا کی- اور یہ فیصلہ کردیا کہ دونوں کو پر کروں گا- معشوق کو اس کے عاشقوں سمیت جنت میں پہنچاؤں گا- اور شیطان کو اس کے پیروؤں کے ساتھ دوزخ میں ڈالوں گا-"

اے برادر! بہشت و دوزخ میں عاشق کے سوا کوئی نہیں- بہشت میں بھی عاشق ہی ہے- اور دوزخ میں بھی عاشق ہی ہے- یہ دونوں عاشق کے حسن سے پیدا ہوئی ہیں-

فرق یہ ہے:

بہشت مقام وصال است باد دستاں
(بہشت وصال کی جگہ ہے)
دوزخ مقام فراق است بر دشمناں
(دوزخ دشمنوں کے لیے جاء فراق ہے)

فراق کافروں اور منافقوں کے لیے اور وصال' عاشقان و محبان محمد ﷺ کے لیے-

اس مکتوب گرامی کے بنیادی نکتے یہ ہیں کہ:

(۱) خود حضرت حق جل مجدہ عاشق حقیقی ہیں- چنانچہ ارشاد ہے:

"اے برادر! دل کی آنکھ کھولو اور خوب غور سے دیکھو- عاشق نے اپنے عشق سے تمہارے لیے کیسی کیسی چیزیں پیدا کیں اور کیسے کیسے حسین مناظر سے تمہاری نگاہوں کو تازگی اور دلوں کو فرحت بخشی- اپنے حسن کا پرتو ہر درخت پر ڈالا' طرح طرح کے میوے پیدا کیے- ہر میوے کا الگ مزا رکھا- اس درخت کو نہ اپنی خبر نہ اپنے پتوں کی خبر نہ اپنے پھل کی خبر- نیشکر کی رگ رگ میں تمہارے لیے شکر بھر دی- آہوئے ختن کے نافہ کو

مشک سے بھر پور کر دیا- نیشکر کو خود اپنی شکر کی خبر نہیں' اسی
طرح ہرن خود اپنے نافہ اور مشک سے ناواقف ہے- یہ سب
اس کے عشق و محبت کی کرم فرمائی ہے-

(۲) معشوق حقیقی محبوب رب العالمین خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں ﷺ جیسا
کہ ارشاد ہے :

اے برادر! معشوق راہمہ بصورت تو آفریدہ اندر میان شما
فرستادہ اند' تا دعوت کند براہ راست-

ترجمہ : اے برادر! معشوق (حقیقی) کو تیری ہی صورت میں
(انسانی صورت میں) پیدا کیا- تمہارے درمیان میں بھیجا تاکہ
سیدھے راستہ کی دعوت دے-

(۳) انسان کو حکم ہے کہ جہاں تک اس کا اختیار اور اس کی قدرت ہے- ا
تعالیٰ کی صفات اور اس کی خصلتیں اختیار کرے- وہ عاشق ہے تو انسان کو بھی عا
ہونا چاہیے اور جس طرح ہر مخلوق عشق خالق کا آئینہ ہے- اسی طرح ہر مخلوق انسا
کی بھی معشوق ہو- چنانچہ ارشاد ہے :

اے برادر عاشق شو' ہر دو عالم راحسن معشوق داں و خود
راحسن معشوق خواں- عاشق از خود ملک وجود تو ساخت تا
جمال حسن در آئینہ بہ بیند و ترا محرم اسرار بداند- "الانسان
سری" در شان تو آمد- عاشق شو حسن را دائم ببیں وبشناس دنیا
راو عقبیٰ راو بداں کہ عقبیٰ ملک محمد ﷺ است و دنیا ملک
شیطان ہر دو رادر یاب کہ برائے چہ آفریدہ اند وچہ خواہند
کرد- (اخبار الاخیار ص ۳۰)

ترجمہ : اے بھائی عاشق ہو جا- دونوں جہانوں کو معشوق کا
حسن سمجھو' خود کو بھی معشوق کا حسن سمجھو- عاشق نے خود
خود تمہارے وجود کی مملکت کو پیدا کیا- تاکہ تیرے آئینہ میں

اپنے حسن کا جمال دیکھے اور تجھے محرم اسرار قرار دے-
"انسان میرا ایک راز ہے-" تیری شان میں فرمایا- بس
عاشق بن جاؤ- حسن کو دائمی اور ابدی سمجھو- دنیا اور آخرت کا
فرق سمجھو اور یہ بھی باور رکھو کہ "آخرت" حضرت محمد ﷺ
کی مملکت ہے اور "دنیا" شیطان کی مملکت ہے- دونوں پر غور
کرو- ان کو سمجھو- اور یہ بھی غور کرو کہ کس مقصد کے لیے
پیدا کیا ہے- اور وہ کیا چاہتے ہیں-

شریعت : یعنی قرآن و حدیث کی زبان میں اس مضمون کی تعبیر یہ ہے- اللہ
تعالیٰ ارحم الراحمین ہے- پوری کائنات میں مرکز رحمت محمد ﷺ ہیں- جن کے
متعلق ارشاد ہے- وما ارسلناك الا رحمة للعالمين - اس کائنات کے
ذرہ ذرہ میں جو حسن و خوبی ہے وہ تقاضاء رحمت ہے- خود اس کائنات کا وجود
پر تو رحمت ہے-

پس یہ بھی درست ہے کہ اگر رحمۃ للعالمین ﷺ کو پیدا نہ کیا ہوتا تو کائنات
کا وجود ہی نہ ہوتا- لولاك لما خلقت الا فلاك- اور یہ بھی درست ہے کہ
ساری مخلوق اپنے رب اور خالق سے وہی تعلق رکھتی ہے جو عیال کو اپنے سرپرست
اور مربی سے ہوتا ہے- اس بنا پر انسان خصوصاً وہ انسان جو رحمت للعالمین ﷺ کا
دامن تھامے ہوئے ہے- اس کی فطرت کا تقاضا ہونا چاہیے کہ وہ سراسر رحمت ہو-
ہر انسان کے لیے پیکر رحمت ہو- ہر مخلوق کے لیے مجسمہ رحمت ہو- فاحبهم
الى الله احسنهم الى خلقه- (او کما قال ﷺ)

اصحاب تصنیف اور ارباب درس کی توجہ منطق اور فلسفہ کی طرف رہی ہے-
ان کی تصنیفی صلاحیتیں زیادہ تر اسی میدان میں صرف ہوئی ہیں- چنانچہ ایک ورقہ
رسالہ "شمشیر" کی شروحات سینکڑوں صفحات میں لکھ دی گئیں- اگر عشق و محبت
کے اس آشفتہ کی طرف بھی ارباب تصنیف توجہ کرتے تو حضرت قلندر صاحب
کے اس مکتوب کی شرح سینکڑوں صفحات میں لکھی جا سکتی تھی- مگر جہاں کا پورب

اور پچھم ہی پلٹا ہوا ہو' جہاں کی دنیا نرالی ہو' جہاں ترک و فنا کو سب سے پہلی منزل قرار دیا جاتا ہو-

ترک جان و ترک مال و ترک سر
در طریق عشق اول منزل است

جہاں قاتل کو بد دعاؤں کی جائے دعائیں دی جاتی ہوں--

آں کشتہ ہیچ حق محبت ادا نہ کرد
کز بہر دست و باز و قاتل دعا نہ کرد

ایسے مقام پر قلم دوات لے کر کوئی کیا بیٹھے گا- اور کہاں سے کاغذ لائے گا کہ کتاب عشق کی تفسیر لکھے-

در رہ منزل جاناں کہ خطر ہاست جان
شرط اول قدم آن ست کہ مجنوں باشی

بہر حال اس کو آپ مکتوب کہئے یا مقالہ یا دو ورقہ کتابچہ- اس کی آخری سطریں یہ ہیں- کیا ہی اچھا ہو کہ ان سے سبق لینے کی توفیق ہو- اور کاش قلندر صاحب کے نام پر جان دینے والے جذبہ قلندری کو پہچاننے اور اس کے لیے قربان ہونے کی بھی تمنا کریں- خاتمہ مکتوب یہ ہے-

"اے برادر ہیچ نمی دانم کہ چہ می گویم واز من چہ می آید و چہ می گویاند- زبان در قبضہ قدرت خداست- اگر عنایت در کار تو می شود از تو آں چیزی گویاند- کہ پسندیدہ ہر دو جہانش سازد- اے برادر ایں قدر معلوم ست کہ خواست خود پیدا کرد و خواست خود می دارد ویفعل الله مایشا ویحکم ما یرید- انچہ خواست کرد- وانچہ خواہد می کند- کسے را در خواست او رکارے نیست- (اخبار الاخیار)

ترجمہ: اے برادر کچھ خبر نہیں' کیا کہہ رہا ہوں- "میں" کیا ہوں- مجھ سے کیا بن سکتا ہے- اور میری کیا حقیقت کہ کچھ کہہ

سکوں- زبان اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے- اگر عنایت خداوندی شامل حال ہو تو تم سے ایسی بات کہلوا دے جو دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں پسندیدہ ہو- اے برادر اتنی بات معلوم ہے کہ خود اس نے چاہا تو پیدا کر دیا- خود وہ چاہ رہا ہے تو باقی رکھے ہوئے ہے- اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے- اور جس بات کا چاہے فیصلہ کر دیتا ہے- جو اس نے چاہا کر دیا- جو چاہے گا کر دے گا- اس کی خواست' اس کی چاہ' اس کے ارادہ و منشاء میں کسی کو دخل نہیں ہے-

ایک بنیادی فرق

یہ باتیں ہم بھی کہتے ہیں' کہہ سکتے ہیں- اس سے زیادہ زور دار الفاظ میں کہہ سکتے ہیں- مگر فرق یہ ہے کہ ہمارا قول محض قول ہوتا ہے جو زبان اور حلق کا عمل ہوتا ہے- دل کی آواز نہیں ہوتی- زبان پر عشق و محبت کے الفاظ اور دل ناآشنا عشق' ہمدردی خلق خدا کے نعروں سے حلق مجروح' مگر قلب درد سے بے بہرہ-

اور جو سچا عاشق ہوتا ہے- اس کا قول صرف قول نہیں ہوتا' بلکہ حال ہوتا ہے- ایسا حال جس میں وہ خود گم رہتا ہے- اس کا نعرہ قلب مجروح کی ٹیس ہوتا ہے- دل کی صدا بلکہ دل نالاں کا گریہ ہوتا ہے-

غور کرو' رحمتہ اللعالمین ﷺ کے دامن سے وابستہ ہونے والا جب سراسر رحمت یا قلندرانہ الفاظ میں) سراسر عشق ہو جائے تو خدا کی کسی بھی مخلوق سے اس کو نفرت کیسے ہو سکتی ہے- اس کے یہاں تو محبت ہی محبت ہو گی- دیر و حرم کا فرق اپنی جگہ- مگر جس کے یہاں نفرت کی جنس ہی ختم ہو گئی ہو وہ نفرت کہاں سے لائے- ہم محبت سے تہی دامن ہیں تو ہمارے یہاں محبت کا نام نہیں- عاشقان مصطفیٰ اور محبان خدا' نفرت سے تہی دامن ہیں تو ان کے یہاں نفرت کا نام نہیں ہوتا-

کفر ست اور شریعت ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

ترجمہ: ہماری شریعت میں کسی سے کینہ رکھنا کفر ہے- ہمارا
آئین ہے، سینہ کو آئینہ کی طرح صاف رکھنا-

قلندروں کی زبان میں یہ مفہوم اس طرح ادا کیا جاتا ہے:

عاشق از ایمان خرابست و ہمہ از کفر

پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

ترجمہ: عاشق کا ایمان بھی خراب اور کفر بھی خراب، عاشق
پروانہ ہوتا ہے اور پروانہ مسجد اور مندر کی شمع میں فرق کرنا
نہیں جانتا-

جب ان کو کسی سے نفرت نہیں، تو ان سے کسی کو نفرت کیوں ہو- کہا جاتا ہے کہ انسان تو انسان وحشی جانوروں کو بھی حضرت قلندر صاحب سے انسیت تھی- ہرن اور چتیل جو انسان کے سایہ سے بھی بھاگتے ہیں حضرت قلندر صاحب کے آس پاس اس طرح پھرتے تھے جیسے گھر کے پالتو جانور، اور جس طرح دہلی کے بادشاہ آپ کے آستانے پر حاضر ہوتے تھے جنگل کے بادشاہ (شیران شکاری) بھی آپ کی قدم بوسی کیا کرتے تھے- اس پر ایک افسانہ بھی بنا لیا گیا-

افسانہ یہ ہے کہ ایک روز حضرت قلندر صاحب شمال کے پہاڑ پر تشریف لے گئے- وہاں ایک جوگی صاحب تھے- جوگی نے قلندر صاحب کو دیکھا تو حیرت سے کہا- آپ یہاں کیسے؟ یہ جگہ تو شیروں اور درندہ جانوروں کی ہے- یہاں کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا- قلندر صاحب نے جوگی سے کہا- آپ یہاں کیسے زندہ سلامت ہیں- جوگی نے جواب دیا- مجھے تو اڑنے کی طاقت حاصل ہے- جیسے ہی کوئی شیر اس طرف آتا ہے میں اڑ کر آسمان پر پہونچ جاتا ہوں یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک شیر ببر آپہونچا- جوگی صاحب فوراً آسمان کی طرف پرواز کر گئے- حضرت قلندر صاحب وہیں تشریف فرما رہے- مگر شیر قلندر صاحب پر حملہ تو کیا کرتا سر جھکا کر خاموش بیٹھ گیا- یہ تو قلندر صاحب کی صورت ہوئی- ادھر جوگی صاحب کی حالت یہ تھی کہ وہ اڑ کر آسمان پر تو پہونچ گئے- مگر جہاں جاتے اپنے ساتھ ساتھ

قلندر کو بھی دیکھتے کہ قلندر صاحب اور شیروں کا غول ان کے ہمراہ ہے- انتہا یہ کہ جوگی صاحب تھک کر اپنی جگہ واپس ہوئے تو دیکھا قلندر صاحب اطمینان سے ایک چٹان پر بیٹھے ہیں- اور شیر ان کے سامنے اس طرح بیٹھا ہے کہ جیسے یہ مرید یا شاگرد رشید ہو- قلندر صاحب نے جوگی کو دیکھا تو مسکرا کر فرمایا- سادھو صاحب یہ عجیب مہمان داری ہے خود آسمان پر اڑ گئے اور اپنے مہمانوں کو شیروں کے حوالے کر گئے- بہر حال قلندر صاحب کی اس عجیب و غریب کرامت نے جوگی کو یہاں تک متاثر کیا کہ وہ قلندر صاحب کے قدموں پر گر گیا کہ آپ ایسے خدا رسیدہ اور پہونچے ہوئے بزرگ ہیں کہ میرے لیے آپ کی کفش برداری اور خدمت گزاری کے سوا کوئی چارہ نہیں- چنانچہ وہ آپ کا حلقہ بگوش ہو گیا- صاحب شرف المناقب نے اس قصہ کو نقل کر کے تحریر فرمایا ہے- اس پہاڑ میں حضرت قلندر صاحب کے بیٹھنے کی جگہ اور اس جوگی کی قبر آج تک موجود ہے اور زیارت گاہ خلائق ہے-

بہر حال یہ کوہ شمال کون سا پہاڑ ہے اور وہاں یہ قبر ہے یا نہیں- اس کی حقیقت تک تو ہم جیسے کوتاہ بینوں کی نظر تفتیش نہیں پہونچ سکتی- مگر جس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا وہ یہ ہے کہ محبت کے ان دیوتاؤں کی نظر محبت کا یہ اثر تھا کہ ہر چیز ان سے محبت کرنے لگتی تھی- زبان شریعت میں اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا ہے- من کان للہ کان اللہ لہ- جو اللہ کا ہو جاتا ہے- اللہ اس کا ہو جاتا ہے-

قلندری اور شان قلندری

عشق و محبت اور جذب و فنا کی بات یہاں تک پہنچی تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قلندری کے متعلق بھی کچھ باتیں یہیں کہہ دی جائیں-

قلندر کون ہوتے ہیں؟ کیسے ہوتے ہیں؟ قلندری کیا ہے؟ یہ تمام باتیں تفصیل طلب ہیں- مگر تفصیل کون کرے-؟

قلندری کی حقیقت وہی بیان کر سکتا ہے جو خود قلندر ہو یا مقام قلندری کا تجربہ کر کے آگے بڑھ چکا ہو- "قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری-"

مگر عجب تماشا یہ ہے کہ جو اس مرتبہ کے جاننے والے ہیں وہ زبانوں پر تالے ڈال لیتے ہیں "آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد" (یعنی جس کو کچھ پتہ چل گیا، لاپتہ ہو گیا- کسی کو اس کا پتہ ہی نہیں چلا-)

اسے خود غرضی کہئے یا بے غرضی، کہ جو پہونچ جاتا ہے- وہ زبان سے تو کہ بتاتا- پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا- یا اسے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ پلٹ کر دیکھ سکے-

حضرت قلندر صاحب کے معاصر اور ہمنام یعنی شیخ شرف الدین مصلح عرف سعدی شیرازی (متوفی ۶۹۱ھ) ان کی طرف سے یہ معذرت پیش فرماتے ہیں-

عاشقاں کشتگان معشوقند

بر نیاید ز کشتگان آواز

ترجمہ: عاشق معشوق کے کشتہ اور قتل کیے ہوئے ہوتے ہیں-
کشتہ اور مقتول کی آواز نہیں آیا کرتی-

اور اس کا فلسفہ یہ بیان فرماتے ہیں-

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز

کاں سوختہ جاں را جاں شد و آواز نیامد

ترجمہ: اے مرغ سحر تو چہک کر یا چیخ کر عشق کا اظہار کرتا ہے یہ کمال کی بات نہیں، تجھے چاہیے کہ پروانہ سے عشق کرنا سیکھے- دیکھو- سوختہ جان پروانہ کی جان جل جاتی ہے مگر آواز نہیں نکلتی-

اور اس سے بھی زیادہ پر لطف بات یہ کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے یا کہتا ہے اس کے متعلق فتویٰ یہ ہوتا ہے-

ایں مدعیاں در طلبش بے خبر انند

ترجمہ: یہ ڈینگیں مارنے والے بے خبر ہیں-

اب ہم کچھ کہنا بھی چاہیں تو جب باخبروں کا فتویٰ یہ ہو کہ یہ بے خبر ہے تو ہمارے کہنے کا اعتبار کیا- اور ایسی بے سندبات پر کون بھروسہ کر سکتا ہے- بہر حال حقیقت کی نقاب کشائی تو ناممکن ہے- البتہ کچھ پتے کی باتیں کہی جا سکتی ہیں- خدا کرے وہ صحیح ہوں- اور انشاء اللہ صحیح ہوں گی- کیونکہ قلندروں نے اگرچہ کچھ نہیں بتایا مگر اس نے سب کچھ بتا دیا ہے جس کے نام پر قلندر صاحبان قلندری کرتے ہیں- اسی کی بتائی ہوئی باتوں میں سے کچھ باتیں یہاں لکھی جا رہی ہیں-

لفظ قلندر کے معنی

مگر اس سے پہلے یہ معذرت بھی ضروری ہے کہ اہل لغت نے اسم "قلندر" پر بڑا ظلم کیا ہے، انتہا یہ کہ صاحب غیاث اللغات نے تو یہ لکھ دیا کہ قلندر "کندہ ناتراش" کو کہتے ہیں- فرماتے ہیں- "بعض گویند اصل کلندر بود، کندہ و ناتراشیدہ وبعضے اصلش غلندر گفتہ-

اسی طرح مدعیان تصوف اور بقول حضرت شیخ سعدیؒ "مدعیان بے خبر" نے قلندر کی ایسی تصویر بنائی جو بھیانک ہی نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک گھناؤنی بھی ہے- جس میں نہ تہذیب و سلیقہ ہے- نہ شرم و حیا- گویا رند مشرب و بازمست (معاذ اللہ)

مگر واقعہ یہ ہے کہ قلندری تہذیب و شائستگی، علم و معرفت، بلکہ توحید و تفرید کی وہ آخری حد ہے جہاں انسان خود محو ہو جاتا ہے- سمندر کی موجیں اس کو باہر نہیں پھینکتیں- بلکہ خود اپنے اندر گم کر لیتی ہیں-

نہ گل شناسد و نے رنگ و بو نہ عارض و زلف

دلے کسے کہ بحسن او گرفتار ست

اب آیئے- اپنی زبان میں کسی قدر تفصیل سے اس کی تفسیر ملاحظہ فرمایئے-

توحید کے معنی عام طور پر یہی کیے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خالق ذوالجلال کو بلا شرکت غیرے "واحد" ماننا بیشک توحید کے یہی معنی ہیں- مگر یہ لغت عربی یا عام اصطلاح کے لحاظ سے ہیں- اہل معرفت اس کو "عوام کی توحید" کہتے ہیں-

خواص کی توحید صرف "مان لینے" پر ختم نہیں ہو جاتی - بلکہ اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ "مان لینے" کے تقاضوں کو پورا کیا جائے -

یعنی جب یہ مان لیا کہ "اللہ تعالیٰ ایک" ہے وہی سب کا رازق و خالق ہے' وہی نفع نقصان پہونچانے والا ہے' وہی مشکلات کو حل کرتا ہے - وہی بیماروں کو شفا بخشتا ہے' وہی بے چاروں کا چارۂ کار ہے اور وہی ناکاروں کا کارساز ہے - وہی قادر مطلق ہے اور جو کچھ ہے اسی کے حکم اور اس کے علم و ارادہ سے ہے - تو اب لازم ہے کہ تمام امیدوں اور آرزوں کا تعلق اسی سے ہو - بیم و رجاء جو کچھ ہو اسی سے ہو' نہ کبھی کوئی طمع قدم میں لغزش پیدا کرے - اور نہ کسی کا خوف و ہراس' اس کے قلب پر سکون کو مضطرب اور بے چین بنائے - مختصر یہ کہ جہاں تک کسی بھی نفع یا نقصان کا تعلق ہے - تقاضاء توحید یہ ہے کہ اس کو صرف ذات حق "جل مجدہ" سے وابستہ کرے - نہ کسی غیر سے توقع سود رکھے نہ خوف زیاں -

لیکن عشاق کی توحید اس سے بھی آگے ہے وہ سود و زیاں کی اضافتوں اور نفع و نقصان کی نسبتوں تک محدود نہیں ہوتی - اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ صرف ان افعال و صفات کا مرکز ایک "ذات حق" کو مان لیں - بلکہ وہ خود عاشق بیچارہ سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی انانیت' اپنی شخصیت اور اپنی ہستی کو قربان گاہ عشق پر قربان کر دے -

سرمد گلہ اختصار می باید کرد
یک کار ازیں دو کار باید کرد
یا سر برضاء دوست می باید داد
یا قطع نظر از یار می باید کرد

یہاں صرف اپنا تمنا اور آرزو ہی قربان نہیں کی جاتی - صرف یہی مطالبہ نہیں ہوتا - کہ عاشق مرضی محبوب کو اپنی "رضا" بنا لے - بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ عاشق

اپنی "انانیت" ختم کردے - اپنی ہستی کا تصور یک قلم محو کردے -

تو مباش اصلا کمال انیست و بس
تو درو گم شو وصال انیست و بس

(قلندر صاحب)

اگر عاشق کے دل و دماغ میں "میں" کا تصور باقی ہے تو وہ عاشق صادق نہیں - فریب خوردہ عشق ہے -

چو نمانی باخدا یابی وصال
خویش را گم ساز اے صاحب جمال
تا توئی کے یار گردد یار تو
چون نباشی' یار گردد' یار تو

(قلندر صاحب)

عاشق اور "میں" دو متضاد چیزیں ہیں - جب تک میں یا انا "باقی" ہے - شرک موجود ہے - تقاضا توحید یہ ہے کہ "میں" اور "انا" کا تصور بھی ختم ہو - جہاں تک ہست کا تعلق ہے صرف ایک سے ہے - اور وہ' وہ ہے جو فی الواقع ہست ہے - جو واحد حقیقی ہے - جو "احد" ہے - جو "صمد" جو "لم یلد و لم یولد" ہے - جب سب کچھ وہی ہے - تو "انا" یا "میں" کے کیا معنی - اب اگر کوئی لفظ با معنی ہے تو صرف ایک لفظ ہے - یعنی "ہمہ اوست" -

حضرت قلندر صاحب فرماتے ہیں :

ہر کہ شد در بحر عرفان آشنا
ذرہ ذرہ قطرہ داند از خدا
آب دریا چوں زند موج دگر
در حقیقت آب باشد جلوہ گر

نفس آب و چوں حباب ست جسم تو
آب چوں گردی نماند جسم تو
چوں الف در لام می گردد نہاں
خویش را گم سداز تا گردد عیاں
گشت واصل چوں بدریا آب جو
آب جو را باز از دریا مجو
تاتوئی کے یار گردد یار تو
چوں بناشی یار باشد یار تو
مولوی فرمود در نظم ایں بیاں
بر تو گردد روشن اسرار نہاں
تو مباش اصلا کمال این ست و بس
تو درد گم شو وصال این ست و بس
یار را می بیں تو در ہر آئینہ
سوز و ساز اوست وز بر طنطنہ
ہر چہ بینی درحقیقت جملہ اوست
شمع و گل پروانہ بلبل ہم از وست

آپ نے استغراق، محویت، سکر پیہم جیسے الفاظ صوفیا کی کتابوں میں پڑھے ہوں گے۔ اُردو کے ایک شاعر نے اس کی تصویر اس طرح کھینچی ہے۔

ترا خیال ہے ترا جمال ہے تو ہے!
مجھے یہ فرصت کہاں کہ ہوں کیا میں؟

یہ گویا قلندری کی تفسیر ہے۔ مگر کچھ ظرف کا بھی فرق ہوتا ہے۔ وہی ۱۱

مجذوب اور سالک، قلندر اور "عارف" میں امتیاز پیدا کر دیتا ہے۔

قلندر اور سالک میں فرق

بیشک "انانیت" ایک سالک اور شیخ طریقت کی بھی فنا ہوتی ہے۔ سالکین کے سر تاج انبیاء علیہم السلام ہیں۔ ان کے اندر انانیت کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ غور فرمایئے۔ ایک طرف عرش معلیٰ سے روح الامین "چلہ گاہ حرا" میں جلوہ افروز ہو کر رب العرش کا آخری اور مکمل ترین پیغام پہونچا رہے ہیں۔ "اقرا باسم ربک الذی خلق" اور دوسری طرف انانیت "زعم من" اور تصور "میں" کے فنا اور ختم ہو جانے کی یہ شان ہے کہ اس رسول امین ﷺ کا قلب مبارک لرز رہا ہے اور نہ صرف قلب لرز رہا ہے بلکہ دل کی دھڑکن سے پورا بدن لرز رہا ہے کہ یہ بار امانت کس طرح برداشت ہو سکے گا۔ یعنی قلندروں کی زبان میں گویا قلب محمد ﷺ "انا" اور "میں" کو تلاش کر رہا ہے کہ وہ ہے کہاں۔ وہ تو ہیچ در ہیچ" ہے۔ تو فناء محض ہے۔ وہ بار بردار کیسے ہو سکتا ہے۔

ایک طرف رب السموات والارض کی جانب سے یہ ناز برداری اور یہ لطف و عنایت کہ عرش و کرسی کی سیر کرائی جا رہی ہے۔ اور ان مقامات پر پہونچایا جا رہا ہے کہ اسرار ملکوتی کا سب سے بڑا امانت دار "جبرئیل امین" بھی کہہ رہا ہے۔

اگر یک سر موے بالا پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

اور دوسری جانب "زعم انا" کے فنا کا یہ عالم ہے کہ امت کے کمزوروں اور گنہگاروں سے بھی فرمائش کی جاتی ہے کہ ہر ایک اذان کے بعد دعا کرو۔ وابعثہ مقاما محمودا۔ خداوندا ہمارے رسول محمد ﷺ کو مقام محمود پر فائز فرما۔ قول شخصے:

در ہر پیرزن می زد پیمبر
کہ اے زن درد عایم یاد آور

ترجمہ: ہر بڑھیا کے دروازے پر حضرت محمد ﷺ دستک دے
کر فرمایا کرتے تھے کہ بڑی بی مجھے دعا میں یاد رکھنا۔

سیرت مبارکہ میں اس طرح کی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ جن کی شہادت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی "انانیت" نہ صرف فنا ہوتی ہے بلکہ اس فنا میں ان کا مرتبہ اتنا ہی بلند ہوتا ہے جتنا منصب نبوت کا۔ لیکن اس فنا کے ساتھ ان میں بقا کی بھی ایک شان ہوتی ہے۔ مگر یہ بقا اپنے لیے نہیں بلکہ رضاء مولیٰ کے لیے یعنی جہاں تک خود ان کی اپنی رضاء اپنی خواہش اور اپنی چاہ کا تعلق ہے وہ قطعاً فنا ہوتی ہے۔ خود قرآن حکیم کی شہادت ہے۔ وما ینطق عن الھویٰ۔ (ان کی کوئی بات خود ان کی چاہ پر نہیں ہوتی) لیکن اس فنا میں یہ بد مستی نہیں ہوتی کہ رضاء محبوب کی بھی خبر نہ رہے۔ اور اس طرح سرگشتہ و حیران ہو جائے کہ بقول نواب ملتفت خاں۔

خواب دیدہ ام آں طرہ پریشاں را
تمام عمر دگر خواب من پریشان ست

بلکہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے متبع سالکین کرام جس طرح خود اپنی رضا اپنی چاہ اور پسند سے فانی ہوتے ہیں وہ اتنے ہی رضا مولیٰ سے باخبر اور اس کی تکمیل کے لیے کمربستہ اور سربکف رہتے ہیں۔ یعنی فناء اپنی ذات اور ہستی سے اور بقا "رضاء حق اور منشاء ربانی" کے لیے یہ حضرات مرضی مولیٰ کے لیے ایسے چست اور اس طرح باخبر رہتے ہیں کہ یہ تصور بھی مشکل ہوتا ہے کہ ان کے اندر جذب و فنا بھی کارفرما ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ خیال بھی ہونے لگتا ہے کہ جذب و فنا در کنار انہیں عشق و محبت سے بھی سروکار نہیں ہے۔

یہ شان بلند ترین شان ہے جو انبیاء علیہم السلام کی شان ہوتی ہے۔ اور ان کے طفیل میں امت کے ان خوش نصیبوں کو یہ درجہ عطا ہوتا ہے۔ جن کو سالک کہا جاتا ہے ان کی تلقین اور نصیحت یہ ہوتی ہے۔

از دروں شو آشنا وز بروں بیگانہ وش
ایں چنیں زیبا روش کمتر بود اندر جہاں

اس کیفیت کی مختصر تعبیر یہ ہے۔ "دست بکار دل بیار"

قلندری اور پابندی شریعت

سمجھا یہ جاتا ہے کہ قلندر اور مجذوب کو شریعت سے تعلق نہیں رہتا۔ مگر کیوں؟ عام خیال یہ ہے کہ اس درجہ پر پہونچ جاتے ہیں۔ تو خود صاحب شریعت یعنی اللہ رب العزت ان سے کہہ دیتا ہے کہ رکوع و سجود تو ظاہری باتیں ہیں۔ اب جب یہ بات ہوگئی ہے کہ "من تو شدم تو من شدی" تو اب رکوع و سجدہ کیسا؟ کس کے لیے اور کس جانب کو؟ چنانچہ یہی حکم نامہ جس کے اقتباسات بار بار پیش کیے جا چکے ہیں۔ اسی مکالمہ میں خود حضرت قلندر صاحب کی طرف منسوب کر کے تحریر کیا گیا ہے۔ لفظی ترجمہ ملاحظہ ہو۔)

"مفتی اور حاکم اور سات درویشوں نے جو حافظ تھے۔ اس درویش سے (قلندر صاحب سے) ملاقات کی۔ محرم کی بیسویں تھی، صبح کا وقت، جمعہ کا دن، ان حضرات نے تکبیر کہتے ہوئے نماز کی اذان دی اور نمازیں شروع کر دیں۔ مولانا سراج الدین رکوعی نے اس درویش سے (قلندر صاحب سے) فرمایا صبح صادق ہوگئی۔ سنتوں کا وقت ہے۔ میں نے کہا آپ لوگ تکبیر پڑھیں تاکہ میں فرض ادا کر لوں۔ جب جماعت ہو چکی لوگ فرض صبح سے فارغ ہو چکے تو یہ سب علماء و فضلاء اور درویش جو نماز میں شریک تھے۔ اس درویش کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور سب نے مل کر مجھ سے فرمایا۔ مخدوم محترم! ہمیں آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔ جناب والا نے صبح کی سنتیں کیوں نہیں پڑھیں؟ میں نے عرض کیا۔

خواجہ کائنات' سرور موجودات' رحمت عالمیاں' صفوت
آدمیاں' وتتمہ درزماں-احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کا فرمان اس
درویش کے متعلق یہ ہے کہ :

"اے شرف ہم نے اپنی سنتیں تم کو بخش دیں-"

قلندر صاحبؒ فرماتے ہیں "اس کے بعد چالیس سال تک میں
صرف فرض نماز پڑھتا رہا کہ حضرت ذوالجلال کا فرمان اس
درویش کے پاس پہونچا کہ :

"اے درویش تو از اں مائی و من از اں تو فریضہ خود بتو بخشیدم-"

ترجمہ : اے درویش اس بنا پر کہ تو ہمارا ہے اور ہم تیرے ہیں
تو ہم نے اپنا فرض بھی تجھ کو بخش دیا-
میں نے فوراً سجدہ شکر ادا کیا-

جب محدّث دہلوی (حضرت مولانا شیخ عبدالحق صاحبؒ) کی تحقیق یہ ہے کہ
یہ مکالمہ "ایک اختراع" ہے تو اس روایت کو ثبوت میں تو نہیں پیش کیا جا سکتا-
مگر اس سے عام خیالات کا اندازہ ضرور ہوتا ہے-کہ قلندر کے متعلق تعلیم
یافتہ لوگوں کے بھی خیال کیا ہوا کرتے تھے-

مغل بادشاہوں کے دور میں اس طرح کے خیالات ایک طرح کا فیشن بن گئے
تھے-یہاں تک کہ آزاد منش فقیر اسی کیفیت کو "مقصود اصلی" قرار دینے لگے تھے-
شاہزادہ داراشکوہ کے پیر "ملا شاہ بدخشی" کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے
لا تقربوا الصلوۃ وانتم سکاری -کی تفسیر کرتے ہوئے نماز ہی معاف کر
دی تھی-آپ کی تفسیر کے الفاظ اور ان کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے :

"اے کسانیکہ ایمان حقیقی آوردہ اید نزدیک نماز نشوید در
حالت سکرو مستی مقرر سکر حالت بلند ترست از نماز
گذاران-اگر مستی مجازی ست قرب نماز ممنوع ست تا نماز
ملوث نشود-دریں صورت عزت نماز ست-واگر سکر حقیقی
ست باز ہم قرب نماز ممنوع ست-دریں صورت عزت
سکر ست-مصلی نماند نماز کے خواند (حسنات العارفین بحوالہ
شاندار ماضی ج ۱)

ترجمہ : (اے لوگو! جو حقیقی ایمان رکھتے ہو-سکر و مستی کی
حالت میں نماز کے پاس مت جاؤ-بے شک حالت سکر
نمازیوں کی حالت سے بہت بلند ہے-مستی اگر مجازی ہے یعنی
نشہ سے بے ہوشی ہو گئی ہے تب بھی نماز کے پاس جانا ممنوع
ہے-اس صورت میں نماز کی عزت و عظمت ہے تاکہ نماز
ملوث اور آلودہ نہ ہو-اور اگر سکر حقیقی ہے یعنی عشق مولیٰ میں
وارفتگی ہے- تب بھی قرب نماز ممنوع ہے-اس صورت
میں اس سکر اور بے خودی کی عزت ہے کہ نمازی ہی نہیں رہا-
نماز کیسے پڑھے-"

ملا صاحب کی یہ بات تو ٹھیک ہے کہ "مصلی نماند' نماز کے خواند" نمازی نہیں
رہا-نماز کون پڑھے-مگر انہوں نے اس تناقض کی طرف خیال نہیں فرمایا جو خود
ان کے استدلال میں واقع ہو گیا ہے-یعنی جب وارفتگی اور بے خودی اس حد تک
بڑھ گئی-کہ ہوش و حواس تو کیا خود اس کا وجود عدم کی برابر ہو گیا تو وہ مخاطب ہی
کہاں رہا-اور جب وہ خطاب کی صلاحیت نہیں رکھتا تو تکلیف شرعی بھی باقی نہیں
رہی-مگر ایسے مرفوع القلم کو نماز پڑھنے والوں سے افضل قرار دینا ملا صاحب کا
معاذ اللہ "الحاد" ہے-

محمد رسول اللہ ﷺ کے متعلق جب یہ حقیقت ہے کہ "بعد از خدا بزرگ
توئی قصہ مختصر" پھر کسی کو معاذ اللہ آپ سے افضل قرار دینا الحاد اور زندقہ نہیں تو
اور کیا ہے-

مگر قلندر صاحب کا دامن اس الحاد سے پاک ہے-مکتوب کے اقتباسات پہلے
گزر چکے ہیں-آپ محمد رسول اللہ ﷺ کو محبوب حقیقی اور معشوق حقیقی قرار دیتے

ہیں۔ بس سب سے افضل اور سب سے محبوب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ آپ کی ہر ایک حالت تمام حالتوں سے افضل ہے۔ آپ کی شان سکر دائم سے ہمیشہ بلند رہی۔ تو پھر سکر دائم کو نماز سے افضل کیسے کہا جا سکتا ہے؟

بنیادی غلطی

ملاشاہ جیسے لوگوں کی اس غلطی کی بنیاد یہ ہے کہ انہوں نے عبادت کے صرف ایک پہلو پر نظر رکھی کہ عبادات گناہوں کا کفارہ ہوا کرتی ہیں۔ اس پر اس زعم باطل کا اضافہ ہو گیا کہ جب سکر دائم ہے تو گناہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پس جب گناہ نہیں تو کفارہ کی بھی ضرورت نہیں۔

مگر وحی الٰہی اور سنت رسول اللہ ﷺ نے عبادت کا دوسرا پہلو بھی اتنی ہی قوت سے پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ رضاء مولیٰ کا ذریعہ بھی "عبادت" ہی ہوا کرتی ہے۔ اور یہ کہ خداوندی انعامات کا شکر بھی اگر ادا ہو سکتا ہے۔ تو صرف عبادت کے ذریعہ ہی ادا ہو سکتا ہے۔

کسی قلندر یا مجذوب کے گناہوں کی معافی تو صرف اس کا تخیل ہے۔ جس کے متعلق شریعت کی کوئی سند نہیں پیش کی جا سکتی۔ البتہ محمد رسول اللہ ﷺ کے گناہوں کی معافی کا اعلان خود رب محمد ﷺ نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے:

"لیغفرلک ما تقدم من ذنبک وما تاخر۔"

اس کے باوجود نہ صرف پنج وقتہ نمازیں اور ان کی سنتیں اور نفلیں پابندی سے ادا ہوتی تھیں۔ بلکہ شب بیداری کی بھی حالت یہ تھی کہ کئی کئی گھنٹے نفلوں میں کھڑے رہنے کے باعث پائے مبارک متورم ہو جاتے تھے۔

صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ آپ نبی اور مقدس رسول کی حیثیت سے فطرتاً معصوم ہیں۔ گناہوں سے پاک، اس پر بھی اگر کچھ لغزشیں اور خطائیں ہو گئی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کا اعلان فرما چکے۔ اب پھر یہ زحمت کیسی اور دن بھر کی بے پناہ مشغولیت و مصروفیت کے بعد راتوں کو ا

لمبی لمبی نفلوں کی کیا ضرورت ہے۔؟

آپ کو معلوم ہے سید الکونین، محبوب رب العالمین ﷺ نے اس نہایت معقول سوال کا کیا جواب دیا تھا۔ آپ نے فرمایا:

"افلا اکون عبدا شکوراً"

بے شک اللہ تعالیٰ کے احسانات بے شمار ہیں۔ مگر کیا تقاضاء انصاف ہے کہ اس کے ان احسانات و انعام بے غایات کا شکر نہ ادا کیا جائے۔

گناہوں کے کفارہ کے لیے نہیں بلکہ ادائے شکر کے لیے ضروری ہے کہ:

شکر نعمت ہا تو چنداں کہ نعمت ہاء تو

ادائے شکر کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جو عاشق کے لیے نہایت ضروری ہے اتنی ضروری جتنی ماہی بے آب کے لیے قطرہ آب ضروری ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ، یعنی سرگوشی راز و نیاز، عرض معروض اور مناجات۔

اس کا ذریعہ کیا ہے، صرف نماز۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ "نمازی اپنے رب سے سرگوشی اور راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے۔ (صحاح)

عاشق صادق محمد ﷺ کو دیدار رب معراج میں ہوا تھا۔ آپ کی امت کی معراج یہ تو نہیں ہے کہ عرش و کرسی کی سیر کرے۔ البتہ مومن کی معراج نماز ہے۔ (صحاح)

قرب محبوب مقصود ہے تو سب سے زیادہ قرب جو بندے کو اپنے رب سے میسر آتا ہے وہ ارشاد رسول اللہ ﷺ کے بموجب نماز میں میسر آتا ہے۔ جب بندہ اپنی پیشانی اپنے رب کے سامنے زمین پر رکھتا ہے۔

بہر حال قلندر یا مجذوب کے لیے اتنی بات درست ہے کہ جب وہ "عالم خبر" سے "بے خبر" ہوئے۔ اور ان کے یہاں خبرداری اور "آگہی" کا مد ہی ختم ہو گیا۔ تو پھر ان کو احکام شریعت کی خبر کہاں سے ہو۔ جذب دائم، سکر لازوال، سرمستی و دار فتگی جس کے لیے بے خبری اور ناآگہی لازم ہے۔ ان کی زندگی بن جاتی ہے۔ یہ

اگر ختم ہوتا ہے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔"

درد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ اس بے آگہی میں اگر کہیں آگہی ہو جاتی ہے تو صحیح قلندر (یعنی جو شخص واقعی عشق مولیٰ کے جذبہ سے وارفتہ اور مغلوب ہو جاتا ہے اس کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ آگہی' احترام شریعت بلکہ احکام شریعت سے عشق کی صورت میں جلوہ افروز ہوتی ہے۔ کیونکہ اصل عشق تو یہی تھا۔ اسی کی غیر معتدل افزونی و فراوانی نے یہ بے خودی پیدا کر دی ہے۔

کسی اور قلندر کی یہ شان ہو یا نہ ہو' لیکن جس قلندر کے احترام میں ہمارا قلم سرنگوں ہے۔ یعنی شیخ شرف الدین بو علی شاہ قلندر ان کی شان تو یہی تھی۔ چنانچہ فرضیت نماز کی معافی کی روایت تو صرف مکالمہ میں ہے جس کو اختراعی قرار دیا گیا ہے۔ مگر جس واقعہ کو تمام سوانح نگاروں نے بلا کم و کاست نقل کیا ہے وہ اسی عشق کی شہادت دیتا ہے جس کو عشق شریعت کہنا چاہیے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حالت سرمستی میں حضرت قلندر صاحب کی لبیں بہت بڑھ گئیں۔ کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ قلندر صاحب کو آگاہ کرے یا ان کو تراش دے۔ حضرت مولانا ضیاء الدین صاحب سنائی جو پابندی شریعت کے زیور سے آراستہ اور اتباع سنت کے بارہ میں عام شہرت رکھتے تھے۔ وہ قلندر صاحب کے پاس پہونچے۔ قینچی ہاتھ میں لی۔ ریش مبارک پر ہاتھ رکھا اور لبیں تراش دیں۔ مولانا سنائی اپنا فعل کر چکے۔ مگر اس کے بعد قلندر صاحب کی حالت یہ تھی کہ:

"ہمیشہ محاسن خود را بوسیدے و گفتے این ریش چہ مبارک ریش ست کہ در راہ شریعت محمدی گرفتہ شدہ است۔ (خزینۃ الاصفیاء و اخبار الاخیار وغیرہ)

ترجمہ: ریش مبارک کو بوسہ دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ یہ داڑھی کتنی مبارک ہے کہ شریعت محمدی کی راہ میں

پکڑی گئی ہے۔"

اس واقعہ کی صحت سے انکار مشکل ہے۔ لیکن یہ واقعہ اس الزام اور بہتان کی بھی بہت بڑی تردید ہے کہ حضرت قلندر صاحب صوم و صلوٰۃ اور احکام شریعت کی پابندی سے آزاد ہو گئے تھے۔ کیونکہ جو علماء داڑھی اور مونچھوں کی غیر مسنون ہیئت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ صوم و صلوٰۃ جیسے بنیادی فرائض کے ترک کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ مولانا ضیاء الدین سنامی تو اپنے زمانہ کے مشہور اہل بصیرت فضلاء میں سے تھے۔ ان کی شان تو بہت بلند ہے۔ شریعت کے ایک معمولی واقف کار کے لیے بھی یہ بات مضحکہ خیز ہے کہ نماز روزہ کے ترک سے تو متاثر نہ ہو۔ اور مونچھیں خلاف سنت ہو جائیں تو ان کی اصلاح کے لیے ہمت و جرات کے مظاہرہ میں پوری طاقت صرف کر دے۔ یہاں تک کہ اپنے سات لڑکوں کو قربان کر دے۔ کیونکہ اس واقعہ کو جس انداز سے شرف المناقب جیسی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ مفتی صاحب نے اس شرعی احتساب کے انجام دینے کے لیے پہلے اپنے لڑکوں کو بھیجا تھا۔ مفتی صاحب کے سات لڑکے تھے جو لڑکا بھی مقراض لے کر قلندر صاحب کے سامنے جاتا رہا۔ نگاہ جلال کی تلوار سے شہید ہوتا رہا۔ جب سات بیٹے شہید ہو چکے تب حضرت مفتی صاحب خود تشریف لے گئے۔ اور اس خدمت کو انجام دیا۔

بہر حال جو مفتی اور عالم احکام شریعت کے احتساب میں اس قدر باہمت اور سخت جان ہو کہ صرف ایک سنت پر عمل کرانے کے لیے سات بیٹوں کو قربان کر دے وہ صوم و صلوٰۃ کے ترک کو کیسے برداشت کر سکتا ہے۔ اور اگر کسی کو مرفوع القلم مجنوں سمجھ کر نماز روزہ جیسے فرائض سے غیر مکلف سمجھتا ہے تو وہ اس کو داڑھی اور مونچھ کی مستحب یا مسنون ہیئت کے بارے میں بھی لامحالہ غیر مکلف سمجھے گا۔ اور احتساب کا ارادہ ہی نہیں کرے گا۔

جب یہ واقعہ اخبار الاخیار اور خزینۃ الاصفیاء جیسی مستند کتابوں کے حوالہ سے زیر تحریر میں آیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شرف المناقب کی روایت کا بھی

مکمل ترجمہ پیش کر دیا جائے جس سے ناظرین کرام بھی صحیح اور غلط کا اندازہ فرما سکیں گے۔

"شرف المناقب میں ہے "معتبر اہل سلف سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ آں عاشق الٰہی (حضرت شریف الدین بو علی) کی مونچھوں کے بال دراز ہو گئے تھے۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ ان کو تراشنے کی فہمائش کر سکے۔ البتہ مولانا ضیاء الدین صاحب سنامی عرف علی مفتی جو علماء شریعت کے مقتدا تھے۔ انہوں نے قص شوارب (مونچھیں کترنے) کے احتساب اور مونچھوں کو سنت کے مطابق تراشنے کے لیے اپنے سات لڑکے بھیجے جو لڑکا بھی حضرت بو علی کے سامنے مونچھیں تراشنے کے لیے پہونچتا تھا حضرت شرف الدین بو علی (جو قتال کے لقب سے مشہور ہیں) آپ کی نگاہ جلال کی تلوار کی ضرب سے شربت شہادت چکھتا تھا۔ مفتی نے کہا الحمد للہ میرے لڑکے شرع محمدی کی راہ مین شہید ہوئے۔ پھر خود اپنے ہاتھ میں مقراض لی اور آنحضرت کے سامنے پہونچے۔ چونکہ قلندر عاشق کو ہمیشہ ذات ذوالجلال کا مشاہدہ اور جناب رسالت پناہ کی مجلس مبارک کی حاضری میسر رہتی تھی۔ حکم شریعت کی تعمیل کے لیے سر جھکا کر مفتی صاحب کے اقدام کو قبول کیا۔ جب مونچھیں تراشیں گئیں تو ہر ایک بال کی جڑ سے خون کا قطرہ جاری ہو گیا۔ اس کے بعد آنحضرت (قلندر صاحب) اپنی داڑھی کے بالوں کو اپنے مبارک لبوں سے بوسہ دیتے تھے اور فرماتے تھے۔ الحمد للہ یہ داڑھی شرع محمد کی راہ میں پکڑی گئی ہے۔ چونکہ حضرت قلندر صاحب کے بدن مبارک کا ہر بال یاد الٰہی میں مشغول اور مقام رضا و تسلیم میں سرگرم رہتا تھا تو اتنے بالوں کے جدا ہو جانے کا کسی قدر ملال حضرت قلندر صاحب کو ہوا۔ اور آپ نے فرمایا۔ مفتی تیری قبر گدھوں کی چراگاہ ہو گی۔ جو گدھا گم ہو جایا کرے گا وہ تیری قبر پر ملا کرے گا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ عرصہ تک ایسا ہی ہوتا رہا۔

بہر حال یہ تضاد بیانی انہیں مصنف صاحب کا مخصوص حصہ ہے کہ ایک طرف حضرت قلندر صاحب مفتی ضیاء الدین صاحب کے سامنے اس لیے

تسلیم خم کر دیں کہ قلندر صاحب کو ہمیشہ دربار رسالت کی حاضری میسر رہتی تھی اور دوسری جانب یہی حاضر باش سات نوجوانوں کو ناحق قتل کر دیں۔

مختصر یہ کہ اصل واقعہ اتنا ہی ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے لبیں تراشیں اور قلندر صاحب کو اس پر وجد آ گیا کہ ان کی داڑھی راہ شریعت میں پکڑی گئی۔ (واللہ اعلم بالصواب)

اسباب ترک

ہمارے خیال میں ہر وہ عالم تارک الدنیا ہے جو خدمت دین کو اپنی ذاتی منفعت پر مقدم سمجھے۔ آنحضرت ﷺ کی سنت مبارکہ نے ترک دنیا کا جو نقشہ پیش فرمایا ہے وہ اسی کے مشابہ ہے۔ صحابہ کرام میں سے تین فرد آستانۂ حرم پر حاضر ہوئے اور آنحضرت ﷺ کی خانگی زندگی اور خلوت کے مشاغل کے متعلق معلومات حاصل کرنی چاہیں۔

ان حضرات کے نزدیک ترک دنیا کے معنی یہ تھے کہ انسان کھانا پینا چھوڑ دے۔ ہمیشہ روزے سے رہے۔ رات بھر خدا کی یاد میں مصروف رہے۔ اپنے اوپر سونا حرام کر لے۔ ازدواجی زندگی سے کنارہ کش ہو جائے۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ اندرون خانہ اس طرح رہتے ہیں جیسے ایک گرہستی رہتا ہے۔ گھر کا کام بھی کرتے ہیں۔ اہل و عیال سے خوش طبعی بھی فرماتے ہیں۔ رات کو آرام بھی فرماتے ہیں۔ روزے بھی رکھتے ہیں۔ مگر زیادہ تر افطار کرتے ہیں۔ تو ان تحقیق کرنے والے حضرات کو حیرت ہوئی۔ کیونکہ زہد و تقویٰ اور ترک دنیا کا جو "معیار" انہوں نے قائم کیا تھا۔ یہ باتیں اس معیار سے کم تھیں۔ مگر جو عقیدت ان صاحبان کو آنحضرت ﷺ سے تھی وہ اجازت نہیں دیتی تھی کہ آپ کی پاک زندگی کو زہد و تقویٰ کے معیار سے ساقط اور گری ہوئی قرار دیں۔ تو ان حضرات نے یہ توجیہہ کی کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کا کیا کہنا' آپ کی شان نرالی ہے۔ آپ تو "محبوب خدا" ہیں آپ کی تمام خطائیں اور لغزشیں معاف ہیں۔ پس ہمیں اپنے اوپر آپ کو

قیاس نہ کرنا چاہیے- آپ جو کچھ بھی کرتے ہوں وہ آپ کا فعل ہے- ہمیں تو یہ طے کرنا چاہیے- کہ ازدواجی زندگی ختم کر دیں' رات کو سونا اور دن کو کھانا حرام کر لیں' یعنی پوری رات یاد خدا میں صرف کیا کریں اور دن بھر روزہ رکھا کریں-

ان حضرات کے اس فیصلہ کا علم آنحضرت ﷺ کو ہوا تو آپ نے برہمی کے ساتھ فرمایا- بے شک میں رات کو سوتا بھی ہوں اور نوافل بھی پڑھتا ہوں' دن کو کھاتا بھی ہوں اور روزے بھی (جب موقع ہو) رکھتا ہوں- میری بیویاں بھی ہیں جن کے حقوق ادا کرتا ہوں- یہی دین ہے یہی سنت ہے جو اس سے روگردانی کرتا ہے وہ مجھ سے منہ موڑتا ہے-

بہر حال ترک دنیا یہ نہیں کہ دنیا کی پاک چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا جائے- ترک دنیا یہ ہے کہ اپنے نفس کے ترجیحی حق کو ختم کر دیا جائے- دنیا کی تمام خوشگواریاں اور تمام دلچسپیاں جائز اور مباح ہیں- جب تک کوئی دینی مصلحت مقابلہ پر نہ آئے اور جہاں مقابلہ ہو اس وقت دینی مصلحت کو نظر انداز کرنا' طلب دنیا ہے خواہ آپ عیش و رفاہیت میں ہوں یا فقر و افلاس میں-

ارشاد ربانی ہے:

"کہہ دیجئے' اگر آپ کے باپ' بیٹے' بیویاں' عزیز و اقارب' دھن دولت' کھیت کیار' باغ باغیچے' دوکان اور تجارت' یا مکان اور جائیداد- اللہ اور اس کے رسول اور راہ خدا میں جانفشانی اور جہاد کے مقابلہ میں زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہیں- تو تم صاحب ایمان تو کیا ایک ایسی قوم ہو جو عذاب کی مستحق ہے-" اب تمہیں اللہ کے عذاب کا انتظار کرنا چاہیے-" (سورہ توبہ)

بہر حال ترک دنیا اصل میں ترک محبت ہے- شان و شوکت یا راحت و آرام کا ترک ہمیشہ ترک دنیا نہیں ہوا کرتا- بلکہ یہ ترک بھی بسا اوقات حب دنیا بن جاتا ہے- (معاذ اللہ)

چیست دنیا از خدا غافل شدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

پس قلندر صاحب اس وقت بھی تارک دنیا تھے جب وہ "مسجد قوت الاسلام" میں شب و روز مطالعہ اور درس میں مصروف رہتے تھے- کیونکہ اس وقت بھی آپ کی بلند و بالا شخصیت حرص و طمع سے پاک اور ذاتی مفاد کی بندشوں سے آزاد تھی- غالباً آپ نے اسی زمانہ میں فرمایا تھا-

زہد و تقویٰ چیست اے مرد فقیر
لا طمع بودن ز سلطان و امیر
پشت پازن تخت کیکاؤس را
سربدہ از کف مدہ ناموس را

لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے آخر کار وہ صورت اختیار کی- جس کو عام اصطلاح میں ترک دنیا کہا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے- یعنی سامان درس و تدریس و اسباب قضا و فتویٰ کو دریابرد کر دیا- اور گوشہ صحرا کو اپنا مسکن بنایا- آپ نے ایسا کیوں کیا-؟

ایک روایت یہ ہے کہ وہی درویش جنہوں نے ولادت سے تیسرے روز مکاں پر تشریف لا کر وہ آیت پڑھی تھی- جس کو سن کر اس "قلندر نو مولود" نے گریہ بند کیا تھا' یہی بزرگ مسجد قوت الاسلام میں تشریف لائے- حضرت قلندر صاحب درس میں مشغول تھے- درویش صاحب نے فرمایا- میاں شرف الدین کب تک اس "قیل و قال" میں پڑے رہو گے- قلندر صاحب نے اس سوال کا جواب اپنے عمل سے دیا- یعنی کتاب بند' محفل درس ترک' صحرا نوردی اور آبلہ پائی کو لبیک-

رخصت اے زندان جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

اس سلسلہ میں ایک عجیب و غریب واقعہ بھی بیان کیا گیا ہے- جس کا تعلق اس

زمانہ کے حکمران سے ہے۔ شیخ محمد صاحب عثمانی مصنف شرف المناقب نے صرف بادشاہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا نام نہیں لیا اور محمد مسیح اللہ صاحب پانی پتی نے اپنے غیر مطبوعہ رسالہ میں (جس کو انہوں نے "اجڑے دیار" سے معنون کیا ہے) غیاث الدین بلبن کا نام لیا ہے کہ اس کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ بیگمات چاہتی تھیں کہ ان کے لڑکا ہو تا کہ بادشاہ کا تقرب زیادہ ہو اور دوسری جانب یہ واقعہ ہوا کہ کوئی شخص حضرت شیخ شرف الدین صاحب کے پاس آیا۔ اور عرض کیا کہ ہمارے پیر کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور انہوں نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ غسل جنازہ کے وقت ان کی لنگوٹی نہ کھولی جائے۔ آیا اس طرح غسل دینا جائز ہے یا نہیں۔ حضرت شیخ شرف الدین صاحب نے ناجائز قرار دیا۔ تو اس شخص نے عرض کیا کہ میں تو اپنے پیر کی وصیت کے خلاف نہیں کر سکتا۔ مہربانی فرما کر آپ زحمت گوارا فرمایئے اور تشریف لے چلئے۔ شریعت کے مطابق غسل کرا دیجئے۔

حضرت قلندر صاحب اس کے ساتھ ہو لیے۔ تھوڑی دور چل کر دیکھا کہ ایک سڑک کے کنارے پر ایک فقیر مرا پڑا ہے۔ لنگوٹی کسے ہوئے ہے۔ حضرت قلندر صاحب نے اس کو غسل دینا شروع کیا اور لنگوٹی کھولنی چاہی وہ مردہ فقیر اٹھ بیٹھا اور کہا "جہاں نامرد لنگوٹ پر ہاتھ ڈالیں وہاں مرنا بھی مناسب نہیں ہے۔" کہہ کر چل دیا۔

حضرت قلندر صاحب ششدر رہ گئے۔ اس شخص سے جو ساتھ لے گیا تھا اصل معاملہ دریافت کرنا چاہا تو اس نے کہا۔ مولانا یہ فقیری ہے۔ تمہیں اگر یہ کہ معلوم ہوتا تو تم باپ اور بیٹی کا نکاح ہی کیوں کرتے۔ اب تو شیخ بو علی صاحب اور ان چکرائے اور سیدھے بادشاہ کے محل پر پہونچے۔ بادشاہ کو کل ماجرا سنایا۔ بادشاہ بھی پریشان تھا۔ فوراً تحقیقات کی تو معاملہ کھل گیا۔ بادشاہ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے ایک عظیم مصیبت سے بچایا۔

اس واقعہ نے مولانا شرف الدین بو علی پر یہ اثر کیا کہ آپ نے کتابیں دریا میں غرق کیں اور فرمایا:

جبہ و دستار علم و قیل و قال
جملہ در آب رواں اندا ختم

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے ہندی کا یہ دوہا پڑھا:

پنڈت لیکھیا پانچ کر بولتی پانی پور
سگرے لچھمر میٹ کر من میں سائیں توڑ
پوتھی تو تھوتی بھئی پنڈت بھیا نہ کوئے
ایک لچھمر پریم کا پڑھے سو پنڈت ہوئے

یہ واقعہ جس میں سراسر افسانوی رنگ ہے ممکن ہے اصلیت رکھتا ہو اور کسی لاعلمی کی بنا پر حضرت شیخ نے کوئی ایسا نکاح پڑھ دیا ہو جو شرعی جواز سے محروم ہو۔ مگر ہمارے خیال میں اس زمانہ کے سیاسی اور سماجی ماحول کو آپ کے اس فیصلہ اور عمل میں بہت بڑا دخل ہے۔ آپ کی مثنوی سے اس کی شہادت مہیا ہوتی ہے جو عنقریب پیش کی جائے گی۔ (انشاء اللہ)

اگر "حکم نامہ" وغیرہ کی روایتوں پر اعتبار کیا جائے کہ آپ چالیس سال کی عمر میں دہلی تشریف لائے۔ پھر چالیس سال آپ نے خدمت درس انجام دی۔ اور بیس سال عہدۂ قضا پر فائز رہے تو اس طرح سو سال کی عمر کے بعد آپ پر وہ کیفیت طاری ہوئی جس کو قلندری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی جب آپ کی عمر سو سال پورے کر چکی تب آپ نے دنیا ترک کی۔ اور اگر عہدۂ قضا کے بیس سال کو مدت درس میں شامل کر لیا جائے۔ یعنی یہ تسلیم کیا جائے کہ بیس سال تک صرف درس دیتے رہے اور بیس سال درس کے ساتھ فرائض قضا بھی انجام دیئے جیسا کہ اس زمانہ کا عام دستور تھا کہ قاضی اور جج صاحبان عدالت سے فارغ ہو کر دوسرے اوقات میں درس بھی دیا کرتے تھے تو اس طرح آپ نے اسی سال کی عمر میں یہ "ترک" اختیار کیا۔

"گلزار ابرار" میں "حکم نامہ" کے بجائے "حکمت نامہ" تحریر ہے۔ حکمت

نامہ کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے کہ شیخ شرف الدینؒ نے فرمایا- میری عمر چالیس سال تھی- جب میں دہلی پہونچا- حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار پر حاضری دی- پھر درس وافتاء میں مشغول ہو گیا اور بیس سال تک یہ خدمت انجام دیتا رہا- پھر جذبۂ ربانی طاری ہوا- درس و افتاء بند کیا اور اللہ کی زمین کی سیاحت شروع کی- شیخ شمس الدین تبریزی اور شیخ جلال الدین رومیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا- ان دونوں سے خرقۂ خلافت حاصل کیا- اس کے بعد ہندوستان واپس آیا اور جو کچھ سامان درس و تدریس تھا- اس کو "دریائے جمن" کی نذر کر دیا- گلزار ابرار کی اس روایت کو اگرچہ مولانا عبدالحئی صاحب نے بھی "نزہۃ الخواطر" میں نقل کر دیا ہے- مگر اس کے علاوہ کہ آپ کی عمر ۴۰ سال تھی جب آپ دہلی آئے- اس روایت کا باقی حصہ مجروح ہے- پہلی جرح تو یہ ہے کہ اس روایت میں "مدت درس" بیس سال بیان کی ہے- حالانکہ خود حکیم صاحب نے چند سطر اوپر تحریر فرمایا ہے کہ:

"اشتغل بالعلوم فدرس واناد ثلاثين سنة-"
(نزہۃ الخواطر ج ۳ صفحہ ۵)

ترجمہ: (علم میں مشغول رہے- تیس سال تک درس و تدریس کا فیض جاری رکھا-)

پھر اگر بیس سال بھی مدت درس تسلیم کر لی جائے- تو دوسری جرح یہ ہے کہ زمانۂ سیاحت میں تبریز پہونچ کر شیخ شمس الدین تبریزی سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کی بات کسی طرح بھی صحیح نہیں ہوتی- کیونکہ قلندر صاحب کا یہ سفر سیاحت کم از کم ۶۶۴ھ میں شروع ہوا ہوگا- حالانکہ حضرت شمس الدین تبریزی اس سے اٹھارہ سال پہلے ۶۴۵ھ میں شہید کیے جا چکے ہیں- بے شک حضرت جلال الدین رومیؒ کی وفات ۶۷۲ھ میں ہوئی- مگر کسی اور روایت نے اس کی تصدیق نہیں کی کہ قلندر صاحب کی ملاقات حضرت مولانا رومیؒ سے ہوئی- ہاں یہ درست ہے کہ قلندر صاحبؒ نے اپنی مثنوی میں بار بار مولانا رومؒ کا ذکر فرمایا ہے مگر اس سے

ضروری نہیں ہو جاتا کہ مولانا روم سے ملاقات بھی ہوئی ہو گی-

بہر حال جب قلندر صاحب کا سنہ ولادت ۶۰۴ھ ہے- اور چالیس سال کی عمر میں آپ دہلی تشریف لائے تو اتنی بات تو ثابت ہوئی کہ دہلی میں آپ کی تشریف آوری ۶۴۴ھ میں ہوئی ہے- اتفاق سے یہی وہ سال ہے جس کے پہلے مہینے یعنی محرم الحرام سے سلطان ناصر الدین محمود (اول) کی سلطنت شروع ہوتی ہے-

ناصر الدین محمود سلطان شمس الدین التمش کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا- شمس الدین التمش کی ۲۵ سالہ سلطنت ۲۰ شعبان ۶۳۳ھ (مئی ۱۲۳۶ء) میں اس کی وفات پر ختم ہوئی- اس کے بعد اگرچہ قاعدہ کے مطابق اس کے بڑے لڑکے اور ولی عہد رکن الدین فیروز شاہ کو تاج پہنایا گیا- مگر اس کی نا قابلیت نے سات ماہ سے زیادہ اس کو سلطنت کی مہلت نہیں دی- ۶۳۴ھ کے وسط میں امراء دولت نے اس کو معزول کر کے اس کی بہن رضیہ سلطانہ کو تخت نشین کر دیا- مگر اس کو بھی صرف تین سال کی مہلت ملی- ۶۳۷ھ میں اس قابل اور بہادر خاتون اور اس کے نئے شوہر دونوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا- اس کی جگہ اس کے بھائی معز الدین بہرام شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا- لیکن دو ہی سال کے بعد اس کو بھی معزول کر کے قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ رکن الدین فیروز شاہ کے لڑکے علاؤ الدین مسعود شاہ کو سلطنت کی باگ ڈور دیدی گئی- مگر یہ غریب بھی دانش و جرأت سے محروم تھا زیادہ عرصہ زمام سلطنت نہ سنبھال سکا' صرف چار سال گذرنے پائے تھے کہ ارا کین دولت اس سے بھی متنفر ہو گئے- ۲۶ محرم ۶۴۴ھ کو اسے معزول کر کے قید میں ڈال دیا- اب جس کو سلطنت کے لیے منتخب کیا گیا- وہ یہی ناصر الدین محمود اول تھا جس کا ذکر چند سطر پہلے آ چکا ہے-

ناصر الدین محمود وہ بادشاہ ہے جو نہ صرف اس خاندان میں جس کو "خاندان غلامان" کہا جاتا ہے- سب سے زیادہ نیک نفس' عادل اور رحم پرور تھا- بلکہ دہلی کے تمام بادشاہوں میں اس کو وہ امتیاز حاصل ہے جو کسی دوسرے کو میسر نہیں آیا-

اس بے چارے نے اپنے والد سلطان شمس الدین التمش کی وفات کے بعد سے اب تک گیارہ سال نظر بندی میں گزارے تھے۔ لیکن اس کی یہ دانشمندی تھی کہ نظر بندی کے اس دور کو اس نے خفیہ سازشوں یا خواب و راحت میں ضائع نہیں کیا۔ بلکہ اس نے اس فرصت کے ایک ایک لمحہ کو اپنی سیرت کی تعمیر میں صرف کیا۔

کتابوں کے مطالعہ سے اس کو شغف تھا اور اپنی محنت سے اپنا رزق فراہم کرنا اس نے اپنی زندگی کا پروگرام بنالیا تھا۔ یہ بہترین خطاط تھا۔ اس نے کتابت کو ذریعہ معاش بنایا۔ اسی کی آمدنی سے وہ گذر اوقات کرتا تھا۔

وہ بادشاہ بن کر تخت پر بیٹھا۔ تب بھی اس کے ہاتھ سے قلم نہیں چھوٹا۔ ایسی تدبیریں بہت سی اختیار کیں جن سے اہل ملک کی زندگی کا معیار بلند ہو۔ مگر اپنی زندگی کا معیار وہی قائم رکھا جو نظر بندی کے زمانہ میں تھا۔ نوکر رکھنے کی استطاعت نظر بندی کے زمانہ میں نہیں تھی۔ گھر کا کھانا خود بیوی پکاتی تھی۔ جب یہ بادشاہ اور بیوی ملکہ جہاں بنی۔ تب بھی اپنے خادم وہ خود ہی رہے۔ بیوی خود ہی روٹی پکاتی گھر کا کام خود ہی کرتی اور بادشاہ کتابت کی مزدوری کرتا اور امور سلطنت سے فراغت پاتا تو اپنے کپڑے خود سینے لگتا تھا۔

یہ حسن اتفاق تھا کہ حضرت شاہ بو علی قلندرؒ دہلی پہونچے۔ تو دہلی کی قسمت بھی سلطان ناصر الدین محمود جیسے انصاف پسند، پاکیزہ سیرت، نیک بادشاہ کے آفتاب اقبال سے چمک اٹھی۔

قدرت کی فیاضیوں نے اس کو وزیر بھی ایسا ہی نیک نفس، نیک نیت، باتد اور وفادار دیا تھا۔ "غیاث الدین بلبن" جس کا نام آج تک عزت سے لیا جاتا ہے۔ اس کا وزیر تھا۔

وزیرے چنیں شہر یارے چناں
جہاں چوں نگیرد قرارے چناں

حضرت شیخ شرف الدین جب ۶۴۴ھ میں دہلی پہونچے۔ تو سلسلہ درس

آپ نے کچھ دنوں بعد ہی شروع کر دیا۔ مگر عہدۂ قضا یقیناً اس وقت نہیں ملا ہوگا۔ اگرچہ مکالمہ کے الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے۔ کہ چالیس سال بعد اس عہدہ پر فائز ہوئے مگر یہ یقیناً غلط ہے۔ کیونکہ چالیس سال بعد سیاست کا وہ گھناؤنا دور آتا ہے۔ جس میں بو علی شاہ قلندر تو کیا معمولی درجہ کا نیک سیرت انسان بھی عہدۂ قضا قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔

مختلف روایتوں کے ملانے سے بطور قدر مشترک جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قریباً چالیس سال آپ نے درس اور منصب قضا کی خدمت میں صرف کیے۔

قیاس یہ ہے کہ جس طرح آپ کا دہلی پہونچنا اس مبارک اور مسعود وقت میں ہوا تھا، جب سلطان ناصر الدین محمود جیسے سلطان عادل کے عروج سے دہلی کی قسمت جاگی تھی۔ ایسے ہی جب یہ دور ختم ہوا اور سرزمین دہلی پر بادشاہوں کا خون بہنے لگا۔ تو حضرت قلندر صاحب نے رخت سفر باندھا اور نہ صرف شہر دہلی کو خیر باد کہا۔ بلکہ شہری زندگی ہی کو "الوداع" کہہ دیا۔

سلطان ناصر الدین محمود بیس سال حکومت کر کے جمادی الاول ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ء) میں اس دار فانی سے رخصت ہوا تو امرائے دولت نے اس کے وزیر غیاث الدین بلبن کو جس کے عادلانہ جوہر اور نظام سلطنت کی بہترین قابلیت کا تجربہ زمانہ دراز سے کرتے چلے آئے تھے، بادشاہ بنادیا۔ یہ اسی طرح منصفانہ شان اور بہادرانہ شوکت سے بائیس سال تک سلطنت کرتا رہا۔ ۶۸۶ء (۱۲۸۷ء) میں جب اس کی عمر تقریباً ۸۵ سال تھی۔ اس نے بھی جان شیریں جان آفرین کے حوالہ کی۔ لیکن اس کی وفات کے بعد فوراً ہی دہلی کا ستارہ اقبال گردش میں آگیا۔ غیاث الدین بلبن نے سوچ سمجھ کر اپنے پوتے "کیخسرو" کو ولی عہد بنایا تھا۔ لیکن اس کے دوسرے پوتے "کیقباد" کی سازش غالب آئی۔ کیقباد نے خود تخت سلطنت پر قبضہ کیا اور ولی عہد کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ لیکن اس کی سازشی سلطنت کامیاب نہیں ہوئی۔ ایک فوج کا کمانڈر شائستہ خاں خلجی سامنے آیا۔ اس نے کیقباد کو "کلوکھڑی" کے محل میں قتل کروا کر اس کی لاش محل کی کھڑکی سے دریائے جمنا کی ریتی

میں پھنکوا دی۔

عوام کے ہیجان کو فرو کرنے کے لیے اس وقت کیقباد کے تین سالہ لڑکے "کیومرشاہ" کو بادشاہ بنادیا۔ اور جب حالات کسی قدر معتدل ہو گئے تو اس تین سالہ بچے کو ذبح کرا کر ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) میں خود تاج سلطنت اپنے سر پر رکھ لیا۔

مختصر یہ کہ سلطان غیاث الدین بلبن کی وفات سے صرف تین سال کے اندر نہ صرف یہ کہ دو بادشاہ قتل کیے گئے بلکہ اس خاندان کی سلطنت ہی ختم ہو گئی۔ اور اب خلجی سلطنت کا آغاز ہوا جس کا بانی یہی شائستہ خاں ہے جس نے اپنے لقب اور خطاب جلال الدین فیروز شاہ اختیار کیا۔

چاہ کندہ را چاہ در پیش

چشم عبرت کے لیے کتنا عجیب و غریب سبق ہے کہ یہی شائستہ خاں اپنی تمام صلاحیتوں اور قابلیتوں کے باوجود پورے چھ سال بھی حکومت کرنے نہیں پایا کہ ۶۹۵ھ میں خود اس کے پروردہ برادر زادہ اور داماد نے اس کو قتل کر کے تاج بادشاہت اپنے سر پر رکھا۔ اور بادشاہ کے سر کو جھنڈے پر آویزاں کر کے پورے لشکر میں گشت کرایا۔

یہ بھتیجے صاحب جس نے اپنے خسر اور چچا کو قتل کیا "علاؤ الدین خلجی" ہیں۔ شائستہ خاں نے اس کو گورنر بنا رکھا تھا۔ مگر علاؤ الدین کی نظریں بہت او[illegible] تھیں وہ صرف گورنری پر قناعت نہیں کر سکتا تھا۔ اول اس نے جنوبی ہند پر حملہ [illegible] کے برار اور خاندیش وغیرہ کو فتح کیا۔ اور جب وہاں سے پلٹا تو اب اس کی [illegible] بادشاہت کے سوا کسی اور پر نہیں جمتی تھی۔ اس نے اپنے چچا شائستہ خاں کو ا[illegible] قیام گاہ "کڑہ مانکپور" آنے کی دعوت دی۔ چچا اگرچہ حیثیت داماد کے علاؤ الد[illegible] سے خوش نہیں تھا۔ کیونکہ میاں بیوی اور ساس داماد کے تعلقات اچھے نہیں [illegible] لیکن ہونہار بھتیجے کی حیثیت سے بہت خوش تھا۔ بھتیجا جو غیر معمولی فتوحات [illegible] واپس آیا تھا جب اس نے ملاقات کے لیے دعوت دی تو شائستہ خاں (جلال ا[illegible] فیروز شاہ) سے نہیں رہا گیا۔ اعوان سلطنت نے منع بھی کیا۔ مگر اس کو اپنے [illegible]

خود اپنی ہمت پر اتنا اعتماد تھا کہ گنگا کے راستہ "کڑہ مانکپور" پہونچ گیا۔ کشتی وسط رمضان میں کڑہ مانکپور کے قریب پہونچی۔ علاؤ الدین استقبال کے لیے کشتی پر آیا۔ اور بغل گیر ہوتے ہی خنجر چچا کی بغل میں رسید کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دہلی میں بادشاہ کے حادثہ کی خبر پہونچی تو ملکہ جہاں نے اپنے بیٹے رکن الدین ابراہیم شاہ کو تخت نشین کر دیا۔ مگر یہ بادشاہت صرف اس وقت تک تھی۔ جب تک علاؤ الدین کا لشکر جرار دہلی نہیں پہونچا تھا۔ لشکر کے پہونچنے میں چار ماہ صرف ہوئے۔ اور جب جنوبی ہند کا فاتح لشکر لے کر دہلی پہونچ گیا تو رکن الدین ابراہیم شاہ کی بادشاہت خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ رکن الدین کی زندگی کا تو سوال ہی کیا' ساتھ میں اس کی ماں اور اس کے دوسرے عزیزوں کو بھی تہ تیغ کر دیا۔

یہی علاؤ الدین ہے جس کا تذکرہ تمہیدی مضمون میں گذر چکا ہے۔ جس کے متعلق حضرت امیر خسرو کے الفاظ یہ تھے کہ "مہذب ڈاکو" ہیں۔

بادشاہت کے متعلق ان بادشاہوں کا نظریہ یہ تھا کہ "بادشاہت بانجھ ہوتی ہے" نہ اس کا کوئی رشتہ ہوتا ہے نہ قرابت' لہٰذا بادشاہت کے لیے ہر ایک کا خون مباح ہے خواہ کوئی ہو۔

بہر حال اس جرم کے بعد جو خود علاؤ الدین کی نظر میں ممکن ہے جرم نہ ہو۔ اس کی بادشاہت ضابطہ اور قاعدہ کی بادشاہت رہی۔ چنانچہ اس کا شمار ہندوستان کے کامیاب بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اس کا دور حکومت ۷۱۶ھ (۱۳۱۳ء) تک رہا۔ شوال ۷۱۶ھ میں اس نے بھی عالم جاودانی کو رخت سفر باندھا۔

جہاں را چنیں ست آئین و داد
کہ جز مرگ کس را ز مادر نہ زاد

علاؤ الدین کے بعد پھر افراتفری پھیلی' اور طوائف الملوکی کا دور ہوا۔ یہاں تک کے حضرت بو علی شاہ قلندر کے سنہ وفات ۷۲۴ھ تک تخت شاہی کو تین مرتبہ "قتل گاہ" بنا پڑا۔

سلطان علاؤ الدین کے بعد اس کے سب سے چھوٹے لڑکے شہاب الدین عمر

کو تخت نشین کیا گیا- جو صرف ایک سال سلطنت کر سکا- قطب الدین مبارک اول
نے اس کو قتل کر کے سریر سلطنت پر قدم رکھا- وہ بھی ۴ سال سے زیادہ جم نہ سکا-
۷۲۰ھ میں ناصر الدین خسرو نے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا- اور اس کے
ساتھ اس کے خاندان کے اور افراد کو بھی تہہ تیغ کیا کہ کوئی ان کے مقابلہ پر نہ آ
سکے- لیکن اپنی تمام تدبیروں کے باوجود قدرت کے دست قہر سے نجات نہ پا سکا-
پنجاب کے گورنر غیاث الدین تغلق نے علم بغاوت بلند کیا اور خسرو کو گرفتار کر کے
حکم دیا کہ جس جگہ خسرو نے قطب الدین کو قتل کیا تھا- اسی مقام پر اس کو قتل کیا
جائے- خسرو خاں نے اپنی بادشاہت کے تحفظ کے لیے خاندان خلجی کے تمام ایسے
افراد کو قتل کروا دیا تھا جن سے مقابلہ کا خطرہ تھا- اب خسرو خاں کے قتل ہونے کا
نتیجہ یہ نکلا کہ اس پورے خاندان کی سلطنت ختم ہو گئی- اور ۷۲۱ھ سے یہ تخت
خاندان تغلق کے حوالہ ہوا جس کا بانی یہی غیاث الدین تھا- جو ۷۳۵ھ میں مکان
کے نیچے دب کر مر گیا- کہا جاتا ہے کہ اس کے بیٹے برناشاہ نے وہ مکان بنوایا ہی ایسا
تھا کہ معمولی جھٹکے سے گر جائے- چنانچہ چند مست ہاتھیوں نے جو لڑ رہے تھے-
مکان میں ٹکر ماری اور یہ محل اس طرح گر گیا کہ غیاث الدین تغلق کی بادشاہت کو
بھی لے بیٹھا-

یہاں بادشاہوں کی سوانح عمری لکھنی مقصود نہیں ہے بلکہ اس سیاسی
افراتفری کا ایک نمونہ پیش کرنا ہے- جس کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ وہ حضرت
شاہ بو علی قلندر کے تارک ہونے کا بڑا سبب بنی-

سیاسی بحران کا اثر علماء اور مشائخ پر

یہ سیاسی بدحالی اور خود غرضی' خود پرستی کا بحران جس طرح ختم ہونے والے
بادشاہ اور اس کے خاندان کے لیے مصیبت ہوتا تھا وہ ان کے لیے بھی آزمائش بن
جاتا تھا جو عالم اور مفتی کہلاتے- یا مذہبی لحاظ سے عوام میں اثر و رسوخ رکھتے تھے
کیونکہ عوام کا رجحان مذہبی تھا- ہر ایک قاتل و سفاک بادشاہ اپنی خود غرضی

راستہ پر قدم بڑھاتا ہوا یہ چاہتا کہ کوئی مذہبی نشان بھی اس کے ہاتھ میں ہو جس
سے وہ اپنی اس سفاکی اور خونریزی کا جواز ثابت کر سکے اور اس طرح عوام کے ہجوم
کو اپنے ساتھ رکھ سکے-

وہ نام کے علماء جن کی نظر اپنے اقتدار' اپنے مفاد' شاہی وظیفہ اور جاگیر پر ہوتی
تھی' وہ پوری قابلیت صرف کر کے دریا کی تہ میں سے یہ کوڑی نکالتے تھے اور بادشاہ
جہاں پناہ کے لیے کوئی نشان فراہم کرتے تھے- لیکن حق پرست و خدا ترس علماء کے
لیے یہ مصیبت دوہری ہو جاتی تھی- ایک طرف بادشاہ کی ٹیڑھی ترچھی نگاہ' جو بسا
اوقات "برق خرمن سوز" کا کام کرتی تھی اور دوسری جانب شاہ پرست علماء کا
طعن و تشنیع جوان شکستہ دل علماءِ ربانی کے لیے تیر و نشتر سے بھی زیادہ تیز ہوتا تھا-

اس صورت حال کو سامنے رکھ کر جب حضرت قلندر صاحبؒ کی مثنوی
گنگنائی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے وہ اسی پس منظر کی ایک تصویر ہے اور "گفت آید در
حدیث دیگراں" میں حضرت قلندر صاحب نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے- جس کے
دل شکن اور ہوش ربا اثر نے حضرت قلندر صاحب کو ترک دنیا پر مجبور کیا تھا-

ان حالات نے معاشرہ اور سماجی زندگی پر کیا اثر ڈالا ہے- اور عوام کی حالت
کس درجہ تباہ ہے- اس کی تصویر ملاحظہ فرمائیے-

ارشاد ہے:

از جہاں مہر و وفا معدوم شد
حال مردم یک بیک معلوم شد

ترجمہ: محبت اور وفاداری دنیا سے معدوم ہو چکی ہے' لوگوں کی
حالت یک بیک معلوم ہو گئی ہے-

اے دریغا وضع نیکاں شد بدل
در دیار حکم افتادہ خلل!

ترجمہ: افسوس نیک لوگوں کی وضع بدل گئی- دنیائے عدل و

انصاف میں خلل پڑ گیا۔

تیغ مسک شجرہ احسان برید
ہم چو عنقا ہمت از عالم پرید

ترجمہ: بخیل کی تلوار نے حسن سلوک کے درخت کو کاٹ ڈالا۔ ہمت اور حوصلہ عالم سے ایسے ہی اڑ گیا۔ جیسے عنقاء کی جنس ضائع ہو گئی۔

ہمتے رفتست از شاہ و گدا
معماں گشتہ گدائے بے نوا

ترجمہ: شاہ اور گدا، دونوں سے ہمت اور حوصلہ کی جنس ضائع ہو گئی۔ دولت مند بھی گدائے بے نوا بن گئے۔

ہمتے برخاست از صاحبدلاں
دارم از دست زمانہ صد فغاں

ترجمہ: اہل دل اور روحانی لوگوں سے بھی ہمت مفقود ہو گئی۔ دست زمانہ سے سینکڑوں بار آہ و فغان حسرت و ماتم۔

رحم از دلہائے مردم شد نہاں
سختیے پیدا شدہ بر مرد ماں

ترجمہ: انسانوں کے دلوں سے رحم بھی پردہ پوش ہو گیا۔ لوگوں میں ایک قسم کی سختی پیدا ہو گئی ہے۔

خلق نیکو شد ز عالم ناپدید
طبع مردم سگ صفت گشتہ پلید

ترجمہ: اچھے اخلاق دنیا سے ناپید ہو گئے۔ آدمیوں کی طبیعت کتوں کی طرح پلید ہو گئی۔

یہ تو عوام کی حالت تھی۔ اب رہے خواص تو دولت مند امراء کی حالت یہ ہے:

نیست رحمے در دل اہل دول
شیوۂ اہل دول باشد و غل

ترجمہ: دولت مندوں کے دلوں میں رحم نہیں ہے۔ دولت مندوں کا طریقہ دھوکا اور مکر و فریب ہے۔

اہل دنیا بہر سیم و مال و زر
گر بدست آید خورند خون جگر

ترجمہ: دنیاداروں کی حالت یہ ہے کہ سونا چاندی اور مال کی خاطر اگر ہو سکے تو جگر کا خون بھی پی لیں۔

آں شنیدی کہ زبرائے عز و جاہ
بے گنہ کردند یوسف را چاہ

ترجمہ: تم نے سنا ہو گا کہ عزت اور جاہ کی خاطر حضرت یوسف علیہ السلام کو بلا کسی قصور کے کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔

از حسد بے رحمی اخواں ببیں
حال زار یوسف کنعاں ببیں

ترجمہ: حسد کے باعث بھائیوں کی آپس کی بے رحمی دیکھنا چاہو تو یوسف کنعان کا حال زار دیکھ لو۔

تاجدار بادشاہوں کی حالت ملاحظہ فرمائیے:

بر سرت باشد ترا گر تاج زر
کس نیاید از تکبر در نظر

ترجمہ: اگر تمہارے سر پر سونے کا تاج ہو تو تکبر کی یہ حالت ہو کہ کوئی بھی نظر میں نہ آئے۔

بلکہ رو تابی چو نمرود از خدا
گم کنی خود را نترسی از جزا

ترجمہ: بلکہ نمرود کی طرح خدا سے بھی منہ موڑ لو۔ اپنے آپ کو ایسا وارفتہ کر لو کہ خدا کا خوف دل سے نکل جائے۔

حرص افزوں می شود از مال و زر
قطع گردد حب فرزند و پدر

ترجمہ: مال و زر سے حرص میں اضافہ ہوتا ہے (یہاں تک کہ) بیٹے اور باپ کی محبت بھی ختم ہو جاتی ہے۔

ہیچ جا دیدے گدائے بے نوا
رو بگرداند چو فرعون از خدا

ترجمہ: اگر کسی جگہ کوئی گدائے بے نوا نظر پڑ جائے تو اس سے اس طرح منہ موڑ لیتا ہے۔ جیسے فرعون نے خدا سے منہ موڑ لیا تھا۔

ان تاجداروں کی سفاکی اور بربریت کی حالت ملاحظہ فرمایئے

بادشاہاں را ببیں کز بہر مال
خون اخوان و پدر دانند حلال

ترجمہ: بادشاہوں کو دیکھو کہ مال کی خاطر بھائیوں اور باپ کے خون کو بھی جائز اور حلال سمجھتے ہیں۔(۱)

۱۔ غالباً علاؤالدین خلجی کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ کڑہ مانک پور میں گنگا کے کنارے جلال الدین فیروز شاہ کے قتل کا واقعہ گذر چکا ہے۔ کہ علاؤالدین نے بغل گیر ہوتے ہوئے بغل میں خنجر رسید کر دیا تھا۔ بیشک اس کا سبب ایک وہ بھی تھا۔ جس کی طرف وہاں اشارہ کیا تھا۔ یعنی علاؤالدین کا شوق سلطنت اور گورنر کے بجائے بادشاہ بننے کا جذبہ۔۔ مگر مورخین نے اس کا سبب ایک اور بھی بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ علاؤالدین خلجی نے جنوبی ہند کی فتوحات میں بے شمار دولت حاصل کی تھی۔ سونے اور چاندی کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ بیچ موتی، زمرد، لعل اور یاقوت منوں کی مقدار میں وصول کیے تھے۔ مثلاً سات من زمرد۔ دس من موتی وغیرہ۔ اسلامی اصول کے مطابق یہ تمام مال غنیمت یکجا جمع ہوتا پھر اس کا ایک حصہ مجاہدین کو دیا جاتا۔ ایک حصہ فقراء اور مساکین کے لیے مخصوص ہوتا باقی بیت المال۔ یعنی قومی فنڈ میں محفوظ کیا جاتا۔ مگر یہ بادشاہ اسلامی اصول پر عمل پیرا نہیں تھے۔ اب علاؤالدین نے کچھ حصہ شاہی خزانہ کے لیے دہلی بھیج دیا۔ باقی سب اپنے پاس رکھ لیا۔ بادشاہ نے اصرار کے جانب بھی کوئی توجہ نہیں کی۔ آخر کار جلال الدین کو خیال ہوا کہ وہ خود علاؤالدین کے پاس جائے تو میرے جانے کا لحاظ کر کے وہ یہ دولت مجھے دیدے گا۔ مگر علاؤالدین نے بادشاہ کے اس حسن ظن کا یہ جواب دیا۔ کہ جب تک بادشاہ دہلی میں تھا اس کو اس طرح خوش آمدید کہا کہ بادشاہ نے اپنے ساتھ فوج لے جانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اور جب بغل گیر ہوا تو اس کا استقبال خنجر آبدار سے کیا۔ بس علاؤالدین (بھتیجے اور داماد) نے صرف دولت کو محفوظ رکھنے کی خاطر اپنے چچا اور خسر و مربی کا خاتمہ کیا۔ قلندر صاحب غالباً اسی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

حکومت اور معاشرہ یعنی راج اور سماج گویا دامن اور چولی ہیں۔ ایک کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے۔ بادشاہ اور امراء اگر عظمت و اقتدار، عیش و عشرت اور دولت و ثروت کے حریص ہوتے ہیں تو عوام میں بھی ان کی کمی نہیں ہوتی جو اپنے اپنے انداز میں عظمت و جاہ اور عیش و عشرت کے عاشق ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہوتا ہے کہ بادشاہوں اور ارکان دولت کے ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے۔ وہ اس کے بل بوتے پر اپنی آرزوئیں پوری کرتے ہیں یا ان آرزوں کی راہ میں فنا ہو جاتے ہیں۔ وہ عوام جن کے ہاتھ میں تلوار نہیں ہوتی یا سماجی نقطۂ نظر سے شمشیر بکف ہونا ان کے لیے ناروا ہوتا ہے وہ ان آرزوں اور غلط جذبات کی تکمیل کے لیے وہ راستے اختیار کرتے ہیں۔ جن کو مکر و فریب و دجل اور نمائش کہا جاتا ہے۔ یہی پست جذبات اور غلط آرزوئیں ہوتی ہیں۔ جو ایک ایسے شخص کو جو اپنے فطرت کے لحاظ سے ان عوام سے بھی کمتر ہوتا ہے۔ جن کو "کالانعام" کہا جاتا ہے۔ اس کو آمادہ کرتی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو صوفی شیخ طریقت اور عالم و فاضل کے روپ میں پیش کرے۔ تاکہ لوگ اس کی تعظیم کریں اور یہ عزت و احترام کی کرسی حاصل کر سکے۔ یہ درحقیقت بدترین اغراض پرست ہوتے ہیں جو اپنی حیثیت و فطرت کے برخلاف رنگ برنگ آئینوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ بادشاہوں کی نفس پرستی نے جس طرح معاشرہ اور سماج کو تباہ کیا تھا۔ اور تباہ شدہ سماج میں جس طرح یہ ہوا پرست نمائشی زاہد و صوفی نمودار ہوتے تھے اور اپنی اس نمائش کو حقیقت ظاہر کرنے کے لیے جو جو ہتھکنڈے وہ استعمال کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے قلندر صاحب کو ان تمام باتوں کا بارہا تجربہ ہوا تھا۔ اور جن چیزوں سے اکتا کر انہوں نے دنیا کو پس پشت ڈالا تھا۔ اس میں اس عنصر کثیف و خبیث کا بھی حصہ کافی تھا۔ اس پس منظر کے مطالعہ کے بعد مثنوی کے اشعار ملاحظہ فرمایئے:

فرماتے ہیں:

زہد و تقویٰ نیست ایں کز بہر خلق
صوفی باشی و پوشی کہنہ دلق

ترجمہ: زہد اور تقویٰ یہ نہیں ہے کہ مخلوق کی خاطر صوفی ہو اور پرانی گدڑی پہنو۔

شانہ و مسواک و تسبیح و ریا
جبہ و دستار و قلب بے صفا

ترجمہ: شانہ بھی ہو، مسواک اور نمائشی تسبیح بھی ہو، جبہ و دستار بھی ہو مگر دل اسی طرح گندہ اور آلودہ رہے۔

پیش و پس گردد مرید ناخلف
چوں خر ابلہ پے آب و علف

ترجمہ: آگے پیچھے نالائق مریدوں کا ہجوم ہو جس طرح خر ابلہ گھاس اور پانی کے لیے دوڑتے پھرتے ہیں۔

چوں بہ بینی چند کس بیہودہ گرد
خویش را گوئی منم مروا نہ مرد

ترجمہ: جب آگے پیچھے چند بیہودہ لوگوں کو دیکھو تو سمجھ لو کہ میں ہی مرد مرداں ہوں۔

دام اندازی برائے مرد و زن
خویش را گوئی منم شیخ زمن

ترجمہ: عورتوں اور مردوں کے لیے مکر کا جال بچھائے رکھو۔ اور یہ دعویٰ کرتے رہو کہ شیخ زمن میں ہی ہوں۔

وعظ گوئی خود نیاری در عمل
چشم پوشی ہچو شیطان دغل

ترجمہ: دوسروں کو وعظ اور خود عمل نہیں۔ معین و مکار شیطان کی طرح آنکھ بند کیے رہیں۔

مکر و تلبیس و ریا کارت بود
ہر نفس شیطاں ترا یارت بود

ترجمہ: مکر و تلبیس، نمود و نمائش تمہارا کام ہو۔ ہر دم شیطان تمہارا یار و مددگار ہے۔

خادماں گویند ایں شیخ زماں
چشم پوشیدہ است از خلق و جہاں

ترجمہ: خادم یہ شہرت دیں کہ یہ زمانہ بھر کے شیخ طریقت ہیں۔ ساری مخلوق اور سارے جہاں سے آنکھ بند کر رکھی ہے۔

ایں خوشامد گوئے چندیں ابلہاں
رہبر نانند، رہزن نانند، رہزناں

ترجمہ: یہ خوشامدی، بے وقوف، ڈاکو ہیں ڈاکو۔

از ستائش خویشتن را گم مکن
عیب خود بیں عیب بر مردم مکن

ترجمہ: ان کی تعریف سے اپنے آپ کو گم مت کر۔ اپنے عیبوں پر نظر رکھو دوسروں کے عیب نہ نکالو۔

خود بدہ انصاف اے اہل دغل
دل پرست از مکر و مصحف در بغل

ترجمہ: اے فریب خوردہ اگر ہو سکے تو خود انصاف کر۔ دل مکر سے بھرا ہوا ہے۔ اور قرآن شریف بغل میں ہے۔

صوفیم گوئی نداری سینہ صاف
از کرامتہاء خود شیخا ملاف

ترجمہ: دعویٰ ہے کہ میں صوفی ہوں اور سینہ صاف نہیں۔ شیخ

محترم مہربانی فرمایئے-اپنی کرامتوں کے دعوئی مت بگھاریئے-

می کنی طاعت تو از بہر ریا
گر نکردی سجدہ از بہر خدا

ترجمہ: تمہاری ساری عبادت ریا اور نمود کے لیے ہے-اگر خدا کے لیے سجدہ کی توفیق نہیں ہوئی-

نفس کافر کیش داری در کمیں
بہر شہرت مے نشینی اے لعیں

ترجمہ: دل کے کمیں گاہ میں وہ نفس ہے جو کافرانہ انداز رکھتا ہے-اے لعین و مردود تیری گوشہ نشینی بھی اسی غرض سے ہے کہ تارک دنیا مشہور ہو-

مے کشائی دست از بہر دعا
مزہ خواہی از عبادات ریا

ترجمہ: دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہو اور واقعہ یہ ہے کہ اس نمائشی عبادت کی اجرت بندوں سے وصول کرنا چاہتے ہو-

مے کنی از سکر عالم را مطیع
مے دہی تسکیں منم فردا شفیع

ترجمہ: مکر و فریب سے دنیا کو مطیع کرنا چاہتے ہو اور لوگوں کو اطمینان دلاتے ہو کہ فرداء قیامت کو میں سفارش کروں گا-

از تکبر می کنی ہر سو نظر
خویش را گوئی کہ ہستم باخبر

ترجمہ: ہر اطراف تکبر سے نظر ڈالتے ہو اور اپنے متعلق دعوئی کرتے ہو کہ میں باخبر ہوں-

بت پرستی مے کنی ہم بت گری
شد دلت رشک بتان آزری

ترجمہ: تم بت پرست بھی ہو اور بت گر بھی، تیرا دل بتان آزری کے لیے بھی باعث رشک ہے-

آرزو ہائے تو ہرگز کم نشد
قامت حرص و ہوایت خم نشد

ترجمہ: تیری آرزوئیں کبھی بھی کم نہیں ہوتیں- حرص و طمع کا قامت کبھی بھی خم نہیں ہوا-

تعجب ہوتا ہے آج ہر ایک نفس پرست اپنی نمائشی بدمستی اور آوارہ گردی کے لیے حضرت قلندر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پناہ تلاش کرتا ہے-اس کا پروپیگنڈہ یہ ہوتا ہے کہ معاذ اللہ حضرت بو علی شاہ قلندر بھی اسی کی طرح تھے اور یہ ٹھیک انہیں کے مانند اور انہیں کے نمونہ پر ہے-اور اس کے نقش قدم پر چل رہا ہے مگر یہ اشعار جو اوپر ذکر کیے گئے اور اس مضمون کے بہت سے اشعار جن سے مثنوی کے صفحات رنگین ہیں-ان کی کھلی ہوئی شہادت ہے-کہ حضرت قلندر اس مسخ شدہ قلندری سے بیزار ہیں-یہ بیزاری یہاں تک بڑھتی ہے کہ تہذیب کا دامن بھی دست قلندر سے چھوٹ جاتا ہے-

غور فرمایئے قلندر صاحب کس قدر برافروختہ ہیں-فرماتے ہیں:

نفس کافر تو بود ہمراہ تو
آتش دوزخ بود جانکاہ تو

ترجمہ: تیرا کافر نفس تیرے ہمراہ رہے تو آتش دوزخ تیرے لیے جانکاہ ہوگی-

گر تو مردی نفس کافر را بکش
درنداری دسترش بخشیں خمش

ترجمہ: اگر واقعی مرد ہے تو نفس کافر کو ختم کر۔ اگر اس کی طاقت نہیں ہے تو خاموش بیٹھو (شمع طریقت اور روحانی بزرگ ہونے کا دعویٰ مت کرو)

گر نداری ہمت مردان دین
چو زناں رو' در پس پردہ نشیں

ترجمہ: اگر تمہارے اندر مردان دیں جیسی ہمت نہیں ہے تو جاؤ اور عورتوں کی طرح پردہ کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔

گر زدست تو نیاید کار مرد
ہمچو ہیزاں در پس مرداں مگرد

ترجمہ: اگر تمہارے ہاتھ سے مردوں کے کام نہیں ہو سکتے تو ہیز اور زنخوں کی طرح مردوں کے پیچھے نہ گھومو۔

اے مخنث نے تو مردی نے تو زن
مثل شیطان راہ مرداں را مزن

ترجمہ: او مخنث نہ تو مرد ہے نہ عورت، تو اب شیطان کی طرح لوگوں کی راہ مت مار (ان کو گمراہ مت کر)

ان اشعار میں بھی اعتدال ہے۔ اب اور ملاحظہ فرمایئے:

چوں نداری شرم اے پیماں شکن
باز می خواہی مراد خویشتن

ترجمہ: او پیمان شکن بد عہد جب تیرے اندر شرم نہیں ہے تو پھر اپنی مراد پوری ہونے کی تمنا بھی نہ رکھ۔

عمر باخامی طمع سر می زنی
بلکہ از ابلیس ملعوں کمتری

ترجمہ: تمناء خام۔ میں اپنی عمر صرف کر رہے ہو بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تم ابلیس لعین سے بھی کمتر ہو۔

نفس بد کردار چوں تو سگ پلید
دست ایمانت بدنداں پس گزید

ترجمہ: تجھ جیسے ناپاک کتے کا نفس بد کردار (معاذ اللہ) تیرے ایمان کے ہاتھوں کو دانتوں سے کاٹ رہا ہے۔

شہوت و خواب خورش داری مدام
از عبادت کاہلی و ناتمام

ترجمہ: ہمیشہ ہمیشہ شہوت اور خواب و خور میں مصروف رہتے ہو اور جہاں تک عبادت کا تعلق ہے تو سراسر کاہلی اور سستی۔ اور جو کچھ عبادت ہوتی ہے وہ ناقص اور ناتمام۔

جہل خر داری تو اے بیہودہ گرد
آنچہ تو کردی گہے شیطاں نہ کرد

ترجمہ: گدھوں جیسی جہالت کا تو مالک ہے۔ ایسے آوارہ گرد جو کچھ تو کر رہا ہے کبھی شیطان نے بھی ایسا نہیں کیا۔

یافت تعلیم از تو شیطاں مکر و ریو
از تو آموزند بازی طفل و دیو

ترجمہ: تجھ سے شیطان نے مکر و ریا کی تعلیم پائی ہے۔ شریر لڑکے اور دیو تجھ سے تعلیم پاتے ہیں۔

بہر لقمہ اے سگ مردار خو
مے دوی صحرا بصحرا کو بکو

ترجمہ: اے مردار طبیعت کتے تو لقمہ کے لیے دوڑتا ہے۔ صحرا بصحرا کوچہ بکوچہ۔

خوار می گردی زبہر آب و نان
در پے سگ تابکے باشی دواں

ترجمہ: تو روٹی اور پانی کے لیے ذلیل پھرتا ہے۔ آخر کب تک دنیا کے کتوں کے پیچھے دوڑتا رہے گا۔

دین وایمان کے حق میں اندرونی خطرات

حفاظت کی صورتیں اور لائحہ عمل

چودھویں صدی ہجری کے لیل و نہار اس حالت میں گذر رہے ہیں کہ مسلمان سخت ابتلاء آزمائش میں ہیں۔ اور اسلام بدخواہوں اور مخالفین کے نرغہ میں گھرا ہوا ہے۔ لیکن حضرت قلندر صاحبؒ اور ان کے معاصرین کا دور جس کے کچھ اجمالی حالات پچھلے صفحات میں لکھے گئے ہیں۔ دین وایمان کے لحاظ سے وہ بھی اسی طرح خطرات کے نرغہ میں تھا۔ اہل ایمان اس وقت بھی ابتلاء و آزمائش میں تھے۔

چھٹی صدی ہجری کے تقریباً وسط میں فتنہ تاتار برپا ہو چکا تھا۔ جس نے دار الخلافہ بغداد تباہ کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۶ لاکھ مسلمان تہ تیغ کیے گئے اور جہاں تک اسلامی تہذیب سے عداوت کا تعلق ہے تو مساجد اور مدارس سے گذر کر لائبریریوں اور کتب خانوں تک کو برباد کیا گیا۔ علوم وفنون کی کتابیں دریائے دجلہ میں بہادی گئیں۔ یہاں تک کہ عرصہ تک دریائے دجلہ کا پانی سیاہ ہوتا رہا۔

بے شک یہ اسلام کا اعجاز تھا کہ تھوڑے ہی دنوں بعد اس نے دشمنوں کو دوست بنا لیا اور جو اسلام کو مٹانے آئے تھے وہ خود اسلام کے لیے مٹنے لگے۔ مگر جہاں تک سیاست کا تعلق ہے اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی یعنی وہی ملوکیت جو مٹنے والوں کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ اس کا سرطان ان نو فرمانرواؤں کے رگ وریشہ کو بھی اسی طرح مسموم بنائے ہوئے تھا۔ تاج کے لیے برادر کشی، نسل کشی اور قتل و خون کی گرم بازاری اب بھی اسی طرح رہی اور یہ اژدہا اب بھی اسی طرح خاندان شاہ کے جگر پاروں کو ڈستا رہا۔ اولوالعزم صاحب حوصلہ علماء اور مشائخ جنہوں نے اپنے اخلاقی اور روحانی کمال سے سرکش کافروں کو یہاں تک مسخر کیا تھا کہ وہ فاتح اسلام ہونے کے

مفتوح اسلام بن گئے تھے۔ انہوں نے سیاست کی اس دہکتی ہوئی بھٹی کے قریب جانا پسند نہیں کیا۔ کیونکہ اس دور میں سیاست اور ملوکیت کچھ اس طرح جکڑبند تھیں کہ ممکن نہیں تھا کہ سیاست کے بحر محیط میں غرق ہونے کے بعد کسی شخص کا دامن ملوکیت کی آلائش سے پاک رہ سکے۔ ان حامیان ملت اور ہمدردان دین کے لیے سب سے زیادہ قلق اور صدمہ کی بات یہ تھی کہ ملوکیت کے یہ وحشیانہ مظاہرے جو بسا اوقات اسلام کے نام پر ورنہ کم از کم ان کی طرف سے ہوتے تھے جن کی زبان پر حمایت اسلام کے دعوے اور جن کے خطابات میں اس مفہوم کے الفاظ شامل ہوتے تھے وہ کسی غیر مسلم کو اسلام کی طرف مائل تو کیا کرتے اسلام سے متنفر بناتے رہتے تھے۔ اسلام مذہب رحمت ہے وہ جبر واکراہ برداشت نہیں کرتا۔ اس کی نظر میں زبانی اقرار کی کوئی اہمیت نہیں جب تک ضمیر کی آواز اس کی تائید نہ کرے اور تسلیم ورضا اس کی پشت پر نہ ہو۔

وہ صرف یہی اعلان نہیں کرتا کہ دین اور دھرم کے بارے میں کسی زور زبردستی اور جبر واکراہ کی قطعاً گنجائش نہیں (لا اکراہ فی الدین) بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جو لوگ دھرم اور دین کے بارے میں جبر واکراہ کو کام میں لائیں ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ یہ فتنہ ختم ہو' اور لوگوں کے دلوں کو یہ آزادی نصیب ہو کہ وہ دین کو کسی غلبہ تسلط یا کسی اقتدار کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی آزادانہ مرضی کے ساتھ خالص اللہ کے لیے اختیار کر سکیں۔

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنه ویکون الدین کله
لله (سورہ انفال)

ترجمہ: ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ نہ رہے فساد اور ہو جائے پورا دین اللہ کے لیے۔

پس اس دور میں اگرچہ ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ میں سیاسی اقتدار مسلمانوں کو حاصل رہا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ایمان واسلام اب بھی نرغہ ہی میں تھا اور مومنین باخلاص کے لیے یہ دور بھی ابتلاء و آزمائش کا دور تھا۔ ہاں یہ فرق ضرور ہے

کہ آج یعنی چودھویں صدی ہجری میں ابتلاء آزمائش کے بیشتر اسباب خارجی ہیں اور اس دور میں یہ ابتلاء و آزمائش زیادہ تر ان کی وجہ سے تھا جو خود بھی حامیان اسلام اور ظل اللہ کہلاتے تھے۔

نشان راہ

قرآن حکیم میں رب العالمین نے بڑی پختگی سے فرمایا ہے:

"والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا۔"

(جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدے کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کرتے رہتے ہیں۔)

چنانچہ مجاہدہ حق کے ولولہ صادق نے علماء ربانی اور مشائخ حق پرست کی رہنمائی کی۔ اور انہوں نے وہ راستہ اختیار کیا جس کے نتیجہ میں اسلام کی کشتی ڈوبنے کے بجائے ساحل مراد تک پہونچتی رہی اور کامیاب ہوتی رہی۔

تبلیغ و اشاعت کا لائحہ عمل

مسلک عشق و محبت کا پرچار۔ استقامت کے ساتھ رواداری

اسلام' اپنی انسانیت نوازی اور رحم پروری کے باعث اس کی گنجائش رکھتا ہے کہ اس کو عشق و محبت کا مذہب قرار دیا جاسکے۔ ان مجاہدین فی سبیل اللہ اور کشتگان خنجر تسلیم نے اس گنجائش سے فائدہ اٹھایا اور عشق و محبت کو اپنا مذہب بنادیا۔

ان کے فکر و عمل کی بنیاد دو باتوں پر تھی۔ اول یہ آیت کریمہ۔

الذین امنوا اشد حبا لله۔

اہل ایمان اللہ کی محبت (عشق مولیٰ) میں سب سے بڑھے ہوئے ہیں۔

دوم۔ یہ حدیث مقدس:

الخلق عیال الله۔

(مخلوق خدا اللہ کا کنبہ ہے)

لائحہ عمل

اللہ تعالیٰ سے عشق و محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی رضاجوئی اور اطاعت و فرماں برداری کے لیے وہی راستہ اختیار کیا جائے جس کو اس نے "صراط مستقیم" قرار دیا ہے۔ اور جس کو تمام محبان خدا کا راستہ بتایا ہے۔ لیکن یہ صراط مستقیم تنگ و تاریک نہیں ہے۔ وہ کھلے ہوئے میدانوں سے گذرتا ہے۔ اس کی فضا پر کیف اور خوشگوار ہے۔ وہ "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو۔" کی لائنوں پر ہموار کیا گیا ہے۔ اس کے بانی نے اعلان کردیا۔

لکل وجهة هو مولیها (سورہ بقرہ)

(ہر ایک کے لیے ایک طرف (ایک رخ) ہے کہ وہ منہ کرتا ہے اس طرف' تمہارا کام یہ ہے کہ نیک کاموں میں سبقت

کرو- اور آگے بڑھو)

لکل جعلنا منکم شرعة ومنهاجا- (سورہ مائدہ)

(ہر ایک کے لیے مقرر کر دیا ہے- ہم نے ایک دستور اور مقرر کر دی ہے ایک راہ)

لکل امة جعلنا منسکا هم ناسکوہ (سورہ حج)

(ہر ایک فرقہ کی ٹھہرا دی ہم نے ایک راہ بندگی کی- کہ وہ اسی طرح کرتے ہیں بندگی)

بہر حال یہ تین بنیادیں تھیں- جن پر ان بندگان حق پرست کے فکر و عمل کی تعمیر ہوئی تھی- یعنی (۱) اللہ سے محبت اور عشق مولیٰ (۲) بندگان خدا سے محبت اور خلق خدا کی ہمدردی (۳) روا داری اور دوسری ملتوں کے لیے فراخی حوصلہ-

اس کی مثال حضرت سلطان الاولیاء محبوب ربانی نظام الدین (بدایونی ثم الدہلوی) کا وہ مشہور واقعہ ہے کہ آپ نے ایک برہمن کو دیکھا کہ وہ بھی اس کی پوجا کر رہا ہے- جس کی محبت میں سلطان الاولیاء کا دل پرسوز ہے' تو غیض و غضب اشتعال کے بجائے آپ کی زبان مبارک پر برجستہ یہ مصرع موزوں ہو گیا-

ہر قوم راست راہے

دینے و قبلہ گاہے

(ہر قوم کے لیے ایک راہ ہے' ایک دین ہے اور ایک قبلہ گاہ ہے)

قرآن حکیم کی آیت ولکل جعلنا منکم شرعة ومنهاجا- کی اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے-

بیشک عشق و محبت اور رواداری کے نام پر غلطیاں بھی ہوئیں- کسی نے محبت کے بہانے بے قیدی اور آوارگی کو قلندری قرار دے لیا- کسی نے سرود کا نام چشتیت رکھ لیا- کبھی رواداری کو مداہنت کی حد تک پہنچا دیا گیا- اور بھی ہوا کہ عشق و محبت کے دائرہ کو (معاذ اللہ) نفس پرستی کی سرحد سے ملا مگر جس حقیقت کا انکار ممکن نہیں ہے وہ یہ ہے کہ وہ پیغام جو حضرت خاتم الم

محبوب رب العالمین' رحمۃ اللعالمین ﷺ کو بعثت مبارکہ کا مقصد تھا- اس دور میں انہیں محبت کے متوالوں کے ذریعہ بندگان خدا تک پہونچا- اور وہ یقیناً ان لاکھوں مجروح دلوں کے لیے مرہم شفاء بنا جو ملوکانہ اقتدار کی جبروتیت و قہاریت سے مجروح تھے- ۱۹۴۷ء کی مثال ہمارے سامنے ہے وہ لاکھوں مسلمان جو تقسیم ہند اور تبادلہ آبادی کے قیامت خیز ہنگاموں کا تختہ مشق بنے تھے- وہ گاندھی جی کے فدائی اور جانثار بن گئے کیونکہ گاندھی جی نے اپنی ہمدردیوں اور میٹھے بول سے ان کے زخمی دلوں پر اطمینان کا مرہم رکھا تھا-

یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ فرید الدین عطار (متوفی ۶۲۷ھ) شمس تبریز (م ۶۴۵ھ) مولانا روم (م ۶۷۲ھ) اور امیر خسرو (م ۷۲۵ء) خواجہ اجمیری (م ۶۳۳ھ) خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (م ۶۶۱ھ) فرید الدین گنج شکر (م ۶۶۴ھ) مولانا حمید الدین صوفی (م ۶۷۳ھ) حسام الدین بدایونی (م ۶۸۷ھ) علاؤ الدین صابر کلیری (م ۶۹۰ھ) نظام الملۃ والدین بدایونی ثم الدہلوی (م ۷۲۵ھ) جیسے بزرگ جتنے بھی ہیں- وہ مے کدہ عشق و محبت کے ساقی بنے ہوئے ہیں- تو یقین جانئے "یہ بے خودی بے سبب نہیں غالب" یعنی محض جذبات اور بے مغز ہاؤ ہو نہیں ہے- بلکہ ایک مقصد ہے اور ایک پروگرام ہے جس پر نہایت پختگی اور ہوش مندی سے عمل ہو رہا ہے- "دیوانہ بکار خویشتن ہوشیار-"

حضرت قلندر صاحب اور مسلک عشق

یہ تو حدیث دیگراں تھیں- اب خود قلندر صاحب کی سنئے یہ کس طرح عشق کو جوہر حیات اور دین و دنیا کی متاع بے بہا قرار دیتے ہیں- اور کس طرح ان کی تمنا ہے کہ سوز عشق دم بدم بڑھتا ہے اور پروانہ کی طرح تن من نظر سوز ہوتا ہے-

ہر دے کز عشق جانے یافتہ

تا ابد روح روانے یافتہ

جس دل نے عشق سے زندگی حاصل کر لی- اس نے ابد تک روح رواں

حاصل کرلی۔

بر دل ہر کس کہ نور عشق تافت
خویش را با جان جاناں زندہ یافت

جس شخص کے دل پر عشق کا نور درخشاں ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو جان جاناں (معشوق حقیقی) کے ساتھ زندہ پاتا ہے۔

دل کہ بر دلبر رسد از ساز عشق
جان کہ بر جاناں دہد آواز عشق

دل تو وہی ہے جو عشق کی ساز سے دلبر تک پہنچ جائے جان وہی ہے جو جاناں کو عشق کا پیغام دے۔

دلربا بر دلبرے عشقت دہد
عشق کو تا جامہ ہستی در دہد

دل ربا (معشوق) تمہارے اندر دلبر کا عشق پیدا کرتا ہے وہ عشق جو جامہ ہستی کو چاک کر ڈالتا ہے۔

عشق کو بے بال و پر طیران کند
عشق کو در لامکاں جولاں کند

عشق۔ وہ عشق جو بال و پر کے بغیر پرواز کرتا ہے۔ وہ عشق جو لامکان میں جولانی کرتا ہے۔

عشق کو تا تاج سلطانی نہد
عشق کو ملک سلیمانی نہد

ہاں عشق کی ضرورت ہے تاکہ تمہیں بادشاہت کا تاج میسر آجائے ہاں وہ عشق جو حضرت سلیمانؑ کی وسیع ترین مملکت

بخش دیتا ہے۔

عشق کو تا چشم دل بینا کند
عشق کو تا سینہ پر سودا کند

وہ عشق درکار ہے جو دل کی آنکھ کو بینا بنادے۔ ہاں عشق کی ضرورت ہے تاکہ سینہ سودا سے لبریز ہو جائے۔

عشق کو تا عقل را حاصل کند
عشق کو تا عقل را حاصل کند

ہاں وہ عشق چاہیے جس کے آتے ہی عقل زائل ہو جاتی ہے۔ ہاں عشق کی ضرورت ہے تاکہ عقل اور سمجھ میسر آجائے۔

عشق ایک لازوال دولت ہے۔ کیونکہ وہ حسن لازوال کا پرتو ہے جب تک اصل باقی ہے یہ پرتو بھی باقی ہے۔

ہیچ می دانی کہ اصل عشق چیست
عشق را از حسن جاناں زندگی ست

تمہیں کچھ خبر ہے۔ عشق کی اصل بنیاد کیا ہے۔ عشق کی اصل بنیاد حسن جاناں ہے اسی سے اس کی زندگی ہے۔

حسن جاناں چو نظر در خویش کرد
گشت شیدا عشق را در پیش کرد

حسن جاناں نے جب خود اپنے اوپر نظر کی۔ تو وہ خورشید اور مفتون ہو گیا۔ اور عشق کا عنوان سامنے کر دیا۔

کشتگان عشق را جان دگر
ہر زماں از غیب احسان دگر

بس جب کہ عشق خود حسن اور حسن خود عشق ہے تو جو عشق کے شہید
ہیں انہیں ایک دوسری ہر زماں اور ایک نئی خوبی ہر وقت میسر آتی ہے۔
لہٰذا فراست و بصیرت کی بات یہ ہے کہ :

ار توانی اے دلاور عشق کوش
ایں حکایت راز عاشق دار گوش

اے دل۔ اگر طاقت اور امکان ہے تو عشق کے لیے کوشش کرتا رہ
اور عاشق کی طرف یہ بات کان میں ڈالے رکھو کہ ۔

اے خنک جانے کہ خود را باختہ
سوختہ خود را د باحق ساختہ

وہ جان کس قدر اچھی اور مبارک ہے جس نے خود اپنی بازی لگادی اپنے
آپ کو مبتلاءِ سوز کیا اور حق کے ساتھ ساز کر لیا۔

ہمت پروانہ بیں اے بے خبر
سوز چوں پروانہ تایابی خبر

پروانہ کے حوصلہ کو دیکھ۔ اے نادان بس تم بھی پروانہ کی طرح بھسم ہو
جاؤ تب تم کو محبوب کا پتہ لے گا۔

در محبت تانسوزی بال و پر
کے شوی ہمرنگ آتش سر بسر

جب تک محبت میں اپنے بال و پر نہ جلا ڈالو گے۔ سر سے پاؤں تک آگ
کے ہمرنگ کس طرح ہو سکتے ہو۔
مثنوی کا تقریباً ایک تہائی حصہ اسی قسم کے اشعار سے رنگین ہے۔ اس کے
علاوہ اسی مضمون کی بہت سی غزلیں آپ کے دیوان ہیں۔ جو حضرت قلندر صاحب

کے مسلک عشق کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ مسلک عشق کا عکس خلق خدا پر لطف و رحم
اور ہمدردی و غم خواری کی صورت میں نمودار ہوتا تھا۔ یہی قلندری کا جوہر ہوتا
تھا۔ اور تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں یہ حضرات اسی جوہر سے کام لیتے تھے۔

ایک سوال اور جواب

مسلک عشق کی دعوت دیتے ہوئے قلندر صاحب نے عشق کی جو خوبیاں
بیان کی ہیں۔ ان کا نچوڑ یہ دو شعر ہیں ۔

ہمت پروانہ بیں اے بے خبر
سوز چوں پروانہ تایابی خبر
در محبت تانسوزی بال و پر
کے شوی ہم رنگ آتش سر بسر

ترجمہ: ارے بے خبر پروانہ کی ہمت دیکھ، اگر تم باخبر ہونا چاہتے ہو تو
پروانہ کی طرح جل جاؤ۔ محبت میں جب تک اپنے بال اور پر نہیں جلالو
گے۔ تو پوری طرح آگ کے ہمرنگ کب ہو سکو گے۔"

ہم رنگی کیا ہے؟

یہ شعر جس طرح وجد آفریں اور کیف آور ہیں وہ ایک سوال کی تلقین بھی
کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک پاک باطن جو اللہ تعالیٰ سے عشق و محبت کا دعویٰ
کرتا ہے۔ وہ اگر اسی سوز و گداز میں پروانہ کی طرح بال و پر جلا کر ہم رنگ محبوب ہو
جائے تو وہ ہم رنگی کیا ہوگی۔ آیا اللہ تعالیٰ کی طرح معبود و مسجود ہو جائے گا۔ اور جس
طرح اللہ تعالیٰ احکام شریعت سے بلند و بالا تر ہے۔ نماز روزہ وغیرہ کے احکام اس
پر نافذ نہیں ہوتے یہ بھی شرعی تکلیفات سے آزاد ہو جائے گا۔ اور معاذ اللہ "انا
الحق" جیسا دعویٰ اس کے لیے درست ہو گا۔؟
اس میں شک نہیں کہ ہوا پرستوں اور ملحدوں نے ہم رنگی کے یہی معنی لیے

ہیں- اور اسی کو وہ شان قلندری سمجھتے ہیں- چنانچہ خود حضرت قلندر صاحب کے ان سوانح نگاروں نے جو ہفوات اور خرافات کو سوانح قرار دیتے ہیں- ان میں یہ قابلیت تو نہیں ہے کہ فلسفی اور منطقی طور پر کوئی بات سمجھ سکیں یا سمجھا سکیں- مگر جو بے سر دپا' لغو باتیں وہ نقل کرتے ہیں- غور کیا جائے تو ان کی بنیاد یہی تصور باطل ہوتا ہے-

چنانچہ حکمت نامہ یا حکم نامہ جو قلندر صاحب کی طرف منسوب ہے- جس کو حضرت مولانا عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ نے "از اختراعات عوام" قرار دیا ہے اس میں تحریر ہے کہ:

"محرم الحرام کی بیس تھی کہ موذنوں نے صبح کی اذان دی- نماز کی تیاری ہونے لگی- مولانا سراج الدین صاحب رکوعی نے اس فقیر سے (قلندر صاحب سے) کہا- سنتوں کا وقت ہے- میں نے ان سے کہا کہ ہاں تکبیر پڑھوایئے تاکہ فرض ادا کر لوں- جب فرض پڑھ چلے تو جتنے درویش اور علماء وہاں موجود تھے وہ سب اس درویش کے پاس آئے- اور عرض کیا- حضرت مخدوم! ایک بات نہایت ادب سے عرض کرنی ہے- جناب نے نماز صبح کی سنتیں کیوں نہیں پڑھیں؟

اس درویش (قلندر صاحب) نے جواب دیا-

"فرمان خواجہ کائنات سرور موجودات' رحمت عالمیان وصفوت آدمیان و تتمہ دور زمان احمد مجتبٰی و محمد مصطفٰی ﷺ بر ایں درویش ہم چنیں ست کہ اے شرف سنت خود بخشیدم-"

یعنی آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی اس احقر کے لیے یہی ہے کہ اے شرف اپنی سنت میں نے تم کو بخش دیں-

اس کے بعد چالیس سال تک صرف فرض پڑھتا رہا- کہ حضرت ذوالجلال کا فرمان اس درویش کو پہونچا کہ

"اے درویش تو ازاں مائی و من ازاں تو- فریضہ خود بتو بخشیدم-"

"یعنی اے درویش جبکہ تو میں ہے اور میں تو ہوں- لہٰذا میں نے اپنا فرض تجھ کو بخش دیا-"

میں نے جیسے ہی یہ فرمان خداوندی سنا سر زمین پر رکھا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا- پھر تمام درویش اور علماء جیسے "میر سید علی مفتی" اور ان جیسے علماء رحمہم اللہ- ان حضرات نے اعتراضات کیے- میں نے جوابات دیئے-

اس کے بعد حکم نامہ میں ہے کہ قلندر صاحب نے یہ بھی فرمایا- کہ "میرا درجہ علم و فضل میں اتنا بلند تھا کہ کسی کو میرے سامنے دم مارنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی-" (حکم نامہ)

نماز کی معافی کوئی معمولی بات نہیں' جس کو شرف المناقب نظر انداز کر دیتے- لہٰذا آپ نے بھی اس منقبت کو ذکر فرمایا ہے- مگر اس کی نوعیت دوسری ہے- مولانا ضیاء الدین سیاحی عرف علی مفتی یا میر سید علی مفتی' کا واقعہ "پچھوا" کے تراشنے کے بارے میں پہلے گزر چکا ہے- اسی افسانہ کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے کہ مفتی نے آنحضرت (قلندر صاحب) کو نماز کی ہدایت اور تاکید کی-"

حضرت قلندر صاحب نے فرمایا "نماز بارگاہ الٰہی سے معاف ہو چکی ہے-" مفتی نے کہا: پیغمبر خدا ﷺ سے نماز معاف نہیں ہوئی- تم سے کسی طرح معاف ہو گی-؟

قلندر صاحب: میں خود اپنے اختیار میں نہیں ہوں- مست حالت ہوں دکھاوے کی نماز میں نہیں جانتا- نماز دوسرے کا حق ہے-

مفتی نے کہا: اس معاملہ میں حیلہ نہیں چل سکتا-

مفتی صاحب کا یہ جواب سن کر حضرت قلندر صاحب کو جوش

آ گیا- فرمایا مفتی صاحب اٹھئے کمر بند سنبھالیے اور فقیر کے اس کمر بند سے کمر مضبوط باندھ دیجئے- اگر کمر بندھی رہے تو مجھ پر فرمان شریعت نافذ کیجئے- اور بندھی نہ رہے تو مجھے معاف قرار دیجئے-

مفتی صاحب اٹھے انہوں نے کمر بند کسنا چاہا- مگر جب بھی وہ کمر بند کسنا چاہتے تھے- کمر بند مفتی صاحب کے ہاتھ میں رہ جاتا تھا- اور قلندر صاحب اسی طرح "آزاد از کمر بند ایستادہ ماند" (کمر بند سے آزاد کھڑے رہتے تھے) آخر کار مفتی صاحب شرمندہ ہوئے- پھر بہت کچھ رد و بدل کے بعد حضرت قلندر صاحب "شان جمالی میں آئے تو آپ نے فرمایا' مفتی ضیاء دین میں عاشق ہوں- اور اپنے عشق میں مبتلا ہوں- آپ اٹھئے فرض ادا کیجئے میں بھی فرضوں میں شامل ہو جاؤں گا- چنانچہ تکبیر پڑھی گئی مفتی صاحب امام بنے- نماز پڑھنی شروع کی- جب حضرت مفتی صاحب نے قرات پڑھنی شروع کی تو قلندر صاحب بھی نماز میں شامل ہو گئے- مگر فوراً استغراقی کیفیت طاری ہو گئی- امام صاحب نے رکوع سجدہ وغیرہ سب کچھ کیا- تمام رکعتیں پڑھ کر سلام پھیرا- مگر قلندر صاحب اسی طرح سر جھکائے کھڑے رہے- جب مفتی صاحب نماز سے فارغ ہوئے دیکھا کہ قلندر صاحب اسی طرح سر جھکائے کھڑے ہیں-

مفتی صاحب نے عرض کیا- "حضرت کیسے کھڑے ہیں-" قلندر صاحب نے سر اٹھایا اور فرمایا- میاں مفتی ضیاء الدین-

انکی کہاتی کرد دکھاوے
یہ نماز شرفا نہیں بھاوے

حاضرین نے قلندر صاحب سے عرض کیا- کہ حضرت کا ارشاد سمجھ میں نہیں آیا- قلندر صاحب نے فرمایا:

"لا صلوة الا بحضور القلب" (جب تک دل حاضر نہ ہو نماز نہیں ہوتی) حاضرین نے عرض کیا کہ بات اب بھی سمجھ میں نہیں آئی- کچھ وضاحت فرمایئے:

حضرت قلندر صاحب: بات یہ ہے کہ مفتی صاحب کے یہاں گھوڑی کے بچہ ہوا ہے- مفتی صاحب کے مکان میں ایک کھاتی بھی ہے (یعنی چاہ گندم جس میں گندم حفاظت کے لیے بھر دیئے جاتے ہیں) مفتی صاحب نماز پڑھا رہے تھے اور ان کا دل ان کے مکان پر تھا کہ بچھیرا (گھوڑی کا بچہ) کھاتی میں نہ گر جائے- پھر قلندر صاحب نے فرمایا:

"عاشقم گاہے در جوش و خروش وگاہے بندہ شوم جز عشق ہیچ ندانم"

(میں عاشق ہوں- کبھی جوش و خروش میں رہتا ہوں اور کبھی بندۂ نیاز مند بن جاتا ہوں- عشق کے سوا میں کچھ نہیں جانتا)

آں عاشق الٰہی یعنی قلندر صاحب کی یہ حالت دیکھ کر مفتی صاحب شرمندہ ہوئے-

بہر حال صاحب شرف المناقب کی نظر اس گہرائی تک نہیں پہونچی- آپ ے صرف ایک قصہ نقل کر دیا- البتہ مکالمہ کی عبارت میں اس نظریہ کو پیش کر دیا ہے- جو بے دین مصنوعی قلندروں کا نظریہ بن جاتا ہے- یعنی یہ دعویٰ کہ ہمارا اق اللہ تعالیٰ سے یہ ہے کہ "من تو شدم تو من شدی-" معاذ اللہ جب تصور یا ا ہوئی یہ ہو کہ "اللہ بندہ بن گیا اور بندہ اللہ" تو عبادت کس کی اور سجدہ کس کو- (معاذ اللہ)

صاحب مکالمہ نے ہم رنگی کا مطلب یہی لیا- مگر ان کج فہم مصنوعی قلندروں

نے یہ نہیں خیال کیا کہ آنحضرت ﷺ کو سنتیں معاف کرنے کا حق کہاں سے ملا۔ کیا سنتوں کے وقت معبود آنحضرت ﷺ کو مانا جاتا ہے۔ کیا کسی بھی نمازی کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ فرض نماز کا سجدہ تو اللہ کو کیا جاتا ہے اور سنتوں کا سجدہ محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے ہوتا ہے۔

اگر آنحضرت ﷺ بھی معبود و مسجود ہوں اور سنتوں کا رکوع سجدہ محمد رسول اللہ ﷺ کو کیا جاتا ہو۔ تب تو یہ ہو سکتا ہے کہ معبود نے اپنا حق معاف کر دیا۔

لیکن جب مسجود و معبود ہر نماز میں اللہ ہی ہے اور سنت اور فرض کا فرق صرف یہ ہے کہ فرض کی فرضیت دلیل قطعی سے ثابت ہے۔ اس پر عمل کرنا فرض ترک کرنا گناہ کبیرہ اور اس سے انکار کرنا کفر ہے اور سنتوں کا ثبوت اس درجہ قطعی نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر ان کے ایک دو مرتبہ ترک سے گناہ کبیرہ نہیں ہوتا۔

اگر کوئی انکار کر بیٹھے تو اس پر کفر کا فتویٰ بھی نافذ نہیں کیا جاتا۔ بالفاظ دیگر فرق یہ ہے کہ فرض کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس کا انکار کر دینا کفر ہے۔ یہ اہمیت سنتوں کو حاصل نہیں ہے۔ اصل نماز یا اصل روزہ وہ ہے جو فرض ہے۔ اور مسنون نماز یا مسنون یا مستحب روزہ اس کے لیے تکملہ اور تتمہ ہیں۔ باقی معبود دونوں میں ایک ہی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ۔ تو پھر رسول اللہ ﷺ کی کیا مجال کہ وہ سنتیں کسی کو بخش دیں۔

باقی عام طور پر نیت کے وقت جو کہا جاتا ہے "سنت رسول اللہ ﷺ کی" اول تو یہ بھی عوام کی بات ہے۔ محقق علماء زبان سے نیت کرنے کو کوئی حیثیت ہی نہیں دیتے۔ کیونکہ نیت دل کے ارادہ کو کہتے ہیں۔ لہٰذا نیت کے وقت دل کا مائل ہونا اور توجہ کا جم جانا ضروری ہے۔ زبان سے ادا کرنا ضروری بھی نہیں۔ اگر زبان سے الفاظ ادا کر دیئے اور دل اور باتوں میں مشغول رہا۔ اس کا نماز کا خیال بھی نہ آیا تو نہ وہ نیت درست ہو گی۔ اور نہ وہ نماز قابل التفات ہو گی۔

علاوہ ازیں مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس اہمیت کے ساتھ من جانب اللہ فرض کا حکم ہے۔ وہ اہمیت اس کو حاصل نہیں جو سنت ہے۔ یہ صرف آنحضرت ﷺ کا قائم کیا ہوا طریقہ ہے جس کو آپ نے اس لیے کیا تاکہ فرضوں کے رونے زیادہ

چمک دمک زیادہ ہو جائے۔ اور اگر کچھ خامی تھی تو اس کی تلافی ہو جائے۔

بہر حال یہ تصور کہ سنت نماز کے معبود رسول اللہ ﷺ ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک عامی کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ چہ جائیکہ شرف الدین بو علی شاہ جیسا عالم و فاضل جس کے سامنے زمانہ کے علماء اور فضلاء کو دم مارنے کی ہمت و جرأت نہ ہوتی تھی۔ ایسا غلط خیال قائم کرے اور اس کو ضبط تحریر میں لائے۔

پھر یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اولیاء اللہ کے کشف کی حیثیت یہ ہرگز نہیں کہ وہ اس فرض کو ساقط کر دے۔ جس کو اللہ تعالیٰ کی وحی نے لازم کیا ہے۔ یہ تو اصولی بحث ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ یہاں تو قابل توجہ یہ ہے۔ کہ اگر ان واقعات کو کچھ بھی اہمیت دی جاتی ہے تو خود ان میں تضاد موجود ہے۔

سوانح نگاروں کے بیان میں تعارض اور تضاد

ایک طرف یہ عذر کہ میں "مست الست ہوں میں اپنے اختیار میں نہیں۔ پھر یہ دعویٰ کہ خدا نے فرض معاف کیے تو میں نے سجدہ شکر ادا کیا۔۔۔۔ اگر یہ صحیح ہے کہ معافی باضابطہ ہوئی ہے تو مستی کے عذر کے کیا معنی ؟

ہاں اس سلسلہ میں اگر کوئی بات صحیح ہے تو وہ صرف وہ واقعہ جس کو صاحب "شرف المناقب" نے خاتمہ کتاب کے قریب بیان کیا ہے۔ اور تعجب ہے مصنف کو یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ واقعہ "میر سید علی مفتی" کے واقعہ کی تردید کرتا ہے۔ مصنف شرف المناقب تحریر فرماتے ہیں :

نقل ہے کہ عاشق الٰہی (حضرت قلندر صاحب) "شمس الدین ایک بادشاہ دہلی" کے عہد میں (زمانہ حکومت میں) سیر کرتے ہوئے اپنے والدین کی زیارت کے لیے پانی پت تشریف لے آئے۔ والدین کی زیارت سے مشرف ہونے کے بعد چند دنوں مشغول خدا رہے اور ایسے مستغرق ہو گئے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی افاقہ نہیں ہوتا تھا (ہوش میں نہیں آتے تھے) پانی پت کے بہت سے لوگ جو قلندر صاحب کی اس استغراقی کیفیت سے واقف نہیں تھے۔ آپ کے پاس آ کر

سوالات کرتے تھے کہ آپ نماز کیوں نہیں پڑھتے - قلندر صاحب جواب دیتے تے
کہ ہم اپنے اختیار میں نہیں ہیں - بالآخر ان ظاہر بیوں نے ایک محضر نامہ تیار کیا کہ
یہ شخص خلاف شرع ہے، نماز بھی نہیں پڑھتا اس کو سزا ملنی چاہیے کہ دوسرے اس
طرح کی حرکت نہ کریں اور شرع شریف کے خلاف قدم نہ رکھیں - القصہ اس
محضر نامہ پر اس زمانہ کے قاضی اور مفتی وغیرہ اور جملہ اکابر و مشاہیر کے دستخط اور
مہریں ہو گئیں - آخر میں کسی وجہ سے یہ محضر نامہ خواجہ نصیر الدین اور خواجہ
مسعود کے سامنے آیا - یہ دونوں بھائی تھے - ان کے والد ماجد کا اسم گرامی خواجہ ملک
علی انصاری تھا - ابن خواجہ ترک علی بن مسعود ثانی بن شیخ خواجہ عمر بن خواجہ امام
بن شیخ عثمان بن ابو طاہر بن احمد بن انفع بن نافع بن محمود شاہ بن مسعود بن شیخ عبداللہ
انصاری -

یہ دونوں (خواجہ نصیر الدین اور خواجہ مسعود) ابھی طالب علم تھے - اور
بابل سے آ کر پانی پت کی ایک مسجد میں مقیم تھے - انہوں نے محضر نامہ دیکھا تو اس
کو چاک کر ڈالا -

ظاہر ہے محضر نامہ مرتب کرنے والے اس حرکت سے بہت مشتعل ہوئے
انہوں نے ان دونوں کے بر خلاف "قاضی" کے یہاں دعویٰ دائر کر دیا - تاہم
صاحب کے یہاں یہ دونوں بھائی پیش ہوئے - تو قاضی صاحب نے اس حرکت کا
سبب دریافت کیا - ان دونوں نے کہا -

"ایں درویش قلندر بو علی مست و مجذوب ست - احکام شرع
شریف بر ایں چنیں کس جاری نیست -"

(یہ درویش، یعنی قلندر بو علی مست اور مجذوب ہیں - ایسے
مجذوبوں پر شرع شریف کے احکام جاری نہیں ہوتے -)

القصہ بہت کچھ گفتگو کے بعد یہ قصہ رفع دفع ہوا اور یہ دونوں بھائی اپنی
میں گئے - ایک روز حضرت قلندر صاحب اس مسجد کی طرف تشریف لے آئے
دونوں بھائی قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے - ان کی قدم بوسی کی اور

میں لے آئے - جو ماحضر تھا وہ پیش کیا - حضرت قلندر صاحب نے اس وقت خوش
ہو کر ان کے لیے دعا فرمائی اور بشارت دی - کہ:

"شما خاطر جمع ایں جا در پانی پت باشید"

(تم دل جمعی اور اطمینان سے اس جگہ یعنی پانی پت میں
رہو گے)

غرض حضرت قلندر صاحب کی دعا کی برکت ہے - کہ ان دونوں بزرگوں کی
(جو اس وقت طالب علم تھے) اولاد (انصاری خاندان) آج تک پانی پت میں آباد ہے
اور ترقی کر رہا ہے - اور ان کے بعض بزرگ جیسے شیخ امان اور شیخ حسین وغیرہ بہت
زیادہ صاحب تاثیر اور صاحب کرامات درویش ہوئے ہیں - واللہ اعلم بالصواب -
(انتہی شرف المناقب)

شرف المناقب کی اس روایت میں یہ غلطی تو ضرور ہے کہ اس کو شمس الدین
ایبک کے زمانہ کا واقعہ بیان کیا ہے - حالانکہ وہ ۶۳۵ھ میں قلندر صاحب کے دہلی
جانے سے بھی پہلے وفات پا چکا تھا - اس کے علاوہ باقی مضمون اصول روایت کے لحاظ
سے بھی درست معلوم ہوتا ہے اور درایت کے لحاظ سے بھی صحیح ہے - کیونکہ متعدد
ذرائع سے یہ ثابت ہے کہ حضرت قلندر صاحب نے حضرات انصار کے مورث
اعلیٰ کو جو پانی پت میں اقامت گزیں ہوئے تھے - دعا دی تھی - اور اس خاندان کی بقاء
ترقی اس دعا کی برکت ہے - مثلاً عبد السلام صاحب چشتی صابری پانی پتی کا ایک قلمی
رسالہ ہمارے سامنے ہے - یہ رسالہ تیرہویں صدی کے آخری ربع ۱۲۸۰ء میں
مصنف نے تحریر کیا تھا - اور حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کے خاندانی
مخطوطات میں محفوظ تھا - یہ رسالہ اردو میں ہے اور اس میں چند سوالات کے
جوابات دیئے گئے ہیں - ساتویں سوال کے جواب کے آخر میں تحریر ہے - واضح ہو
کر ازاں جناب حضرت خواجہ شرف الدین میں خواجہ ملک علی انصاری بہت ذی علم
اور ذی فضل (اولاد میں (؟)) خواجہ عبداللہ انصار کے مع پسران خواجہ نصیر و خواجہ
مسعود) وارد پانی پت ہوئے - پیشہ درس و تدریس گرم رکھتے تھے - ان کو بیا تھا

حضرت شرف الدین کے ایک طرح کی عقیدت ہوگئی- حضرت نے فرمایا تم سکونت اس دیار میں اختیار کرو- اور عصا دستی اپنا عطا کیا- اور اولاد در نسل کی افزائی کی دعا دی- پس وہ بزرگ بطوع و رغبت سکونت پذیر پانی پت ہوئے- اولاد ان کی انصار ماشاء اللہ تاحال قائم و برقرار ہے-

اسی طرح مولانا قاری عبدالحلیم صاحب انصاری نے ''تذکرہ رحمانیہ'' میں انہیں خواجہ ملک علی کے متعلق تحریر فرمایا ہے-

> ''پانی پتی انصاریوں کے جد اعلیٰ خواجہ ملک علی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادوں (خواجہ نصیرالدین و خواجہ مسعود) کی شادی حضرت خواجہ قطب الدین بو علی قلندر پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مخدوم صاحب (شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ) کی صاحبزادیوں سے کرا کر یہ دعا دی تھی کہ تمہاری اولاد قیامت تک یہاں بسے گی- اور بڑے بڑے علماء اور ذکی و قار لوگ تمہاری نسل میں پیدا ہوں گے- (تذکرۃ الصالحین عرف تذکرہ رحمانیہ ص ۱۱، ص ۱۲)

بہر حال تحریری وثیقوں اور خاندانی روایات سے یہ بات تواتر کے درجہ میں ثابت ہے- کہ حضرات انصار کے مورث اعلیٰ جو پانی پت میں فروکش ہوئے تھے- ان کو حضرت قلندر صاحب نے دعا دی تھی- اور اس دعا کی وجہ بھی تقریباً مسلّم ہے- یعنی مورث اعلیٰ کی مخلصانہ عقیدت و محبت حضرت قلندر صاحب سے اس مخلصانہ عقیدت کا ایک مظاہر یہ تھا کہ خواجہ نصیر اور خواجہ مسعود نے اس محضر نامہ کو چاک کر دیا- پھر جب حضرت قلندر صاحب ان کی مسجد میں اتفاقیہ پہنچ گئے- تو ان صاحبزادوں نے قلندر صاحب کی بہت زیادہ مدارت کی وغیرہ-

بہر حال اس روایت کے بموجب سکر دائم اور استغراق مسلسل اور جذب مستقل وہ عارضہ تھا- جس نے اس آخری دور میں حضرت قلندر صاحب کو مرفوع القلم کر دیا تھا-

عبدالسلام صاحب چشتی صابری کا تذکرہ پہلے گذر چکا ہے- ان کا سادہ بیان حضرت قلندر صاحب کے متعلق خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:

> ''بیچ اوائل عمر حضرت نے جملہ علوم و فنون بکمال حاصل کیے اور بروایت اقتباس الانوار- مدت تیس سال تک بپاء مینار مسجد قوۃ الاسلام بیچ درس و تدریس و افادہ خلائق کے مشغول رہے اور طریقہ مجاہدہ و ریاضت سلوک فرماتے رہے- آخر کار حضرت پر عالم جذب طاری ہو گیا- بہر حال باقی عمر بیچ جذب کے گذاری-''

کیا یہ جذبہ مقصود ہے؟

یہاں سوانح نگاروں کی ایک کمزوری ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اپنے ممدوح کی شان کو بلند کرنے کے لیے احکام شریعت میں توڑ مروڑ شروع کر دیتے ہیں- کیونکہ وہ اس کو گوارا نہیں کرتے کہ ان کے ممدوح کو مرفوع القلم قرار دیا جائے- اس کے برخلاف وہ اس کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے حق میں احکام شریعت کو منسوخ قرار دیا جائے- ایک دوسری غلطی اس سے یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس جذب و استغراق کو مقصود سمجھا جانے لگتا ہے- حالانکہ یہ ایک عارضہ ہے مقصود نہیں ہے-

چنانچہ یہی صاحب شرف المناقب جو اس استغراق اور مدہوشی کو حضرت قلندر صاحب کے مناقب میں شمار کراتے ہوئے مولانا مفتی ضیاء الدین صاحب عرف ''میر سید علی مفتی'' کا مذاق بنا رہے ہیں- شرف المناقب کے شروع میں تحریر فرماتے ہیں-

> ''قطب الاخیار مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ در کتاب نفحات آوردہ کہ اہل وصول بعد از انبیاء علیہم السلام دو طائفہ اند- اول صوفیہ کہ بواسطہ متابعت خلاصہ کائنات علیہ الصلوۃ والسلام رتبہ وصول یافتہ اند بعدہ در رجوع برائے دعوت خلق بطریق

متابعت مامور شدہ وایں طائفہ کاملاں مکمل اند کہ فیض الٰہی
ایشاں رابعد استغراق در عین جمع ولجہ توحید- از شکم ماہی فنا بسا
حل بقا خلوص ارزانی فرمود تا خلق رابہ نجات دلالت کنند-
دویم طائفہ آں جماعت اند کہ بعد از وصول بدرجہء کمال غرق
بحر جمع گشتند واز شکم ماہی فنا چناں ناچیز مستہلک شدند کہ ایشاں
راہر گز خبر واثر بساحل تفرقہ بقا نہ رسیدہ حضرت شاہ شرف
الدین بو علی قلندر عاشق الٰہی از طائفہ ثانیہ بودند-"

ترجمہ: مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ نے مشہور
تصنیف "نفحات" میں تحریر فرمایا ہے- کہ انبیاء علیہم السلام کو
مستثنیٰ کر کے باقی اہل وصول اور خدارسیدہ دو قسم کے ہوتے
ہیں-اول صوفیائے کرام جو خلاصہ کائنات فخر موجودات ﷺ
کی سنت اور آپ کے نقش قدم پر چل کر رتبہ وصول (درجہ خدا
رسی) حاصل کرتے ہیں-اس کے بعد مناسب صورت سے خلق
خدا کی اصلاح اور تبلیغ کی طرف رجوع کرنے کا ان کو حکم ہوتا
ہے-یہ حضرات دعوت وارشاد میں مصروف ہو جاتے ہیں-یہ
کامل و مکمل اولیاء اللہ ہوتے ہیں کہ فیض الٰہی ان کو سرچشمہء جمع
اور گرداب توحید میں غرق کرنے کے بعد ماہی فنا کے شکم سے
نکال کر ساحل بقا پر پہونچاتا ہے- تاکہ خلق خدا کو نجات کے
راستے بتائیں-

دوسری وہ جماعت ہے کہ درجہء کمال پر پہونچنے کے بعد دریائے جمع
میں غرق ہو جاتے ہیں-اور ماہی فنا کے شکم میں ایسے گم ہو جاتے
ہیں کہ تفرقہ بقاء کے ساحل کی انہیں کوئی خبر نہیں رہتی-
حضرت شاہ شرف الدین بو علی قلندر عاشق الٰہی اسی دوسری
جماعت میں ہیں-"

ہمیں اس سے بحث نہیں ہے کہ میر علی مفتی صرف ایک دنیادار عالم تھے-یا
خدارسیدہ بزرگ اور سلسلہ طریقت کے سالک تھے- ہمارا منشا یہ ہے کہ جذب و
استغراق دائم ایک عذر تو ہو سکتا ہے مقصود نہیں ہوتا اور سوانح نگاروں کی یہ غلطی
ہے کہ اس کو ایسے انداز سے بیان کرتے ہیں کہ گویا وہ مقصود ہے-اور یہ نہیں خیال
فرماتے کہ احکام شریعت کو کسی شخص کے حق میں منسوخ اور مرفوع قرار دینے کے
مقابلہ میں یہ بات بہت آسان ہے کہ اس شخص کو مرفوع القلم کہا جائے- تاہم ان کی
یہ غلطی غیر شعوری ہے جو اس بزرگ کی فرط محبت اور عقیدت میں سرزد ہوتی
ہے-جس کی وہ سوانح لکھ رہے ہیں-اور اس سے زیادہ گمراہ کن اور متمردانہ باغیانہ
غلطی ان کی ہے جو ایک طرف قلندری کے بہانہ کفر والحاد اور معاذاللہ شان خدا میں
گستاخی اور بے ادبی کی راہ ہموار کرتے ہیں اور دوسری جانب شرمناک ہواپرستی کو
چھپانے کے لیے ایک مقدس لبادہ بناتے ہیں- ان کے نزدیک قلندری یا عشق و
محبت کے لیے اس طرح کی حسن پرستی لازم اور ضروری ہے- جس کو مہذب الفاظ
میں بوالہوسی کہا جاتا ہے-اس کی چند مثالیں خود قلندر صاحب کی سوانح سے آئندہ
نقل کی جائیں گی- (انشاء اللہ) ہم یہاں اس طویل بحث کے دامن کو سمیٹ کر
اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں-

ہم رنگی محبوب کی حقیقت اور اس کی صحیح تصویر

قلندر صاحب کا یہ شعر موضوع کلام تھا-

در محبت تا نسوزی بال و پر
کے شوی ہم رنگ عاشق سربسر

(جب تک محبت میں بال و پر نہ جلادو' پوری طرح عاشق کے ہم رنگ
کیسے ہو سکتے ہو-

سوال یہ تھا کہ ہم رنگی کے کیا معنی ہیں-اور ایک فانی انسان محبوب حقیقی یعنی
حضرت حق جل مجدہ کے ہم رنگ کس طرح ہو سکتا ہے- پہلی قسطوں کے طویل

سلسلۂ کلام میں یہ بتایا گیا ہے کہ بوالہوس مصنوعی قلندروں نے ہم رنگی کے وہ معنی لیے جو سراسر زندقہ 'الحاد اور بے دینی ہے- یعنی احکام شریعت سے آزادی اور جامہ تہذیب و شرافت سے برہنگی (معاذ اللہ) لیکن وہ ہم رنگی جو صبغة الله ومن احسن من الله صبغة- سے ثابت ہوتی ہے- وہ ہم رنگی وہ ہے جس کی تعلیم تخلقوا باخلاق الله- سے دی گئی ہے- (تم بھی ان اخلاق سے آراستہ ہو جاؤ جو اللہ کے اخلاق ہیں) وہ ربانی اخلاق جن سے ایک انسان آراستہ ہو سکتا ہے- وہ ہیں جن کی تعلیم و تمرین اور جن کا عملی تجربہ کرانے کے لیے آنحضرت ﷺ کو رحمۃ اللعالمین بنا کر مبعوث کیا گیا تھا- مثلاً اللہ تعالیٰ رب العالمین' ارحم الراحمین ہے- تم رب نہیں بن سکتے مگر مربی بن سکتے ہو- بس مخلوق خدا کے لیے مربیانہ اخلاق اختیار کرو- پرورش' ہمدردی' غمخواری' تقاضاء ربوبیت ہے- تم اپنے اندر محتاجوں کی حاجت روائی- مصیبت زدوں کی ہمدردی' بے کسوں اور بے بسوں کی غمخواری کا جذبہ پیدا کرو- ہر ایک مخلوق کے ہمدرد بن جاؤ- رحم و کرم کو ہر جاندار کے لیے عام کر دو- اپنے پرائے ہر ایک سے انصاف کرو- یہ ہیں وہ اخلاق جن کو صبغۃ اللہ کہا جا سکتا ہے- جو تخلقوا باخلاق الله اور اخلاق خداوندی سے آراستہ ہونے کی عملی تصویر ہیں- ان بزرگان پاک باطن نے اس مفہوم اور مقصود کے لیے ایک چبھتا ہوا جامع لفظ استعمال کیا ہے وہ لفظ ہے عشق' عشق' عشق-

احکام شریعت کی پابندی کے لیے قلندرانہ جذبات ان اشعار سے ظاہر ہوتے ہیں جو قلندر صاحب کی مثنوی سے منتخب کر کے پہلے نقل کیے جا چکے ہیں- اسی طرح قلندر صاحب کے ایک مکتوب کے اقتباسات بھی پہلے بیان کیے جا چکے ہیں* یہ مکتوب بقول مولانا عبدالحق صاحب محدث' عشق و محبت کی زبان میں لکھا گیا تھا- اس میں معشوق حقیقی محمد رسول اللہ ﷺ کو قرار دیا ہے- اللہ تعالیٰ کو عاشق حقیقی ثابت کیا ہے- اور تخلقوا باخلاق الله کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ تم بھی عاشق بن جاؤ اور جس طرح عاشق حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کا عشق اپنی ہر مخلوق کے لیے عام ہے- تمہارا عشق بھی اس کی مخلوق میں کوئی امتیاز نہ پیدا کرے- تبلیغ و اصلاح بھی

تو عاشقانہ اور ہمدردانہ انداز میں ہو- قلندر صاحب کا ایک جملہ یاد رکھیے اور لطف اندوز ہوتے رہیے- وہ جملہ یہ ہے-

"اے برادر عاشق شو
ہر دو عالم را حسن معشوق داں"

(بھائی! عاشق بن جاؤ- دونوں جہانوں کو معشوق کا حسن سمجھو)

اس عشق و محبت کے ساتھ جہاں تک خود تمہاری ذات کا تعلق ہے تو تقاضاء عشق یہ نہیں ہے کہ "انا الحق" کہو- معاذ اللہ یہ تو خود پرستی ہے- عاشق کے پاس "انا" (میں) کہاں' وہ تو فنا ہو چکا- یہ فنا ہی اس کا کمال ہے- یہی اس کا سرمایہ ہے- "انا" اس کی زبان پر آئے تو کس طرح آئے؟ متاع عشق برباد ہو تو "انا" زبان پر آ سکتا ہے- مگر متاع عشق وہ دولت جاوداں ہے جس کے خاتمہ کے تصور سے ہی پتہ پانی ہو جاتا ہے-

قلندر صاحب کا یہ ارشاد کبھی بھی فراموش نہ ہونا چاہیے-

تا توئی کے یار گردد یار تو
چوں نباشی' یار باشد یار تو

ترجمہ: (جب تک تم تم ہو (اپنی انانیت کو باقی رکھے ہوئے ہو یعنی اس تصور کو باقی رکھے ہوئے ہو کہ میں بھی ایک چیز ہوں) اس وقت تک یار کب یار ہو سکتا ہے- تم اس تصور کو ختم کر دو کہ میں بھی کچھ ہوں اس وقت یار واقعی بن جائے گا-)



تو مباش اصلا' کمال این ست و بس
تو درو گم شو' وصال این ست و بس

ترجمہ: (تم بالکل نہ رہو یہ تصور ہی ختم کر دو کہ میں بھی کچھ ہوں یہ ہے کمال' تم اس (محبوب) میں گم ہو جاؤ' یہی وصال ہے اور بس-

مولانا حکیم عبدالحی صاحب نے "نزہتہ الخواطر" میں حضرت قلندر صاحب کا قول نقل کیا ہے- ملاحظہ فرمایئے اور محظوظ ہو جایئے-

"درویشی چیست؟ نفس کشتن، و طلسم ہستی شکستن وترک از غیر گرفتن، و ا خود رستن، وبدوست پیوستن، دور آتش محبت سوختن، وخاکستر شدن-" (ص ۶ ج ۲)

ترجمہ: (درویشی کیا ہے؟ نفس کو مارنا، ہستی کے طلسم کو توڑ دینا (اس تصور کو مٹا دینا کہ میں کچھ ہوں) جو بھی غیر سے اس کو ترک کر دینا خود اپنے آپ سے بھی رہائی پا لینا- اور دوست سے پیوست ہو جانا- آتش محبت میں جلنا اور خاک بن جانا-)

مذہب، عشق، تبلیغ واصلاح کا لائحہ عمل

بات بہت دور جا پڑی- اصل مقصد یہ ہے کہ اس دور میں جو اگرچہ مسلمانوں کی حکومت کا دور تھا- مگر حکومت وہ تھی جس کو صادق مصدوق خاتم الانبیاء علیہ ا علیہم السلام کی زبان حقیقت ترجمان نے "ملک عضوض" فرمایا تھا- "درندہ صفت حکومت-" "کٹھنی حکومت" اس دور میں ان شاہنشاہوں کے کردار سے اگر بالفرض اسلام کی اشاعت ہوئی تو وہ جبر و قہر کے انداز میں ہوئی- جو فطرت اسلام کے سراسر مخالف ہے- ان بزرگوں نے فطرت اسلام کو اس کے اصلی روپ میں پیش کیا-

کور باطن نکتہ چیں کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا- مگر جو حقیقت آفتاب کی طرح نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ تلوار الگ رہی- تلوار اٹھانے والے بھی الگ رہے- خلق خدا ان سے وابستہ رہی جو گدڑی پوش تھے- جن کو تلوار اٹھانے والوں سے یہاں تک نفرت تھی کہ ان سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے تھے- جو فقیر کے لقب پر فخر کرتے تھے (اگرچہ عوام کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ وہ ان کو شاہ اور شاہ صاحب کہتے تھے) انہی فقیروں نے عشق کو اپنا مذہب قرار دیا- محبت کے ترانے

گائے- خلق خدا کو مانوس کیا- بادۂ الفت سے انہیں سرشار کیا- شاہی محلات میں نہیں، بلکہ خلق خدا کے دلوں میں گھر کیا- اور اس طرح اسلام کی کشش کو باقی رکھ کر بچھڑے ہوؤں کو ملایا- ٹوٹنے والے دلوں کو جوڑا اور کلمۃ اللہ کو بلند کیا-

خدا رحمت کند ان عاشقان پاک طینت را

مسلک عشق کی غلط تفسیر

آج کل ایک خاص فن یہ ہے کہ غالب اور حافظ شیرازی کے اشعار کے مرقعات تیار کیے جا رہے ہیں- یہ مرقعات باتصویر ہوتے ہیں- آپ کو تعجب ہوگا- کہ حضرت قلندر صاحب جیسے عاشقان سرمست کے بھی مرقعات تیار کیے گئے- مگر تصاویر کے ذریعہ نہیں بلکہ افسانوں کے ذریعہ- اور چونکہ ان افسانوں کے مصنف جو خود اغراض پرست بوالہوس تھے جو ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلنے کو اپنا فن سمجھتے تھے تو یہ افسانے بھی ایسے ہی ہیں جن کو بوالہوسی کی قلمی تصویر کہنی چاہیے- مثال ملاحظہ ہو- حضرت قلندر صاحب رحمہ اللہ علیہ کی ایک غزل ہے-

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم
گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(مجھے اپنی آنکھ پر بھی غیرت آتی ہے- اس لیے آنکھ کو اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ تجھ کو دیکھ سکے- کان کو بھی اجازت نہیں کہ وہ تیری بات سن سکے-)

گر شبے دست دہد وصل تو از غایت شوق
تا قیامت نشود صبح دمیدن ندہم

(اگر کسی رات آپ کا وصال حاصل ہو جائے تو انتہائی شوق کے باعث صبح کو اجازت نہیں دوں گا کہ وہ طلوع ہو جائے یہاں تک کہ قیامت قائم ہو-)

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد
تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم

(اگر ملک الموت میری جان لینے آئے تو جب تک تیری صورت نہ دیکھ لوں-روح کو پرواز کرنے کی اجازت نہیں دوں گا-)

ہدیہ زلف تو گر ملک دو عالم بدہد
یعلم اللہ کہ سر موئے تو دیدن ندہم

(تیری زلف کے ہدیہ (قیمت) میں اگر دونوں جہان کی حکومت بھی دی جائے تو اللہ جانتا ہے کہ ایک بال کا کنارہ بھی دیکھنے کی اجازت نہیں دے سکتا-)

گر بدام دل من افتد آں عنقا باز
گرچہ صد حملہ کند باز پریدن ندہم

(اگر میرے دل کے جال میں وہ عنقا دوبارہ پھنس جائے تو اگر سو بار حملہ کرے تو دوبارہ اڑنے کا موقع نہ دوں-)

شرف گر باد ؤ زد بوئے از نفس برد
باد را نیز دریں دیر وزیدن ندہم

(اے شرف اگر ہوا تیرے سانس کی بو باہر لے جانے لگے- تو ہوا کو بھی اس کی اجازت نہ دوں کہ وہ چلے-)

عشق الٰہی اور محبوب حقیقی کے بارے میں کتنے عمدہ اشعار ہیں- ظاہر ہے حضرت حق جل مجدہ نہ ان آنکھوں سے نظر آسکتے ہیں نہ ان کا کلام ان کانوں سے سنا جا سکتا ہے- حضرت قلندر صاحب اس کی توجیہہ یہ کر رہے ہیں- کہ عاشق ا... سے زیادہ غیرت مند ہے- تصویر جاناں دل میں سموئے ہوئے ہے- وہ اسی ...

ہے- اور اسی طرح مگن ہے کہ چاہتا ہے کہ جو کچھ ہو وہی وہ ہو- اسے شرکت غیر قطعاً گوارا نہیں ہے- یہاں تک کہ وہ خود اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں کو بھی اپنا رقیب سمجھتا ہے- اسے یہ بھی گوارا نہیں کہ آنکھ اس کے رخ زیبا کو دیکھ سکے- یا کان اس کی صدائے دلکش کو سن سکے- اسی طرح جملہ اشعار کی توجیہہ اور تشریح کی جاتی ہے-

اب بوالہوس مصنوعی قلندروں کی فنکاری ملاحظہ فرمایئے:

کہ مبارک خاں جو خاندان شاہی کا ایک فرد تھا- اور اس کے ایثار و قربانی اور جذبۂ خدا طلبی کی بناء پر حضرت قلندر صاحب اس پر شفقت فرمایا کرتے تھے- اس کے اس ارادت مندانہ تعلق اور بے لوث رابطہ کو کس طرح ملوث کیا ہے- اور تعجب ہے کہ مصنف شرف المناقب جیسے حضرات نے بھی جو حضرت قلندر صاحب سے مخلصانہ عقیدت رکھتے ہیں- اس افسانہ کو بلا تنقید و تبصرہ نقل کر دیا ہے-

افسانہ یہ تراشا گیا ہے کہ پانی پت میں کوئی فوجی افسر تھا- اس کو بھی مبارک خاں سے دلچسپی تھی- ایک روز مبارک خاں سیر و شکار کے لیے گئے ہوئے تھے- فوجی افسر نے موقع پا کر ان کو اپنے قبضہ میں کر لیا- حضرت قلندر صاحب شام تک مبارک خاں کے منتظر رہے-

"چوں روز آخر شد و شب رسید- قلندر بو علی را اشتیاق محبوب غالب شد-"

(جب دن ختم ہو گیا اور رات آپہونچی تو قلندر بو علی پر محبوب کا اشتیاق غالب ہو گیا)

بالآخر اشتیاق محبوب نے یہاں تک مضطرب کیا کہ آپ اس فوجی افسر کی ڈیوڑھی پر پہونچ گئے- اور دیدار محبوب کے اشتیاق میں یہ اشعار گنگنانے لگے- (جو اوپر نقل کیے گئے ہیں)

حضرت قلندر صاحب غزل پڑھ رہے تھے اور تاریکی شب بڑھ رہی تھی- چنانچہ روایت ہے کہ وہ رات بہت دراز ہو گئی- یہاں تک کہ وہ فوجدار بھی عاجز ہو گیا- اور "درازی شب و بسیاری خواب" سے سارا عالم تنگ ہو گیا- آخر کار پانی پت

کے عامل (کلکٹر) کو اس کا احساس ہوا- اس نے تحقیق و تفتیش شروع کر دی کہ آخر درازیٔ شب کا سبب کیا ہے؟ عامل (کلکٹر) کو تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ قلندر صاحب فوجدار کے دروازے پر کھڑے ہوئے ہیں- اور فرما رہے ہیں کہ جب تک مبارک خاں میرے پاس نہیں پہونچیں گے صبح نہیں ہو گی (خدا جانے حضرت قلندر صاحب نے یہ الٹی شرط کیوں لگائی- حالانکہ شب فراق کی طوالت مطلوب نہیں ہوتی- شب وصال کی طوالت مقصود ہوتی ہے- (محمد میاں)

قصہ مختصر جب فوجدار عاجز ہو گیا تو اس نے مبارک خاں کو قلندر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا- اور جیسے ہی مبارک خاں حضرت قلندر صاحب کے پاس پہونچے آفتاب بر آمد ہو گیا- حضرت قلندر صاحب نے مبارک خاں کا ہاتھ پکڑا اور اس کو اپنے ساتھ لے آئے-

وہاں ایک مطرب چہ (نوجوان قوال) حاضر تھا- اس نے یہ اشعار گائے-

اگر بینم شبے ناگہ من آں سلطان خوباں را
سرے درپاء دنے آرام فدا سازم دل و جان را

(اگر دفعتہً کسی رات میں ان معشوقوں کے بادشاہ کو دیکھ لوں تو اس کے پیروں میں سر ڈال دوں دل اور جان کو قربان کر دوں-)

پرسم از رہ یاری کہ جاناں چوں نہ آخر
کجائی کت نمے بینم دو چشم مست غلطاں را

(یاری اور دوستی کی راہ سے میں اس سے دریافت کروں کہ جاناں آخر تم آتے کیوں نہیں تم کہاں ہو کہ میں تمہاری چشم غلطاں کو دیکھ بھی نہیں سکتا-)

قوال یہ اشعار پڑھ رہا تھا کہ حضرت قلندر صاحب:
"از عالم معرفت بدریا وحدت مستغرق شد-"

(عالم معرفت سے دریا وحدت میں غرق ہو گئے-

جب یہ استغراقی کیفیت ختم ہوئی تو آپ نے اس "مطرب چہ" پر نظر کرم فرمائی اپنا گھوڑا اس کو بخش دیا- پھر وہاں سے اٹھے- مبارک خاں کا ہاتھ پکڑ کر پانی پت سے کرنال کی طرف روانہ ہو گئے- پھر کرنال کے قریب موضع "بوڑھ کھیڑہ" میں جا کر قیام فرما ہوئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی- حتیٰ کہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا-"

مبارک خاں کے متعلق مشہور ہے کہ یہ شہزادہ تھا- بچپن ہی میں اس کو خدا طلبی کا شوق پیدا ہوا- اور حضرت قلندر صاحب کی خدمت سے فیض یاب ہونے لگا- اس کی بہتر صلاحیتوں نے حضرت قلندر صاحب کی توجہات اور آپ کی شفقتوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا- آپ کو ان سے بہت زیادہ انس ہو گیا- آپ کو بھی گوارا نہیں تھا کہ یہ آپ کی خدمت سے غیر حاضر ہوں- ظاہر ہے کہ یہ انس اور الفت وہی ہے جو ایک جوہر شناس کو کسی بہتر جوہر سے ہونی چاہیے- مگر خدا محفوظ رکھے- یاران طریقت نے اس کو کچھ اور ہی رنگ دے دیا- اور وہ اشعار جو عاشقان پاک طینت نے اپنے محبوب حقیقی کے شوق میں کہے تھے- ان کو اس مفروضہ عشق پر چسپاں کر دیا-

اتفاق سے حضرت قلندر صاحب کی زندگی میں مبارک خاں کی وفات ہو گئی- اس لیے ان سے فیضیاب ہونے کا موقع لوگوں کو نہیں مل سکا- اور یہ جوہر قابل اسی طرح زیر زمیں دفن ہو گیا- لیکن قدر دان جوہری کو اب بھی اس کی قدر تھی- چنانچہ جو جگہ حضرت قلندر صاحبؒ نے اپنی قبر کے لیے تجویز کر رکھی تھی- اس کے قریب ہی ان کو دفن کرایا- اور یہ بھی روایت ہے کہ سلطان علاؤالدین بادشاہ دہلی سے فرمائش کر کے مبارک خاں کی قبر پر قبہ اور گنبد بھی حضرت قلندر صاحبؒ نے ہی اپنی زندگی میں بنوا دیا تھا- بہر حال سجادہ صاحبان کی روایت یہ ہی ہے کہ قلندر صاحب نے یہ بھی فرمائش کی تھی کہ ان کے مزار پر حاضر ہونے والا پہلے مبارک خاں کے مزار پر حاضر ہو- (واللہ اعلم بالصواب) (شرف المناقب وغیرہ)

گوجری کا افسانہ

اسی قسم کا ایک افسانہ ایک گوجری کا بھی ہے- سوانح نگاروں نے اس کو حضرت قلندر صاحب کے کرامات اور آپ کے مناقب میں شمار کیا ہے- کیونکہ جس طرح مبارک خاں کے مذکورہ بالا افسانہ میں قلندر صاحبؒ نے آفتاب کو باندھ دیا تھا- کہ جب تک مبارک خاں رہا نہیں ہوئے آفتاب نہیں نکلا- اسی طرح اس افسانہ میں اولاد بخشنے کی کرامات ظاہر ہوئی ہے اور صرف عورت کے بطن سے ہی نہیں بلکہ ایک بچہ تو پتھر کے نیچے سے برآمد کرایا ہے- پورا افسانہ ملاحظہ فرمایئے-

حضرت قلندر صاحبؒ "بوڑھ کھیڑا" میں قیام فرما ہیں- ایک حسین و جمیل گوجری دہی کا گھڑا سر پر رکھے ہوئے اس طرف سے گذر رہی ہے- حضرت قلندر صاحب کی نظر اس پر پڑتی ہے تو آپ فرماتے ہیں- "گوجری دہی بیچتی ہو-"؟

گوجری: "ہاں صاحب بیچتی ہوں" اور بیچنے کے لیے ہی یہ بوجھ اٹھائے پھر رہی ہوں- مگر میاں صاحب آپ میری دہی خرید سکیں گے- دہی قیمتی ہے-

قلندر صاحب: ضرور، بتاؤ کیا قیمت ہے؟

گوجری: "زر سرخ کا ایک سکہ" (یہ سونے کا ایک سکہ ہوتا تھا)

قلندر صاحبؒ نے زانو کے نیچے سے سونے کا یہ سکہ نکالا- اور گوجری کو دیدیا- اور فرمایا "یہ سکہ بھی تمہارا اور یہ دہی بھی تمہیں کو بخشی- لے جاؤ"

گوجری دعائیں دیتی ہوئی خوشی خوشی چلی گئی- دو چار روز بعد پھر اسی طرح آئی اور ایک سکہ لے گئی- اسی طرح وہ آتی جاتی رہتی تھی- اور اپنے گھر والوں سے اس درویش (قلندر) کی تعریف کیا کرتی تھی-

اتفاق سے اس گوجری کے کوئی بچہ نہیں تھا- ایک روز اس کے شوہر نے کہا؟ اس بزرگ کی بہت تعریف کرتی ہے- اس سے سونے کا "سکہ" لاتی ہے اس سے [illegible] بھی تو مانگ-

اگلے روز گوجری بن ٹھن کر "لباس فاخرہ پوشیدہ" (اچھا لباس پہن کر) او[illegible]

دہی کی ٹھلیا سر پر رکھ کر قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی- اور نہایت ادب سے سلام کیا:

"بو علی را ادائیش پسند مد" (قلندر صاحبؒ کو اس کی ادا پسند آئی) اور خوش ہو کر یہ رباعی پڑھی-

اے گوجری در حسن لطافت چومہی!
ایں دیگ دہی بر سر تو تاج شہی!

اے گوجری حسن لطافت میں چاند جیسی دہی کی ہنڈیا تیرے سر پر جیسے بادشاہی تاج-

از لعل لبت شیر و شکر می بارد
ہر گاہ بگوئی کہ دہی لیو دہی!

تیرے لعل جیسے ہونٹوں سے شیر و شکر برستا ہے- جب تو کہتی ہے دہی لو دہی-

حضرت قلندر صاحب کو خوش دیکھ کر گوجری نے اپنی درخواست پیش کر دی:

کہ مدت است کہ طلب فرزند می دارم- توجہ فرمائید دعا کنید- مرا فرزند عطا شود-

(عرصہ سے فرزند کی طلب میں ہوں- آپ توجہ فرمایئے- اور دعا کیجئے مجھے لڑکا نصیب ہو)

آپ نے گوجری سے فرمایا کہ- فوراً جاؤ اور اپنے محلہ میں "آواز لگادو" کہ جس کے اولاد نہ ہو- وہ کل کو میرے ساتھ چلے- گوجری نے ایسا ہی کیا- اور اگلے روز عورتوں کی ایک بھیڑ لے کر وہ قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی-

شرف المناقب کی روایت ہے:

"چوں حضرت جماعت زناں راہمراہ آں معشوقہ دید- قدرے پس خوردہ برگ تنبول بدست ہر یک زن داد و گفت بخورید-"

(حضرت قلندر صاحب نے جب اس معشوقہ (گوجری) کے ساتھ جب عورتوں کی جماعت کو دیکھا تو پان کی گلوری چبائی ہوئی تھوڑی تھوڑی ہر ایک عورت کو دے دی اور فرمایا اسے کھالو-)

حضرت قلندر صاحبؒ کی اس پس خوردہ گلوری کو تمام عورتوں نے کھالیا- مگر ایک عورت نے کھانے کے بجائے اس کو پتھر کے نیچے رکھ دیا- پس قلندر عاشق الٰہی کی زبان کی برکت سے تمام عورتوں کو اسی روز سے امید ہوگئی- اور نو ماہ چند روز بعد ہر ایک کے لڑکا ہوا- مگر وہ عورت جس نے گلوری کے ریزہ کو چبانے کے بجائے پتھر کے نیچے دبادیا تھا- محروم رہی- چالیس روز بعد جب یہ عورتیں چلہ نہا چکیں تو ہر ایک نے اپنے بچہ کو گود میں لیا- اور دہی کی ہنڈیا سر پر رکھی اور قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں-

''آں معشوقہ نیاز ہر یک را در پیش حضرت گذرانید-''

(اس گوجری (معشوقہ) نے ہر ایک عورت کی نیاز قلندر صاحب کی خدمت میں پیش کی-)

حضرت قلندر صاحب نے ہر ایک کی نیاز قبول فرمائی- ان عورتوں میں وہ بھی تھی جس نے گلوری نہیں چبائی تھی اور اولاد سے محروم رہی تھی- وہ اس وقت نہایت آزردہ اور غمگین کھڑی ہوئی تھی- جب حضرت قلندر صاحب کی نظر اس پر پڑی تو فرمایا- غمگین کیوں ہو-''؟

اس محروم عورت نے سارا ماجرا سنادیا- تب حضرت قلندر صاحب نے فرمایا- جاؤ پتھر اٹھاؤ- تمہارا لڑکا اسی پتھر کے نیچے ہے- جہاں تم نے ہمارا پس خوردہ پان دبادیا تھا- عورت یہ سنتے ہی تیزی سے پتھر کے پاس گئی- دیکھتی کیا ہے کہ اس جگہ جہاں یہ گلوری دبائی تھی' ایک لڑکا پڑا ہوا کھیل رہا ہے- عورت کی جیسے ہی بچہ پر نظر پڑی- مادرانہ شفقت جوش مارنے لگی- چھاتیوں میں دودھ بھر آیا- عورت نے بچہ کو گود میں لیا اور قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی- ارشاد ہوا

لڑکا تمہیں مبارک ہو-

ایسے افسانے روایت اور درایت کے لحاظ سے جو بھی حیثیت رکھتے ہوں اس سے قطع نظر ہمارا منشاء یہ ہے کہ ایسے بیانات میں عشق و معاشقہ کا لفظ غیر محتاط ہی نہیں ہے- بلکہ سوء ادبی اور گستاخی ہے- یہ مصنوعی قلندر جو قلندری کے خرقہ اور پوستین میں اپنی اغراض پوری کرتے کے عادی رہے ہیں- وہ ایسے افسانوں کے موجد ہیں- جن کا حقیقت اور واقعیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے-

حضرت قلندر صاحب کی وفات اور آپ کا مزار

آٹھویں صدی ہجری کے چوبیسویں رمضان کا پہلا عشرہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ یہ تارک دنیا جو شہروں کی رونق- اور آبادیوں کی چہل پہل چھوڑ کر عرصہ سے بوڑھ کھیڑہ کے جنگل میں اپنی جھونپڑی ڈالے ہوئے تھا- ۹/ رمضان کی شب کو اس نے زندگی کے دھاگہ کو بھی توڑ دیا- اور تن تنہا عالم جاودانی کی طرف رخصت ہو گیا- تاریخ وفات اور مقام وفات میں اختلاف نہیں ہے- شرف المناقب کی روایت ہے کہ وفات کے وقت آپ تنہا تھے- حتیٰ کہ وہ رات اور اگلا دن گذر گیا- اور آپ کی لاش تنہا پڑی رہی- شام کے وقت کچھ لکڑہارے اپنے معمول کے مطابق حضرت قلندر صاحبؒ کی قدم بوسی کے لیے گئے تو دیکھا کہ حضرت قلندر صاحب رخصت ہو چکے ہیں- اور ان کا ''کالبد خاکی'' بے جان پڑا ہوا ہے- انہوں نے فوراً کرنال آکر خبر دی- ۱۱/ رمضان کو کرنال کے حضرات بوڑھ کھیڑہ پہونچے-

آپ کی لاش جال کے درخت کے نیچے ایک چبوترے پر جو ''زیرازیولا'' کے نام سے مشہور ہوگیا ہے- روبقبلہ پڑی ہوئی تھی- کرنال کے ان ارادت مندوں نے لاش اٹھائی اور کرنال لے آئے- جہاں غسل دیا گیا-

ابھی غسل سے فراغت نہیں ہوئی تھی کہ پانی پت کے حضرات پہونچ گئے اور اصرار کیا کہ وہ جنازہ کو پانی پت لے جائیں گے- کرنال والوں کی خواہش یہ تھی کہ مزار کرنال ہی میں ہو- مگر وہ رشتہ دار جو ولی کی حیثیت رکھتے تھے راضی نہیں

ہوئے-اور دلیل یہ تھی کہ خود حضرت قلندر صاحب پانی پت اپنی قبر کی جگہ تجویز
کر چکے ہیں- چنانچہ "سہ دابہ" بھی ہوا چکے ہیں- لہٰذا آپ کو آپ کی پسندیدہ
سرزمین میں دفن کرنا چاہیے-بالآخر ان کی تمنا اور ان کی کوشش کامیاب ہوئی-
کرنال والوں نے اجازت دی اور پانی پت کے حضرات جنازہ کو پانی پت لے آئے-
جہاں آپ کو آپ کی بنوائی ہوئی قبر میں دفن کر دیا گیا-

پانی پت سے کرنال پہونچنے والے حضرات اور ذریعہ اطلاع

پانی پت اور کرنال میں تقریباً اٹھارہ میل کا فاصلہ ہے- مادیات کے موجودہ
ترقی یافتہ دور میں اٹھارہ میل تو کیا اٹھارہ سو میل کے فاصلہ پر بھی چند سکنڈ میں
اطلاع پہونچائی جاسکتی ہے-لیکن اس زمانہ میں کہ خبر رسانی کا ذریعہ صرف قاصد ہوا
کرتے تھے-اور اٹھارہ میل کی مسافت پر خبر پہونچانے کے لیے "پیک تیز رفتار" کو
بھی پورا دن صرف کرنا پڑتا تھا-اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے-صورت یہ ہوئی کہ
۹/رمضان کا دن گزار کر شب کو وفات ہوئی--۱۰/کی شام کو اس کی اطلاع لکڑ
ہاروں کے ذریعہ کرنال پہونچی-۱۱/کی صبح کو کرنال کے حضرات بوڈھ کھیڑہ
پہونچے اور شام تک جنازہ کو کرنال لائے-اب تک یہ خبر کرنال ہی تک محدود
تھی-مگر کرنال کے حضرات نے رات گزار کر جیسے ہی صبح کو غسل دینا شروع کیا-
پانی پت کے حضرات پہونچ گئے-

سوال یہ ہے کہ جب خبر پہونچنا ممکن نہیں تھا-اور جس قدر ممکن تھا اس کا
کوئی اہتمام بھی نہیں کیا گیا تھا-تو یہ کیسے ہوا کہ شام سے لے کر صبح تک سرا
رات رات میں پانی پت خبر پہونچ گئی-اور نہ صرف خبر پہونچی بلکہ وہاں کے
حضرات چل بھی دیئے اور صبح کے وقت کرنال پہونچ بھی گئے-اس زمانہ کے ذرائع
کے لحاظ سے یہ سوال نہایت اہم ہے-اور غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ یقین کر لیا گیا کہ
کرنال سے پانی پت خبر پہونچانے کا ذریعہ "الہامی" تھا-

چنانچہ محمد بن احمد صاحب نے شرف المناقب میں اور عبدالسلام صاحب نے

صابری نے اپنے "جوانی" رسالہ میں تحریر کیا ہے کہ مولانا سراج الدین صاحب کی
جو پانی پت کے اولیاء اللہ میں سے تھے-اور حضرت قلندر صاحب سے خاص تعلق
رکھتے تھے-آپ نے ایسی حالت میں جس کو نہ نیند کہہ سکتے ہیں نہ بیداری-(اور
باصطلاح صوفیاء کرام "معاملہ")میں دیکھا کہ حضرت قلندر صاحب فرما رہے ہیں-

"مولانا جلد تشریف لایئے-میں اس دار فانی سے رخصت ہو
چکا ہوں-میری نعش کو پانی پت لے آیئے اور میرے نام کا جو
قبہ بنا ہوا ہے-وہاں دفن کر دیجئے-"

چنانچہ مولانا سراج الدین صاحبؒ کی جیسے ہی آنکھ کھلی-آپ نے حضرت
قلندر صاحب کے برادر زادہ شیخ احمد صاحب اور پانی پت کے مہاجر اور انصاری
خاندانوں کے سربرآوردہ حضرات کو جمع کیا-اور ان کے سامنے اپنے کشف کی
وضاحت کی-سب حضرات نے فوراً سامان سفر تیار کیا-اور کرنال روانہ ہو گئے-اور
ایک پہر دن گذرا تھا یعنی طلوع آفتاب سے تقریباً ایک گھنٹہ بعد یہ لوگ کرنال
پہونچ گئے-

ان جانے والوں میں ایک تو وہی بزرگ مولانا سراج الدین صاحب تھے جن
کو یہ مکاشفہ ہوا تھا-دوسرے حضرت قلندر صاحب کے برادر زادے شیخ احمد
تھے جو "زندہ پیر" کے نام سے مشہور تھے-اور ان کے علاوہ پانی پت کے مہاجر اور
انصار خاندانوں کے سربرآوردہ بزرگ تھے-

مزار شریف کہاں ہے

اس مضمون کے مطالعہ کرنے والے حضرات کو اس میں تردد نہیں ہوگا-کہ
حضرت قلندر صاحب کا مزار پانی پت میں ہے-مگر ان کو تعجب ہوگا کہ قلندر
صاحب کا مزار "کرنال" میں بھی ہے-اب یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ اصل مزار کون
سا ہے---پانی پت والا---یا کرنال والا---!

"روضہ اودر پانی پت ست-"(اخبار الاخیار وغیرہ)

اب یہ کرنال میں جو عظیم الشان عمارت قلندر صاحب کے نام سے مشہور ہے اس کی حقیقت کیا ہے- تو عبدالسلام صاحب چشتی صابری اس کی حقیقت یہ بیان فرماتے ہیں :

"پس خانقاہ واقع کرنال شاید نشست گاہ حضرت عالم جناب مسمی مثل بوڑھ کھیڑہ دیا گیوتی وغیرہ-"

کسی زمانہ میں کسی شخص نے بغرض اعتقاد انہیں روایات غیر صحیحہ پر نظر کر کے صورت مزار تجویز کرادی- جیسا زمانہ حال میں جائے چبوترہ قدیم نشست گاہ حضرت واقعہ (بوڑھ کھیڑہ) قبر بنائی گئی- حالانکہ پیشتر سے نہ تھی- لیکن فیض روحی- شرف الدین کا کل مواضع اقامت میں جاری ہے-

عبدالسلام صاحب چشتی صابری کا یہ سادہ بیان بظاہر صحیح ہے- مگر رنگین ٹن سوانح نگار یہ سادگی کب برداشت کر سکتے تھے- ان کی گلکاری ملاحظہ فرمائیے! صاحب شرف المناقب کے بیان کا ترجمہ یہ ہے :

طویل بحث ہوئی کہ جنازہ کرنال میں دفن کیا جائے یا پانی پت لے جایا جائے- مولانا سراج الدین صاحب نے جب دیکھا کہ ہر دو فریق اپنی اپنی بات کی پچ کر رہے ہیں تو آپ نے فرمایا :

"یاران طرفین رجوع بحضرت نمائند- آنچہ مرضی مبارک حضرت باشد بعمل بآرید-" (دونوں طرف کے دوست حضرت قلندر صاحب کی طرف رجوع کریں- جو کچھ مرضی مبارک ہوگی اس پر عمل کریں-)

فریقین نے مولانا سراج الدین صاحب کی یہ بات تسلیم کرلی- سر دست نزاع ملتوی ہوگیا-

دن گزر گیا- رات آئی' تو دونوں فریق جنازہ کے گرداگرد بیٹھ گئے- اور ،، اور قل پڑھنے لگے- اس وقت مولانا سراج الدین صاحب نے فرمایا-

حضرت قلندر صاحب! فرمائیے کیا مرضی ہے- مزار پانی پت میں بنے یا کرنال میں؟ بہت دیر ہوگئی کوئی بات نہیں کھلی- ٹھیک آدھی رات کا وقت تھا- کہ حاضرین میں سے ہر شخص نے محسوس کیا کہ حضرت قلندر صاحب فرما رہے ہیں-

دونوں شہر ہماری ولایت کے ماتحت ہیں- اس فقیر کا دونوں شہروں میں روزانہ گزر ہوتا ہے- بس آپ لوگ پریشان نہ ہوں-

"ما ایں جاء دہم بہ پانی پت حاضرم"

اس کے بعد قلندر صاحب نے فرمایا: کہ مولانا سراج الدین صاحب جو ہدایت فرمائیں اس پر عمل کیا جائے-

اب دونوں فریق مولانا سراج الدین صاحب کی طرف متوجہ ہوئے- مولانا نے فرمایا کہ صبح کے وقت مولانا کے جنازہ پر مالکورا کی راگنی قوال گائیں (یہ راگنی حضرت قلندر صاحب کو بہت پسند تھی) جب قوال یہ راگنی شروع کردیں تو دونوں فریق یکے بعد دیگر حضرت قلندر صاحب کا جنازہ اٹھائیں- جس فریق کے آدمی جنازہ کو اٹھا سکیں وہی اپنے یہاں لے جائیں اور دفن کردیں-

بہر حال مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ راگنی کے وقت اگر جنازہ کو حرکت ہو تو ہم پانی پت والے جنازہ اٹھائیں گے- اور اگر حرکت نہ ہو تو آپ لوگ یعنی کرنال والے جنازہ اٹھائیں-

صبح ہوئی تو مولانا سراج الدین صاحب کی ہدایت کے بموجب قوالوں نے راگنی شروع کی- اس وقت جنازہ پر اکثر اولیاء بزرگ اور چھوٹے بڑے عوام موجود تھے- راگنی میں گرمی آئی- تو دفعتہً حضرت قلندر صاحب کا دست مبارک کفن سے باہر آ گیا- اور اوپر کو اٹھ گیا- اور بدن میں بھی حرکت ہوئی- مولانا سراج الدین صاحب نے بسبب پاس شریعت قوالوں کو فوراً روک دیا (؟) جب قوال خاموش ہوئے تو مولانا نے کرنال والوں سے کہا جنازہ اٹھایئے- ان لوگوں نے ہر چند جنازہ اٹھانا چاہا جنازہ نہ اٹھ سکا- آخر کار کرنال والوں نے خود ہی پانی پت والوں سے کہا- کہ

اب آپ اٹھایئے- چنانچہ پانی پت والوں نے جیسے ہی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر جنازہ کو ہاتھ لگایا- جنازہ فوراً اٹھ گیا- اب پانی پت والے مطمئن ہوئے جنازہ کو تابوت میں رکھا- اور روانہ ہوگئے- شام تک پانی پت پہونچے اور ۱۲/ رمضان المبارک بپنجشبہ اور جمعہ کی درمیانی شب میں بعد نماز مغرب جنازہ کو دفن کر دیا-

صاحب شرف المناقب فرماتے ہیں کہ اس کی تصدیق کہ حضرت کا جنازہ پانی پت ہی میں دفن ہوا ہے اس سے بھی ہوتی ہے کہ اکثر اولیاء اللہ نے یہی تحریر فرمایا ہے-

چنانچہ سید محمود گیسو دراز گلبرگی- سید یداللہ دکھنی، شیخ عبدالحق دکھنی، شیخ امان پانی پتی، میر مودود لاری، شیخ عبدالرزاق جھنجانوی، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ روجن جیندی، شیخ موسیٰ رامپوری، شیخ محمد شریف اعظم آبادی نیاولی، شیخ عبدالرسول انبالوی، شیخ محمد نظام بلخی، مخدوم شیخ جلال الدین پانی پتی، شیخ بڈہ، اور شیخ محمد عثمان پانی پتی وغیرہ جیسے جلیل القدر اولیاء اللہ اور صاحب سلسلہ مشائخ نے یہی تحریر فرمایا ہے- اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے کہ مزار مبارک پانی پت میں ہے-

خطاب قتال اور وجہ خطاب

جہاں تک ہمارے مطالعہ کی وسعت ہے صرف شرف المناقب کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے آپ کو خطاب "قتال" بھی بتایا ہے- جس کے معنی ہیں- بہت قتل کرنے والا-

یہ خطاب- ایک رحم پرور، عاشق مزاج بزرگ کے لیے عجیب وغریب ہے- اور اس سے زیادہ عجیب وہ افسانہ ہے جس کو اس خطاب کی وجہ اور بنیاد بتایا گیا ہے-

مولانا ضیاء الدین صاحب سنامی کے سات لڑکوں کی شہادت جو بروایت شرف المناقب حضرت قلندر صاحب کی شان جلالی کا کرشمہ تھی وہ بھی اس خطاب کی وجہ بن سکتی تھی- مگر مصنف شرف المناقب کی اعجوبہ پسند طبیعت صرف سات کی شہادت پر قناعت پذیر نہیں ہے- وہ ایک برات کے جم غفیر کی ہلاکت کو اس خطاب کی وجہ گردانتی ہے-

افسانہ ملاحظہ فرمایئے:

مصنف شرف المناقب فرماتے ہیں- کہ کبھی کبھی حضرت قلندر صاحب پر استغراق کی ایسی کیفیت بھی طاری ہوتی تھی- کہ چڑیا کی چہک بھی ناگوار ہو جاتی تھی- اس وقت جس پر بھی نظر قہر پڑ جاتی وہ بھسم ہو جاتا تھا- چنانچہ ایک مرتبہ آپ پانی پت کے قریب "موضع باگھوتی" میں قیام فرما تھے- اور اسی کیفیت کا غلبہ تھا- کہ ایک پوری بارات نظر قہر کا شکار ہو گئی- صورت یہ ہوئی کہ بارات کے ڈھول تاشے آپ کو ناگوار ہوئے- اسی ناگواری کی حالت میں اس بارات پر نظر پڑ گئی- دفعتہً پوری بارات غائب ہو گئی- خانہ عروس پر بارات کا انتظار ہو رہا تھا- جب وقت پر بارات نہیں پہونچی تو اول انتظار کیا گیا اور جب مایوسی ہونے لگی تو بارات کی تلاش شروع کی گئی- مگر دلہن کے مکان سے لے کر دولہا کے عشرت کدہ تک ایک ایک کونہ چھان مارا کہیں سراغ نہ لگا- آخر کار کسی صاحب دل نے ایک بزرگ کا پتہ بتایا کہ ان کے ذریعہ شاید بارات کا کچھ پتہ، نشان مل سکے-

یہ تلاش کرنے والے ان کے پاس پہونچے- بزرگ نے پورا ماجرا سنا- تو ان کا دل بھر آیا- آپ نے درد بھرے انداز میں حضرت قلندر صاحب کا نام لیا- کہ ان کے پاس پہونچو- امید ہے کہ یہ عقدہ وہاں حل ہو جائے گا-

مگر اس کا خیال رہے کہ صبح سے لے کر وقت زوال تک ہرگز ہرگز قلندر صاحب کے پاس نہ جانا کہ وہ وقت خاص روحانی مشغولیت کا ہوتا ہے-

بہر حال بارات کے آدمی حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے شام کا وقت تھا- تقریباً ایک گھڑی دن باقی تھا- حضرت قلندر صاحب تالاب کے کنارہ پر بیٹھے ہوئے تھے اور پانی سے کھیل رہے تھے- یہ لوگ وہاں پہونچے تو ایک کنارہ پر دست بستہ کھڑے ہوگئے- حضرت قلندر صاحب کی نظر ان پر پڑی تو فرمایا کیسے کھڑے ہو؟ ان غریبوں نے اپنا تمام ماجرا سنایا- قلندر صاحب نے فرمایا:-

"اللہ کی نذر اور اس فقیر کی نیاز قبول کرو تو صاحب کن فیکون کے حکم سے وہ برات واپس آجائے گی-"

ان لوگوں نے عرض کیا کہ حضور کا جو حکم ہو تعمیل کی جائے گی۔ چنانچہ قلندر صاحب کا ارشاد ہوا کہ طعام سہ منی (تین من کھانا) نذر خدا تعالیٰ اور نیاز ایں فقیر قبول کیجئے۔

جب ان لوگوں نے یہ نذر مان لی تو حضرت قلندر صاحب نے فرمایا کہ آنکھیں بند کر لو۔ پھر حکم ہوا آنکھیں کھولو۔ اب ان سائلین نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا تمام بارات موجود ہے۔ خوش و خرم گانے بجانے میں مصروف ہے۔ اب بارات منزل کی طرف چلی۔ نکاح وغیرہ سے فراغت کے بعد حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں نذر و نیاز پیش کرنے کے لیے آئے تو ایک من گوشت کی یخنی۔ ایک من میدہ کی روٹی (پراٹھے) ایک من دہی مصالحہ ڈال کر حضرت قلندر صاحب کی نذر کیے۔ قلندر صاحب نے نذر قبول فرمائی اور فرمایا:-

"میرے وصال کے بعد جس کو بھی کوئی ایسی دشواری اور پریشانی لاحق ہو۔ وہ اسی طرح تین منی کھانا حلال کمائی کا سچے دل اور پورے اخلاص سے تیار کر کے اللہ کی نیاز اور اس فقیر کی نذر کے طور پر خانقاہ کے متوسلین اور مساکین میں تقسیم کر دے۔ مراد پوری ہو جائے گی۔"

نذر و نیاز حاصل کرنے کی اس ترکیب کو تحریر کرنے کے بعد صاحب شرف المناقب فرماتے ہیں:-

اکثر بزرگان معتبر گفتہ اند کہ بسبب ہمیں واقعہ برات نام حضرت شاہ شرف الدین قتال مشہور شد۔

بہر حال یہ خطاب اور وجہ خطاب کے طور پر یہ واقعہ صاحب شرف المنا[قب] کی تصنیف ہے۔ اس طرح کے اور بھی واقعات شرف المناقب میں خوارق [عادات] مناقب کے عنوان سے نقل کیے گئے ہیں ہم ان سب کے ذکر کرنے کے بجائے [ان کو] حذف کر دینا ہی ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ نذر و نیاز کے ان افسانوں کی شہادت [یہ] ہے کہ یہ افسانے ان کی تصنیف ہیں۔ جن کے مفادات ان مزارات سے وابستہ [ہیں]

گئے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی درگاہوں میں جہاں بھی آپ جائیں مجاور صاحبانِ مزار کے مناقب و محامد پر اسی قسم کے قصے بیان فرماتے ہیں:-

ہم عصر اصحاب کمال اور حضرت قلندر صاحب

۶۰۴ھ سے ۷۲۴ھ یعنی ساتویں صدی اور آٹھویں صدی کا پہلا ربع۔ یعنی حضرت قلندر صاحب کا زمانہ حیات مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں وہ سنہری دور ہے کہ وہ جلیل القدر علماء اور مشائخ جن کی محبت و عقیدت سے ہندی مسلمانوں کے دل لبریز اور گردنیں ان کے احترام میں خم ہیں وہ زیادہ تر اسی صدی میں جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ ان کا تذکرہ اگرچہ سرمایہ سعادت ہے۔ مگر اس سلسلہ مضمون کا موضوع صرف حضرت قلندر صاحب کے حالات تک محدود ہے۔ ان بزرگوں کی مقدس سوانح حیات کی گنجائش اس مضمون میں نہیں ہے۔ بلکہ یہاں صرف وہ واقعات لکھے جاتے ہیں جو حضرت قلندر صاحب کی طرف منسوب ہیں۔ اور جن کا تعلق اس زمانہ کے اکابر اور ارباب کمال میں سے کسی سے ہے۔

حضرت خواجہ علاؤالدین علی احمد صابر کلیری، حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی اور مخدوم المشائخ جلال الدین کبیر الاولیاء

حضرت خواجہ علاؤالدین علی احمد صابر کلیری۔ ہندوستان کے اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ حضرت خواجہ شکر گنج فرید الدین اجودھنی کے ممتاز خلیفہ۔ جو خواہر زادگی اور دامادی کا رشتہ بھی رکھتے تھے۔ جن کے متعلق حضرت خواجہ شکر گنج فرمایا کرتے تھے۔ کہ میرے دل کا علم علی احمد صابر کو ملا ہے۔ اور سینہ کا علم شیخ نظام الدین بدایونی کو۔

سلسلہ صابریہ۔ آپ ہی کے فیوض کا پرتو ہے۔ آپ کے اکابر خلفاء میں حضرت شمس کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پت کے اصل باشندے نہیں تھے۔ آپ ترکستان سے ہندوستان آئے اور حضرت خواجہ صابر کلیری کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ پھر یہاں تک تقرب حاصل کیا۔ کہ خطاب "فرزند" سے سرفراز ہوئے۔ ان اکابر نے رشد و ہدایت کے کچھ مرکز مقرر کر رکھے تھے۔ جن کو "ولایت" کہا کرتے تھے۔

چنانچہ حضرت خواجہ کلیری جب اپنی حیات طیبہ کے آخری ایام میں سلسلۂ رشد و ہدایت کے جاری رکھنے کے متعلق مریدین باخلاص کو خاص خاص ہدایتیں فرما رہے تھے۔ تو اس مرید صادق اور فرزند روحانی (حضرت شیخ شمس الدین ترک) کو خرقۂ خلافت اور تبرکات مشائخ عطا فرمانے کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی۔ "کہ میری وفات کے بعد تین دن گزار کر آپ پانی پت چلے جائیں۔"

اس مرید باخلاص نے عرض کیا کہ "ولایت پانی پت" حضرت شیخ بوعلی قلندر کے سپرد ہے۔ ارشاد ہوا۔ قلندر صاحب کی ولایت ختم ہو رہی ہے تم وہاں پہونچ جاؤ گے تو وہ شہر سے باہر اپنا ڈیرہ ڈال لیں گے۔

یہیں سے حضرت قلندر صاحب کی سوانح حیات کے ساتھ ان بزرگوں کے حالات کا جوڑ لگتا ہے۔ اب اصل واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت خواجہ کلیری کی وفات کے بعد جب حضرت شمس پانی پت پہونچے تو جیسا کہ شیخ کلیر نے فرمایا تھا۔ حضرت قلندر صاحب پانی پت سے روانہ ہو کر ایک قریہ میں پہونچ گئے۔ جس کا نام "باگھوتی" تھا۔ اس واقعہ سے جس کی صحت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت قلندر صاحب کی حیات مقدسہ کے چند پہلو سامنے آتے ہیں۔ مثلاً:-

۱- مشائخ طریقت نے ارشاد و تبلیغ کا جو نظام قائم کر رکھا تھا۔ آپ اس سے وابستہ تھے۔

۲- دہلی سے آپ کی روانگی بتقاضاء جذب نہیں ہوئی۔ بلکہ/جس طرح دہلی میں آپ کا قیام ایک نظم و ضبط کے ساتھ تھا۔ کہ اول دہلی کے مرکزی مقام "قوت الاسلام" میں ذمہ داری کے ساتھ فرائض درس و تدریس انجام دیا

رہے۔ پھر منصب قضاء سنبھالا تو اس کو بھی اسی پختگی سے انجام دیا۔ ایسے ہی ان علوم ظاہری اور شاہی تعلقات سے کنارہ کش ہونے کے بعد ارشاد و تبلیغ اور روحانی تربیت کے میدان میں قدم رکھا تو وہ بھی ایک نظام میں منسلک ہو کر سوچی سمجھی تدبیر کی طرح نظم و ضبط کے ساتھ تھا۔ مجذوبانہ اقدام نہیں تھا۔

۳- حضرت خواجہ کلیریؒ یعنی مرکز پانی پت کے ذمہ دار اعلیٰ آپ کے حالات سے واقف رہتے تھے۔ ایک طرف حضرت قلندر صاحبؒ کے سن اور عمر کا تقاضا تھا۔ دوسری جانب جذب و استغراق کی کیفیت روز افزوں تھی۔ اور اس بناء پر حضرت خواجہ کلیریؒ سمجھ چکے تھے کہ ارشاد و تبلیغ کی ذمہ داری اب قلندر صاحبؒ نہیں سنبھال سکیں گے۔ لہٰذا آپ نے حضرت شمسؒ کو مامور فرما دیا۔

۴- حضرت قلندر صاحب کو اپنی حالت کا خود اندازہ تھا۔ وہ اب شہری زندگی سے بھی اکتا چکے تھے۔ داعی جذب ان کو تنہا مقام کی طرف کشاں کشاں لے جا رہا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی حضرت شمس پانی پت پہونچے۔ قلندر صاحب شہر پانی پت کو چھوڑ کر گاؤں میں چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد قلندرانہ جذب نے اور ترقی کی تو اس چھوٹی سی آبادی کو بھی چھوڑ کر جنگل میں چلے گئے۔ جو موضع "بڈھ کھیڑی" کے قریب تھا۔

۵- چونکہ آپ مشائخ چشت کے نظام ارشاد و تبلیغ میں منسلک تھے۔ اس بناء پر آپ کا سلسلۂ بیعت بھی نظام کے ذمہ داروں سے جوڑ دیا گیا۔ یہاں تک کہ صاحب معارج الولایت نے لکھ دیا کہ آپ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خلیفہ ہیں۔ حالانکہ قطب صاحب قلندر صاحب کے دہلی رونق افروز ہونے سے بھی دس گیارہ سال پہلے (۶۳۳ھ یا ۶۳۴ھ) میں وفات پا چکے تھے۔ اسی طرح کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ آپ حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں (خزینۃ الاصفیاء) حالانکہ سلطان المشائخ کا تعلق حضرت قلندر صاحب سے ارادت مندانہ تھا۔ مرشدانہ نہیں تھا۔ جیسا کہ آئندہ روایت سے معلوم ہوگا۔

حضرت خواجہ شمس الدین ترکؒ اور قلندر صاحبؒ

مولانا غلام سرور صاحب خزینۃ الاصفیاء میں تحریر فرماتے ہیں :-

"حضرت خواجہ شمس الدین ترک جب پانی پت پہونچے ایک دیوار کے سایہ میں بیٹھ گئے- حضرت قلندر صاحب کو نور باطن سے آپ کی تشریف آوری کا علم ہو گیا- تو آپ فوراً اپنے حجرہ سے نکلے اور روانہ ہونے لگے- ایک حلوائی کا لڑکا جو خادم خاص اور قلندر صاحب سے بے تکلف تھا- اس نے دریافت کیا- آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں- قلندر صاحب نے جواب دیا کہ یہ "ولایت" ایک دوسرے صاحب کے سپرد کر دی گئی- وہ صاحب تشریف لے آئے ہیں میں ان سے ملنے جا رہا ہوں-"

حلوائی کے لڑکے نے کہا ان کی زیارت مجھے بھی کرا دیجئے-

فرمایا فلاں محلہ میں جاؤ- وہاں ایک صاحب دیوار کے سایہ میں بیٹھے ہوئے ملیں گے- قلندرانہ وضع ہے اور لباس چرمی پہنے ہوئے ہیں-

حلوائی کا لڑکا وہاں پہونچا- اور زیارت سے مشرف ہوا-

غالباً حضرت قلندر صاحب نے علیحدہ ملاقات کی- بہر حال ملاقات کے بعد قلندر صاحب حضرت شمس کو اپنے حجرہ میں لائے- اور وہیں آپ کا قیام کرایا-

کیا حضرت خواجہ کلیری پانی پت تشریف لائے؟

صحیح روایتوں سے یہی ثابت ہے کہ حضرت خواجہ شمس الدین ترک "حضرت خواجہ کلیری کی خدمت میں کلیر شریف رہا کرتے تھے- وفات کے وقت تک رہے اور وفات کے بعد اپنے شیخ و مرشد کے حکم کے مطابق پانی پت تشریف لے گئے- مگر صاحب شرف المناقب کا بیان یہ ہے :-

حضرت خواجہ علاؤالدین علی احمد صابر کلیری- کلیر سے حضرت خواجہ قطب الدین کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار شریف پر فاتحہ پڑھنے کے لیے دہلی جا رہے تھے تو آپ پانی پت بھی رونق افروز ہوئے- پانی پت کے تمام اہل اللہ اور اہل علم آپ سے ملاقات کے لیے گئے- مگر قلندر صاحب نہیں تشریف لے گئے- حضرت خواجہ کلیری نے حضرت شمس الدین ترک رحمۃ اللہ کو طلب فرما کر ارشاد فرمایا :-

"تم پانی پت میں رہو- یہی تمہارا قیام گاہ اور یہیں تمہاری آخری خواب گاہ ہوگی-"

جب یہ خبر حضرت قلندر صاحب کو پہونچی تو آپ نے فرمایا- بہت بہتر ہوا- بھائی شمس الدین یہاں مستقل قیام کریں گے- پھر آپ نے حضرت جلال الدین صاحب سے فرمایا- بھائی شمس الدین صاحب کے پاس جاؤ میری دعاء ان کو پہونچا دو- اور کہہ دو کہ ہم بھی تمہارے منتظر تھے-

مگر بظاہر صحیح روایت وہی ہے جو پہلے بیان کی گئی کہ حضرت ترک- حضرت مخدوم کلیری رحمہما اللہ کی خدمت میں آخر تک رہے اور وفات کے بعد پانی پت تشریف لائے تھے- یعنی حضرت خواجہ کلیری پانی پت تشریف نہیں لائے-

پھر یہ بات بھی بعید از قیاس ہے کہ حضرت خواجہ "صابر" نے کلیر سے دہلی جانے کے لیے سیدھا راستہ چھوڑ کر پانی پت پہونچنے کی زحمت کیوں اٹھائی- بہر حال ہمارا خیال یہ ہے کہ شرف المناقب کی یہ روایت ان لوگوں کی تصنیف ہے جو صرف یہ چاہتے ہیں کہ حضرت قلندر صاحب کا درجہ تمام بزرگوں سے بلند مانا جائے-

چنانچہ اس روایت کے بعد تحریر فرماتے ہیں :-

حضرت شمس الدین ترک رحمتہ اللہ علیہ نے ایک پیالہ میں پانی بھرا- اور حضرت مخدوم جلال الدینؒ سے فرمایا- یہ پیالہ حضرت قلندر صاحب کے پاس لے جاؤ- جب شیخ جلال الدین نے یہ پیالہ قلندر صاحب کی خدمت میں پیش کیا- تو آپ نے اس پیالہ میں گلاب کا پھول ڈال دیا- اور حضرت شیخ جلال الدین صاحب سے فرمایا کہ اس کو بھائی شمس الدین صاحب کے پاس لے جاؤ- اور کہدو- کہ کوئی پھول اس کی برابر نہیں ہے- پھر آپ نے شیخ جلال الدین صاحب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا- شمس الدین ترک سے کہدو' نقارہ قلندری چاردانگ عالم میں بج رہا ہے- فلک الافلاک پر بج رہا ہے- آپ ایک کنارہ پر ہیں ہم دوسرے کنارہ پر- آپ کی تشریف آوری ہے اس لیے مسرت ہے کہ یہاں آبادی میں پاسبان کی ضرورت تھی- اے برادر شمس الدین! اولیاء اللہ سب ایک ہیں- البتہ مراتب کا فرق ہے-

اور صاحب شرف المناقب تحریر فرماتے ہیں :-

آن عاشق الٰہی (قلندر صاحب) را خطاب بخشی الاولیاء از جناب رسول اللہ ﷺ عنایت شدہ واز جناب علی رضی اللہ عنہ بلاواسطہ فیض یافتہ اندر- واللہ اعلم بالصواب-

مخدوم المشائخ جلال الدین کبیر الاولیاءؒ

یہ پانی پت کے باشندے تھے- اصل نام محمد' والد صاحب کا اسم گرامی محمود' عثمانی خاندان' پیر روشن ضمیر' حضرت شیخ شمس الدین ترک رحمتہ اللہ علیہ نے خطاب جلال الدین سے نوازا- ارادت مندوں نے مخدوم اور کبیر الاولیاء کے القاب کا بھی اضافہ کر دیا- پانی پت میں آپ کے لیے صرف مخدوم صاحب کا لفظ استعمال ہوتا ہے- ۱۹۴۷ء میں خانقاہ اور مسجد پر غیر مسلموں کا قبضہ ہو گیا تھا- حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کی استقامت نے واگزار کرا کر پھر آباد کیا- اب مخدوم صاحب کی یہ درگاہ دینی تعلیم گاہ ہے-

حضرت مخدوم کو حضرت قلندر صاحب سے محبت وعقیدت تھی- آپ نے حضرت قلندر صاحب سے بیعت کی درخواست کی- مگر قلندر صاحب نے فرمایا- "آپ کا حصہ دوسرے کے یہاں ہے انہیں سے بیعت ہونا-"

ایک روز ایسا ہوا کہ حضرت شیخ جلال الدین صاحب عمدہ لباس پہن کر گھوڑے پر سوار کہیں جا رہے تھے- راستہ میں کسی جگہ حضرت قلندر صاحب بھی تشریف فرما تھے- ان کی نظر گھوڑے پر اور اس سوار پر پڑی-

آپ نے فرمایا: جلال الدین گھوڑا دوڑاؤ- شیخ جلال الدین صاحب نے گھوڑا دوڑایا- تب آپ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ صادر ہوئے- زہے اسپ و زہے سوار- پھر یہ شعر پڑھا-

گلگوں لباس کرد' و سوار سمند شد
یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد

حضرت قلندر صاحب کے ان اتفاقیہ فقروں کا شیخ جلال الدین صاحب پر بہت اثر ہوا- اب تک قلندر صاحب سے محض محبت ہی تھی- اور آج یہ عالم ہوا کہ:

"ہرچہ از دنیا بدست داشتم ازاں بیروں آمد و آن اسپ را نیز للہ

بکسے دادوراہ صحرا گرفت -"

ترجمہ: دنیا کا جو مال و متاع بھی ان کی ملکیت میں تھا - سب سے
دامن جھاڑ لیا اور اس گھوڑے کو بھی راہ خدا میں کسی کو دے دیا
اور جنگل کا راستہ لیا -)

کچھ عرصہ بعد وہ وقت آیا کہ حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پت تشریف
لائے تو حضرت قلندر صاحب نے بھی حضرت مخدوم جلال الدین رحمتہ اللہ علیہ کو
ہدایت فرمائی - کہ حضرت ترک کی خدمت میں حاضر ہوں - اور ان کے چشمہ فیض
سے اپنا حصہ حاصل کریں -

شوق اختراع

سیدھی سی بات ہے کہ حضرت خواجہ صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ کو حضرت
قلندر صاحب کی حالت کا احساس ہوا کہ وہ اب تبلیغ و ارشاد کا فرض انجام نہیں
دے سکتے تو آپ نے اس مرکز کے لیے حضرت خواجہ شمس الدین ترکؒ کو مامور
فرمایا - اور جیسے ہی حضرت ترک پانی پت پہونچے تو حضرت قلندر صاحب نے
اطمینان و مسرت کا اظہار فرمایا - خود صاحب شرف المناقب کی روایت ہے -
حضرت ترکؒ کے اس تقرر اور تعیناتی کی خبر حضرت قلندر صاحب کو پہونچی تو
آپ نے فرمایا :-

الحمد للہ برادر شمس الدین اینجا مستقیم شد خوب شد -

(خدا کا شکر - بھائی شمس الدین صاحب یہاں مستقل ہو گئے -
اچھا ہوا -)

پھر فرمایا :-

وطن من بے پاسبان بود - مخدوم علی احمد صابر شمارا دریں جا
پاسبان گذاشت -

(میرے وطن کا کوئی پاسبان نہیں تھا - مخدوم علی احمد صابرؒ نے
آپ کو اس جگہ پاسبان مقرر کیا ہے -)

اب خود حضرت قلندر صاحب کے احساس کا تقاضا تھا کہ وہ اس مرکز کو
حضرت خواجہ ترک کے لیے خالی کر دیں - چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا - حضرت
ترک کو بلا کر اپنے حجرہ میں مقیم کیا اور خود "باگھوتی" تشریف لے گئے -

مگر سوانح نگاروں کا ذوق اختراع ملاحظہ ہو - کہ اس واقعہ کو کس طرح افسانوی رنگ
دیگر ایک عجوبہ بنایا ہے - تعجب ہے ان کو اس عجوبہ پسندی میں اس کا خیال بھی نہیں رہتا -
کہ کسی بزرگ کو شیر یا بھیڑیئے کی شکل میں پیش کرنا اس کی تعظیم و احترام نہیں ہے بلکہ
توہین ہے - کیونکہ درندے تو کیا فرشتے بھی انسانوں سے افضل نہیں ہیں - تو جو صاحب
تصرف اکابر اولیاء اللہ شرف انسانیت سے واقف ہیں وہ کب برداشت کر سکتے ہیں - کہ
جامہ انسانیت کو چھوڑ کر شیر کی شکل میں نمودار ہوں - لیکن مصنف شرف المناقب کی
عجوبہ پسندی بلکہ عجائب پرستی ملاحظہ ہو - تحریر فرماتے ہیں :-

ایک روز حضرت مخدوم جلال الدین کہیں تشریف لے جا
رہے تھے - راستہ میں حضرت قلندر صاحب کا قیام گاہ پڑتا تھا -
مخدوم صاحب جب وہاں پہونچے تو دیکھا کہ قلندر صاحب کی
جگہ ایک شیر بیٹھا ہوا ہے - مخدوم صاحب کچھ دیر ہیبت زدہ
حیران کھڑے رہے - پھر آپ نے فرمایا - اے شیر یہ جگہ
شیروں کی نہیں ہے - شیر کو جنگل میں رہنا چاہیے - یہ عاشقوں
کی جگہ ہے مخدوم صاحب نے جیسے ہی یہ فرمایا - شیر اٹھا اور اس

نے جنگل کی راہ لی- حضرت مخدوم صاحب بھی شیر کے پیچھے روانہ ہوگئے- یہاں تک کہ یہ شیر "باگھوتی" پہونچ گیا- مخدوم صاحب کچھ فاصلہ پر کھڑے ہوئے شیر کی حرکتیں دیکھ رہے تھے- دفعتہً چار شیر اور نمودار ہوئے اور آپس میں کھیلنے لگے- مخدوم صاحب کی حیرانی اور بڑھ گئی- یہ یہاں کھڑے ہوئے شیروں کا تماشہ دیکھ رہے تھے کہ ناگاہ حضرت قلندر صاحب سامنے آگئے- مخدوم صاحب نے سلام کیا- قلندر صاحب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا- میاں جلال الدین تم ہمارے محرم کار اور رازوں سے واقف ہو- یہاں کھڑے ہو کر اطمینان سے شیروں کا تماشہ دیکھو- پھر یہ شیر آگے بڑھے اور مخدوم صاحب کے پیروں کو بوسے دینے لگے- اور بلیوں کی طرح آپس میں کھلاری کرنے لگے حضرت قلندر صاحب نے فرمایا- جلال الدین تم جانتے ہو- پانچواں شیر کون ہے؟ پھر قلندر صاحب نے فرمایا- پانچواں شیر میں ہوں- تمہاری دلداری کے لیے پانی پت چھوڑ کر یہاں آگیا ہوں- مخدوم جلال الدین صاحب کو جب حقیقت کا انکشاف ہوا تو آپ حضرت قلندر صاحب کے قدموں پر گر گئے- اور بوسہ دینے لگے- حضرت قلندر صاحب نے فوراً آپ کو اٹھایا- اور مخدوم صاحب کی پیشانی پر بوسہ دیا- مخدوم صاحب نے اسی وقت بیعت کی درخواست کی- حضرت قلندر صاحب نے معذرت کرتے ہوئے فرمایا-

"نصیبہ ظاہری بر آمدن دیگر شخص موقوف است- حق تعالیٰ ترا از اولیاء کامل کنانندہ است- وفقیر ہم در حق تو دعا گفتہ است-"

(بظاہر آپ کا حصہ ایک شخص کے آنے پر موقوف ہے- حق تعالیٰ آپ کو اولیاء کامل میں سے کرنے والے ہیں- فقیر نے بھی آپ کے لیے دعا کی ہے-)

بہر حال جب ایک نظام کے ماتحت حضرت قلندر صاحب "باگھوتی" تشریف لے گئے- تو اس افسانہ کی ضرورت نہیں ہے- جس میں خود تضاد موجود ہے- کہاں خود بخود تشریف لے جانا- اور کہاں شیر بن کر نکالے سے نکلنا- (معاذ اللہ) تعجب ہے- جناب غلام سرور صاحب نے بھی خزینۃ الاصفیاء میں اسی طرح کا ایک افسانہ ٹانک دیا ہے- آپ فرماتے ہیں:-

جب حضرت شمس الدین کلیر سے پانی پت تشریف لائے تو چند روز بعد آپ کا خادم حضرت قلندر صاحب کی قیام گاہ کے پاس سے گذرا- وہاں دیکھا کہ قلندر صاحب شیر کی شکل اختیار کیے ہوئے بیٹھے ہیں- خادم خوف زدہ ہو کر واپس آیا- اور حضرت ترک کو اس کی خبر دی- حضرت شیخ شمس الدین ترک نے خادم کو ہدایت فرمائی کہ وہ پھر جائیں اور شیر سے کہدیں کہ شیر کی جگہ جنگل ہے- آبادی میں شیر نہیں رہا کرتے- چنانچہ یہ شیر فوراً اٹھا- اور اسی صورت میں پانی پت سے نکل کر پانی پت سے کافی فاصلہ پر اس جگہ قیام فرمایا- جس کو "باگھوتی" کہتے ہیں (یعنی شیر کے رہنے کی جگہ- کیونکہ "باگھ" ہندی میں شیر کو کہتے ہیں-) چند سال قلندر صاحب نے یہاں قیام فرمایا- پھر آپ موضع "بڈھا کھیڑہ" تشریف لے گئے-

سلطان المشائخ نظام الدین محبوب الٰہیؒ اور حضرت امیر خسروؒ

یہ بزرگ اردو طبقہ کے لیے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ کیونکہ اپنے روحانی کمالات کے علاوہ یہ دونوں بزرگ اردو زبان کے موجد اور مشترک تہذیب کے بانی بھی مانے جاتے ہیں۔ حضرت محبوب الٰہی سلطان اولیاء ۱۷/ ربیع الاول ۷۲۵ھ تک اور حضرت امیر خسرو چھ ماہ بعد ۱۸ شوال ۷۲۵ھ تک رونق بخش عالم ظاہر رہے۔

حضرت قلندر صاحب ان کی وفات سے پانچ ماہ اور گیارہ دن پہلے ۱۷/ رمضان ۷۲۴ھ کو اس عالم سے رخصت ہو چکے تھے۔

وفات میں اگرچہ مہینوں کا فرق ہے۔ مگر عمروں میں تقریباً ۲۵ سال اور تقریباً ۴۵ سال کا فرق ہے۔ کیونکہ حضرت سلطان المشائخ کا سنہ ولادت ۶۳۴ھ ہے اور حضرت امیر خسرو کا ۶۵۰ھ۔

اگر یہ صحیح ہے کہ حضرت قلندر صاحب ۶۴۴ھ میں دہلی تشریف لے گئے۔ اور چالیس پچاس سال تک وہاں درس و افتا اور قضا کی خدمت انجام دیتے رہے۔ تو حضرت قلندر صاحب کے زمانہ قیام میں حضرت سلطان المشائخ دہلی پہونچ چکے ہیں۔ قرین قیاس یہ ہے کہ قیام دہلی کے زمانہ میں بھی ان بزرگوں کی ملاقات ہوئی ہو گی۔ لیکن ہمیں حضرت امیر خسرو کی صرف اس ملاقات کا علم ہو سکا ہے جو دہلی میں نہیں۔ بلکہ پانی پت جانے کے بعد ہوئی ہے۔

واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ علاؤالدین خلجی متوفی ۷۱۵ھ نے حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں کچھ ہدایا بھیجنے چاہے۔ اور حضرت امیر خسروؒ کو اس کے لیے منتخب کیا۔

سلطان نے حضرت امیر کے شیخ طریقت حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی سے بھی اس کی اجازت حاصل کی۔ حضرت محبوب الٰہی نے اجازت دیتے ہوئے حضرت امیر خسرو کو ہدایت فرمائی۔

اے خسرو شرف الدین پانی پتی انچہ فرماید سعادت خود دانستہ قبول نمائی در ہیچ وجہ اعراض نہ کنی۔

(اے خسرو شرف الدین پانی پتی جو کچھ بھی فرمائیں اس کو اپنی سعادت اور نیک بختی سمجھ کر قبول کر لو اور کسی صورت سے بھی انکار نہ کرو۔)

جب حضرت امیر نے شرف زیارت حاصل کیا۔ تو ابتدائی تعارف میں قلندر صاحب نے دریافت فرمایا۔ آپ ہی کو خسرو کہتے ہیں۔ حضرت امیر اس زمانہ کی تہذیب کے مطابق اپنی ٹوپی قلندر صاحب کے قدموں میں ڈال کر آداب بجا لائے۔ پھر دست بستہ عرض کیا۔ اس خادم ہی کو خسرو کہا جاتا ہے۔

اس سوال و جواب کے بعد قلندر صاحب سر مراقبہ ہو گئے۔ استغراقی کیفیت آپ پر طاری ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھایا تو امیر خسرو نے عرض کیا۔ سلطان علاؤالدین نے سلام عرض کیا ہے۔ اور کچھ ہدیئے بھیجے ہیں۔ انہیں قبول فرمائے۔

حضرت قلندر صاحب نے فوراً چونک کر جواب دیا۔

عزیز من! چالیس سال ہو گئے محویت طاری ہے۔ دنیا اور دنیاوی ساز و سامان تو درکنار، مجھے خود اپنی خبر نہیں۔ ان ہدیوں اور تحفوں کو لے کر کیا کروں گا۔

ابھی معذرت کا یہ جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ فرمایا۔ میاں خسرو، آپ شاعر ہیں۔ مناسب وقت کچھ پیش کرو۔

حضرت امیر نے یہ غزل شروع کی:۔

انچہ گوئی ہیچ سخنے جز فراق یار نیست

(میں جو بات بھی کہوں وہ فراق یار کی بات ہو گی اس کے سوا کوئی بات نہیں)

چون امید وصل آں ہمچناں دشوار نیست

(کیونکہ اس کے وصل کی امید ہے یہ اتنی دشوار بات نہیں ہے-)

عاشقان را در جہاں یکساں نباشد روزگار

(عاشقوں کے لیے دنیا میں یکساں زمانہ نہیں رہتا-)

زانکہ ایں انگشتہاؤ ست من ہموار نیست

(جس طرح میرے ہاتھ کی انگلیاں یکساں نہیں ہیں-)

خلق را بیدار باید بودد زاب چشم من

(میری آنکھوں کے پانی سے مخلوق کو جاگ جانا چاہیے-)

ایں عجب آں وقت میگریم کہ کس بیدار نیست

(یہ تعجب کی بات ہے-ایسے وقت رو رہا ہوں کہ کوئی بیدار نہیں ہے)

یک قدم بر نفس نہ واں دگر در کوئے دوست

(ایک قدم اپنے نفس پر رکھو-دوسرا دوست کے کوچہ میں)

ہرچہ بینی دوست بین با این و آنت کار نیست

(تمہاری نظر میں جو کچھ بھی ہو وہ دوست ہی دوست ہو این و آن سے کوئی کام نہ ہو)

چند میگوئی برو زنار نبددے بت پرست

(کتنا کہو گے-اے بت پرست جاؤ زنار باندھو-)

بر تن خسرو کدامی رگ کہ آں زنار نیست

(خسرو کے بدن میں ایسی کون سی رگ ہے جو زنار نہیں ہے)

قلندر صاحب بہت محظوظ ہوئے-اور فرمایا:-

خسرو خوش میگوئی خوش خواہی بود خوش خواہی رفت-

(خسرو خوب کہتے ہو-خوش رہو گے-خوش جاؤ گے)

پھر ارشاد فرمایا: میری غزل بھی ملاحظہ فرمائیے:-

دہیم خسروان براں نعل استرست

(بادشاہوں کا تاج اس شخص کی نظر میں جوتیوں کا تلا ہے)

خسرو کسے کہ خلعت تجرید در برست

(بادشاہ وہ ہے جو ترک دنیا کی خلعت پہنے ہوئے ہے)

سیمرغ وار روئے نہم من بقاف عشق

(میں سیمرغ کی طرح عشق کے کوہ قاف کا رخ کیے ہوئے ہوں)

کو عارفے کہ منظر او عرش اکبرست

(ایسا عارف کہاں ہے کہ عرش اکبر پر اس کی نظر ہو)

عقل کل ست علم لدنی بعارفاں!

(عارفوں کے یہاں علم لدنی عقل کل ہے-)

این عقل و علم حسی درشی محضر است

؟

درس شرف نبود ازا لواح اجدی

(شرف الدین کا سبق ابجد کی تختیوں سے نہیں ہوتا)

لوح جمال دوست مراد را برابر است

(جمال دوست کی لوح اس کے لیے موزوں و مناسب ہے-)

حضرت قلندر صاحب نے اشعار کچھ اس سوز گداز سے پڑھے کہ حضرت امیر خسرو پر یہاں تک گریہ طاری ہوا کہ آپ بے قابو ہو گئے- قلندر صاحب نے ازراہ ظرافت پنجابی زبان میں فرمایا:

خسرو روندا ہے کچھ سمجھدا بھی ہے-

(خسرو روتے ہو کچھ سمجھتے بھی ہو)

حضرت امیر خسرو۔ شاہی دربار کے سلیقہ مند مصاحب، جتنے بڑے سخن شناس تھے ایسے ہی نکتہ سنج بھی تھے۔ قدموں پر ٹوپی ڈال کر دست بستہ جواب دیا:

ازاں مے گریم کہ نے دانم ونے فہم

حضرت (اسی پر روتا ہوں کہ نہ کچھ جانتا ہوں نہ کچھ سمجھتا ہوں)

حضرت قلندر صاحب اس جواب سے اتنے خوش ہوئے کہ بے اختیار زبان پر تحسین و آفریں کے الفاظ جاری ہو گئے۔ اور حضرت امیر پر بہت کچھ عنایت و نوازش فرمائی۔ پھر خادم خاص "شیخ احمد زندہ پیر" کو حکم فرمایا کہ حضرت امیر کو خانقاہ میں لے جاؤ۔ اور کم از کم تین دن تک مہمانداری کے فرائض انجام دو۔ چنانچہ تین روز تک آپ خانقاہ میں قیام فرما رہے۔ خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا۔

تین روز بعد حضرت امیر نے اجازت لیتے ہوئے درخواست کی کہ سلطان علاؤالدین کے لیے کچھ تحریر فرما دیا جائے۔

آپ نے کاغذ کا ایک معمولی سا پرزہ اٹھایا۔ اور اس پر تحریر فرما دیا:۔

علاؤالدین خلجی خوطہ دہلی۔ مقرر دارند کہ بندگان خدا تعالیٰ زندگانی نیکو کند۔

(مطلب چند صفحات کے بعد علاؤالدین خلجی کے حالات میں بیان کیا گیا ہے)

حضرت امیر خسرو نے اس وقت پھر درخواست کی "شاہی ہدیئے قبول ا لیے جائیں۔" "حضرت قلندر صاحب کا جواب وہی تھا۔ تب حضرت امیر دریافت کیا۔ کہ پھر ان کا کیا کروں۔

فرمایا: آپ کو اختیار ہے۔ جو مناسب سمجھیں کریں۔

حضرت امیر خسرو: خانقاہ کے لوگوں کو دیدوں۔

فرمایا: تمہیں اختیار ہے۔

بہر حال حضرت امیر خسرو ان ہدیوں کو خانقاہ والوں کو تقسیم کر کے رخصت ہونے کے لیے قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

حضرت عرصہ سے آرزو تھی کہ سر قدموں میں ڈالوں۔ پائے مبارک کو بوسہ دوں اور آنکھیں ملوں۔

قلندر صاحب نے فوراً جواب دیا۔

"اے برادر نزد ما میا۔ کہ اینجا آتش سوزاں ست۔"

(اے بھائی ہمارے پاس نہ آنا۔ ہمارا وجود دہکتی ہوئی آگ ہے۔)

(اس سے زیادہ آتش سوزاں کیا ہو سکتی ہے کہ شرعاً پسندیدہ نہیں۔ محمد میاں)

پھر امیر خسرو کو رخصت فرمایا۔

دوسری ملاقات

صاحب شرف المناقب نے ایک اور ملاقات کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ مگر وہ سراسر مصنف کے عجائب پسند مذاق کا نمونہ بلکہ شاہکار ہے۔ فرماتے ہیں:

حضرت امیر خسرو ایک مرتبہ از خود قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند روز قیام کیا۔ ایک روز حضرت قلندر صاحب نے فرمایا:۔

میاں خسرو۔ کیا بات ہے۔ آنحضرت ﷺ کی مجلس مبارک میں حاضری ہوتی ہے تو وہاں تمام اولیاء اللہ کو دیکھتا ہوں۔ لیکن حضرت نظام الدین کہیں نظر نہیں پڑتے۔

حضرت امیر خسرو۔ اس کا جواب کیا دے سکتے تھے۔ آپ نے حضرت سلطان جی کی طرف رجوع کیا۔ حضرت سلطان المشائخ محبوب الٰہی نے فرمایا۔ خسرو حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں دوبارہ جاؤ۔ اور ان سے کہو کہ مجلس مبارک میں جہاں سرور کائنات رونق افروز ہوتے ہیں تو حضرت کی پشت کی جانب ایک مخدع (چھوٹا

ساحجرہ یا کھڑکی) ہے۔ فقیر کو اس مخدعہ میں تلاش فرمائیں۔

حضرت امیر نے قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر یہی جواب عرض کر دیا۔

حضرت قلندر صاحب نے فرمایا۔ اچھا خسرو' آج ہم اور تم دونوں اس مجلس مبارک میں حاضر ہوں۔ اور حضرت نظام الدین کو تلاش کریں۔ چنانچہ جب یہ دونوں مجلس مبارک میں حاضر ہوئے۔ وہاں جملہ اولیاء حاضر تھے۔ حضرت امیر تو انہیں اولیاء کرام کی صف میں کھڑے رہے۔ مگر حضرت قلندر صاحب چکر کاٹ کر اس مخدعہ کے قریب پہونچ گئے۔ لیکن ہمت نہ ہوئی کہ پردہ اٹھائیں۔

یہ شعر زبان پر آگیا۔ البتہ :۔

پردہ بردار کہ تا عارض جاناں بنگرم
ورنہ از آہ جگر پردہ عالم بدرم

(پردہ اٹھایئے تاکہ رخ جاناں دیکھ لوں۔ ورنہ آہ جگر سے سارے عالم کا پردہ چاک کر دوں گا)

آنحضرت ﷺ نے قلندر صاحب کی آواز سنی تو فرمایا۔ کیابات ہے کیا چاہتے ہو۔ حضرت قلندر صاحب نے دست بستہ عرض کیا۔ سلطان الاولیاء محبوب الٰہی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

ارشاد ہوا۔ آؤ دیکھو۔ محبوبیت کی مسہری پر رونق افروز ہیں۔

حضرت بو علی قلندر زمین بوس ہو کر آداب جالائے۔ پھر اس پردہ کی ملرا. پہونچے دیکھا کہ :

شیخ نظام الدین محبوب الٰہی بر مصلی سفید در غایت معشوقی و رعنائی نشستہ اند۔ دیدہ و شکر الٰہی جاآوردند۔

(شیخ نظام الدین محبوب الٰہی۔ نہایت معشوقی اور رعنائی انداز میں سفید جانماز پر تشریف رکھتے ہیں۔ قلندر صاحب نے آپ

کی زیارت کی اور اللہ کا شکر ادا کیا)

یہ شرف المناقب کی روایت ہے۔ اور شرف المناقب ہی کی تخصیص نہیں۔ حضرات مشائخ کے تذکروں میں ایسے قصے بہت سے ملیں گے۔ ایسی روایتوں سے وہ اپنے خیال میں صاحب سوانح کا تو درجہ بلند کرتے ہیں۔ مگر اس کو قطعاً نظر انداز کرتے ہیں کہ ایسی روائتوں سے خود انکی پوزیشن خطرہ میں ہو جاتی ہے کیونکہ صادق مصدوق سرور کائنات کا ارشاد ہے۔

من کذب علی متعمداً فلیتبوا مقعد من النار۔

(جو شخص میرے متعلق قصداً کوئی جھوٹی بات بیان کر رہا ہے۔ وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا رہا ہے۔)

جب تک وحی کے ذریعہ صداقت واضح نہ ہو جائے اس قسم کے افسانوں میں آنحضرت ﷺ کا ذکر خیر (معاذ اللہ) شان اعلیٰ و ارفع سے گراہوا۔ اور اس حدیث کا مصداق ہے۔

شیخ احمد یحیٰ و شیخ شرف الدین منیری رحمہم اللہ متوفی ۷۸۲ھ

شیخ احمد یحیٰ اور ان کے فرزند رشید شرف الدین بن احمد یحیٰ۔ سلسلہ فردوسیہ کے جلیل القدر مشائخ میں سے ہیں۔ قصبہ منیر ضلع پٹنہ عظیم آباد صوبہ بہار میں ان کے مزارات ہیں۔ ریاضت و مجاہدہ اور کرامتوں کے تذکرے آج تک زبانوں پر ہیں۔ شیخ شرف الدین کے مکتوبات جو اہل ذوق کے لیے حقائق و معارف کے جواہر گراں مایہ ہیں۔ حضرت شیخ کے کمالات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

صاحب شرف المناقب کا بیان ہے کہ شیخ احمد یحیٰ حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اولاد کے لیے دعاء کی درخواست کی۔ حضرت شیخ شرف الدین اسی دعاء کا ثمر ہیں۔ اور یہ نام بھی حضرت قلندر صاحب کا عطیہ ہے کیونکہ قلندر صاحب نے قبولیت دعا کی بشارت دیتے ہوئے حضرت شیخ احمد یحیٰ سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ بچہ کا نام "شرف الدین" رکھیں گے۔

صاحب شرف المناقب نے دعا کے بعد حضرت احمد یحییٰ صاحب کے سفر بہار اور راستہ میں ایک عورت کی طرف سے درخواست نکاح وغیرہ کا افسانہ بھی ذکر کیا ہے۔ مگر یہاں اس کا تذکرہ قطعاً غیر ضروری ہے۔ بلکہ صحیح مذاق والوں کے لیے تکلیف دہ ہے۔ اس لیے اس کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔

حضرت قلندر صاحب اور شاہان دہلی

۶۰۴ھ سال ولادت قلندر صاحب سے لے کر سال وفات ۷۲۴ھ تک ایک سو بیس (۱۲۰) سال کے عرصہ میں شاہان دہلی کے خاندانوں میں ۱۱ تبدیلیاں ہوئیں۔

خاندان غلامان
خاندان تغلق
خاندان خلجی

حضرت قلندر صاحب کی پیدائش قطب الدین ایبک کے دور حکومت میں ہوئی۔ بلکہ آپ کا سال ولادت قطب الدین کا سنہ جلوس ہے۔ ۶۰۴ھ مطابق ۱۲۰۶ء اس کے بعد بالترتیب بادشاہوں کے نام یہ ہیں۔

از خاندان غلامان

قطب الدین ایبک از ۶۰۴ھ ۱۲۰۶ء تا ۶۰۸ھ ۱۲۱۰ء
شمس الدین التمش از ۶۰۸ھ ۱۲۱۰ء تا ۶۳۴ھ ۱۲۳۶ء
رضیہ سلطانہ از ۶۳۴ھ ۱۲۳۶ء تا ۶۳۷ھ ۱۲۳۹ء معزول کر کے قید کر دی گئی۔
معزالدین از ۶۳۷ھ ۱۲۳۹ء تا ۶۳۹ھ ۱۲۴۱ء معزول
علاؤالدین مسعود از ۶۳۹ھ ۱۲۴۱ء تا ۶۴۴ھ ۱۲۴۶ء معزول
ناصرالدین محمود از ۶۴۴ھ ۱۲۴۶ء تا ۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء
غیاث الدین بلبن از ۶۶۴ھ ۱۲۶۵ء تا ۶۸۶ھ ۱۲۸۷ء

معزالدین کیقباد از ۶۸۶ھ ۱۲۸۷ء تا ۶۸۹ھ ۱۲۹۰ء قتل کر کے جمنا میں لاش ڈالدی گئی۔
شمس الدین کیومرث از ۶۸۹ھ ۱۲۹۰ء بچپن میں تخت پر بٹھایا گیا۔ اور چند ماہ بعد قتل کر دیا گیا۔ یہ قتل کیا ہوا اس خاندان کی سلطنت ہی ختم ہو گئی۔

خاندان خلجی

جلال الدین خلجی از ۶۸۹ھ ۱۲۹۰ء تا ۶۹۵ھ ۱۲۹۵ء
علاؤالدین خلجی از ۶۹۵ھ ۱۲۹۵ء تا ۷۱۵ھ ۱۳۱۵ء
شہاب الدین عمر از ۷۱۵ھ ۱۳۱۵ء اسی سال قطب الدین مبارک اول نے قتل کر دیا۔
قطب الدین مبارک اول از ۷۱۶ھ ۱۳۱۶ء تا ۷۲۰ھ ۱۳۲۰ء مقتول
ناصرالدین خسرو از ۷۲۰ھ ۱۳۲۰ء تا ۷۲۵ھ ۱۳۲۴ء مقتول
خلجی خاندان کی سلطنت ختم

خاندان تغلق

غیاث الدین تغلق اول از ۷۲۰ھ ۱۳۲۰ء تا ۷۲۵ھ تا ۱۳۲۴ء
وفات حضرت قلندر صاحب رمضان ۷۲۴ھ

بادشاہوں کے تعلقات

اس سلسلہ میں قابل اعتماد واقعہ تو ایک ہی ملتا ہے۔ جس کا تذکرہ حضرت امیر خسرو کے سلسلہ میں آچکا ہے۔ کہ علاؤالدین خلجی نے حضرت امیر کو حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں کچھ ہدیئے دے کر بھیجا تھا۔ اور جب حضرت امیر نے واپسی کے وقت درخواست کی۔ کہ قلندر صاحب بادشاہ کچھ تحریر فرمادیں۔ تو حضرت قلندر صاحب نے ایک پرزہ کاغذ پر لکھ کر دیدیا تھا کہ :

علاؤالدین خلجی خوطہ دہلی مقرر دارند کہ بہ بندگان خدا تعالیٰ زندگانی نیکو کنند۔

یہ فقرہ چھوٹا سا ہے- مگر اس وقت کے حالات نے اس چھوٹے سے فقرہ کو بہت زیادہ معنی خیز بنا دیا تھا- اس مختصر فقرہ میں ایک طرف بادشاہ کو اس کی حقیقت بتادی گئی ہے- دوسری جانب اس کے فرض سے اس کو آگاہ کیا گیا ہے-

خوطہ غالباً ترکی لفظ ہے- محصول (مالگذاری) کو کہتے ہیں - جو تحصیلدار وصول کیا کرتے ہیں-

تحصیلدار یعنی سب ڈویژن کا افسر اگرچہ آج کل اس علاقہ کا کوتوال یا مجسٹریٹ نہیں ہوتا- مگر اس زمانہ میں عموماً یہ تینوں کام ایک ہی شخص کے متعلق ہوا کرتے تھے- یعنی حفاظت' انصاف اور واجبی مطالبوں کی وصولی-

پس "خوطہ دہلی" کے معنی ہیں- کوتوال' تحصیلدار' اور اگر یہی مجسٹریٹ بھی ہو تو اس کے مفہوم میں "منصف" بھی داخل ہوگا- پس خوطہ دہلی کے لفظ نے بادشاہ کی حیثیت ظاہر کردی- دوسرے فقرہ میں اس کا فرض یاد دلایا گیا ہے- فرض وہی ہے جس کے درد کی ٹیس ان بزرگوں کے دلوں کو ہر وقت مضطرب رکھا کرتی تھی- یعنی خدمت خلق اور ہمدردی بندگان خدا-

اب یہاں ایک اور لطیفہ بھی قابل تذکرہ ہے- وہ یہ کہ جب یہ پرزہ بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوا- تو حضرت امیر خسرو نے تو غالباً اس کو اپنا کارنامہ سمجھا- م خوشامدی مصاحب جن کی فطرت ہی نیش زنی ہوتی ہے-

بقول حضرت شیخ سعدیؒ

نیش عقرب نہ از پئے کین ست
مقتضائے طبیعتش این ست

بادشاہ کو چڑھانا چاہا کہ ان خود فریب صوفیوں کے دماغوں میں کتنا تکبر ہے- شاہانہ آداب کا بھی لحاظ نہیں کرتے- کاغذ کا پرزہ خود توہین آمیز' اس پر سراپا فقرہ- جس میں نہ القاب و آداب اور نہ سلام و دعا-

غرض بادشاہ کو برافروختہ کرنے کی کافی گنجائش تھی اور اس گنجائش سے لینے کی پوری کوشش کی گئی- مگر بادشاہ کے دل میں چور تھا- جس کا

احساس تھا-

وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس نے دہلی کے بادشاہ کو جو اس کا مربی- چچا اور خسر بھی تھا- دھوکے سے قتل کر کے گورنری کے بجائے بادشاہت حاصل کی ہے- یہ خرقہ پوش خانہ بدوش فقراء اگرچہ نظام حکومت اور ملکی سیاست سے ان کا تعلق نہیں ہے مگر بے شمار بندگان خدا کے دلوں پر یہ حکومت کرتے ہیں- اگر ان کے تیور بگڑے رہے تو اس کی بادشاہت ریت کا تودہ ہے- اس کو اپنی بادشاہت کے استحکام کی فکر تھی- کہ ایک طرف حضرت امیر خسرو کے ذریعہ سلطان المشائخ کی خوشنودی حاصل کر رہا تھا اور دوسری جانب امیر خسرو جیسے بذلہ سنج شاعر' صاحب ذوق ادیب اور باسلیقہ مصاحب کے ذریعہ حضرت قلندر صاحب کا گوشہ التفات حاصل کرنا چاہتا تھا-

علاؤالدین خلجی کامیاب رہا- اس کے بیش بہا ہدیے تو نظر قلندر کو بادشاہ کی طرف مائل نہیں کر سکے- البتہ حضرت امیر خسرو کی سلیقہ مندی نے زبان قلندر سے کہلوالیا-

خوش خواہی بود' و خوش خواہی رفت

بادشاہ کا یہی احساس اور تاثر تھا کہ ان خوشامدی مصاحبوں کو جواب دیا-

"اے نادانان ہزار ہا ہزار رحمت بر من کرد کہ خوطگی دہلی بر من ارزانی داشت-"

اے نادانوں مجھ پر قلندر صاحب نے لاکھوں مہربانیاں کی ہیں- کہ دہلی کی خواجگی مجھے بخش دی-

سلطان علاؤالدین خلجی کے علاوہ حضرت قلندر صاحب کے سلسلہ میں اور بھی چند بادشاہوں کے واقعات بیان کیے گئے ہیں- مثلاً :

(۱) سلطان محمد تغلق کے متعلق روایت ہے کہ اس نے حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں ایک رباعی بھیجی اور درخواست کی کہ قلندر صاحب اس کا جواب ارشاد فرمائیں- رباعی یہ تھی :-

کہ راست کند صورت مردی و زنی
کہ بشکند ایں طلسم جانی و تنی
کس نیست کہ استاد قضا را پرسد
کز بہر چہ سازی و چرا مے شکنی

کون ہے جو مرد اور عورت کی صورت بناتا ہے کون ہے جو اس جان و تن کے جادو کو توڑتا ہے کوئی نہیں ہے جو استاد قضا سے سوال کرے کیوں تو بناتے ہو اور کیوں توڑتے ہو؟

حضرت قلندر صاحب نے فی الفور یہ رباعی موزوں کی اور سلطان کے پاس بھیج دی۔

شرط ست کہ در امر خدا دم نزنی
این نوع کہ ہستی تو نہ مردی نہ زنی
گل راچہ مجال ست کہ گوید بہ کلال
کز بہر چہ سازی و چرا مے شکنی

شرط ہے کہ خدا کے معاملہ میں دم نہ مارو۔ تم جس نوعیت سے ہو یہ ایسی صورت ہے کہ نہ تم مرد ہو نہ عورت مٹی کی کیا مجال کہ کمہار سے پوچھے، کیوں تو بناتے ہو اور کیوں بگاڑتے ہو۔؟

اس ادبی چھیڑ چھاڑ سے تقریباً ایک سال بعد سلطان حضرت قلندر صاحب کے پاس پہونچا اور دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ حضرت قلندر صاحب نے بادشاہ پر نظر ڈالی۔ اور فرمایا: بادشاہ "کے روز یہاں رہو گے"

بادشاہ نے کہا "تین دن"

حضرت قلندر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "چار سال"

تغلق کو احساس ہوا کہ شاید میری زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ ادبا یہاں تک بڑھا کہ اس نے خزانوں کے دروازے کھول دیئے۔ اور بہت کچھ دا

تقسیم کر ڈالی۔ پھر واقعہ یہی ہوا کہ جیسے ہی چار سال پورے ہوئے سلطان کی وفات ہو گئی۔

یہ واقعہ اگر صحیح ہے تو بادشاہ کا نام غلط لکھا گیا ہے۔ کیونکہ سلطان محمد تغلق تو حضرت قلندر صاحب کی وفات کے بعد بادشاہ بنا۔ پھر پندرہ سال زندہ رہا ہے۔ بظاہر غیاث الدین تغلق اول کا یہ واقعہ ہے۔ وہ حضرت قلندر صاحب کے آخری دور ۷۲۰ھ میں بادشاہ ہوا اور ۷۲۵ھ میں مکان اس پر گر گیا جس میں وہ دب کر مر گیا۔

(۲) فیروز شاہ ابھی بادشاہ نہیں ہوا تھا۔ سن شعور کا آغاز تھا۔ وہ حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور پابوس ہونے کی اجازت چاہی۔ جب قدم مبارک کو بوسہ دے چکا تو حضرت قلندر صاحب نے فرمایا۔ کیا نام ہے۔

فیروز شاہ نے عرض کیا۔ کمال الدین۔

ارشاد ہوا: عمر بکمال، دولت بکمال، و نعمت بکمال۔

(۳) ایک مرتبہ تین بچے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تینوں ہوشیار مہذب اور باسلیقہ تھے۔ قلندر صاحب نے خادم کو حکم دیا۔ کہ ان کو کھانا کھلائیں۔ خادم ایک طشت میں کھانا لایا۔ تینوں لڑکوں نے بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کر دیا۔ حضرت قلندر صاحب نے تینوں کو ایک ہی "کاسہ" میں کھاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

"سبحان اللہ سہ بادشاہ دریک کاسہ طعام مے خورند۔"

چنانچہ یہ تینوں لڑکے بعد میں بادشاہ بنے۔ ایک سلطان تغلق۔ دوسرا سلطان محمود۔ تیسرا سلطان فیروز۔

خاتمہ کلام

ایک طویل تحریر جس کو آپ ختم کر رہے ہیں۔ جب اس کا سلسلہ شروع کیا۔ تو صرف ایک "مقالہ" کا ارادہ تھا۔ جو اخبار کے چند کالموں میں آجاتا۔ مگر جیسے جیسے حضرت قلندر صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر غور شروع کیا۔ مضامین کا ایک سیلاب امڈنے لگا۔ اور طبیعت مجبور ہوئی کہ جہاں تک ممکن ہو ان کو قلم بند کرے۔

اولیاء اللہ کا احترام ہمارا عقیدہ ہے- اولیاء اللہ کی کرامات کے بھی ہم قائل ہیں- مگر رموز تصوف سے ناواقف ہیں اس بنا پر اہل تصوف کی اصطلاحات کو بھی استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھتے- مگر اس موقع پر اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے- کہ اہل تصوف کی اصطلاحات سے مدد لیں- اور یہ عرض کردیں کہ اس مضمون کی ترتیب کے وقت ایسی صورت پیش آئی جس کو روحانی تصرف کہا جاسکتا ہے- یعنی اس مضمون یا کتاب کے کسی بھی حصہ پر جب غور کرنا شروع کیا تو ایسی باتیں ذہن میں آئیں- جن کا پہلے سے وہم و گمان بھی نہیں تھا- اور یہ یقین مستحکم ہوگیا- کہ یہ حضرت قلندر صاحب کا روحانی تصرف ہے- رحمتہ اللہ-

بہر حال یہ کتاب اگر قابل قبول ہے تو وہ صرف حضرت قلندر صاحب کی کرامت ہے اور بس- رحمتہ اللہ-

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

محمد میاں

۲۰ رجب ۱۳۸۲ھ ۱۸/ دسمبر ۱۹۶۲ء

حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی

یہ وہی قطب وقت، مرشد کامل اور صاحب خدمت ہیں- جن کی تشریف آوری کا تذکرہ حضرت قلندر صاحب کے حالات میں گذر چکا ہے کہ جیسے ہی آپ پانی پت میں فروکش ہوئے- حضرت قلندر صاحب نے اپنے حجرہ مقدسہ سے بستر لپیٹنا شروع کردیا- حلوائی کے لڑکے نے جب کہا- حضرت والا کہاں کو؟ تو ارشاد ہوا:

"یہ ولایت (علاقہ) ایک دوسرے صاحب کو سپرد ہوگیا ہے
وہ تشریف لے آئے ہیں- اب مجھے اجازت نہیں ہے کہ میں
یہاں قیام کرسکوں-"

ہم انہیں قطب اور ابدال کیوں کہتے ہیں اور سلسلہ چشتیہ صابریہ ان پر کیوں ناز کرتا ہے- وہ آپ کا عظیم الشان ایثار ہے- آپ کی حیرت انگیز قربانی ہے آپ کا لرزہ خیز مجاہدہ ہے-

خدا جانے کیا دھن تھی جس نے آپ کو وطن عزیز سے نکالا- سینکڑوں میل پاپیادہ چلایا- خطرناک جنگلوں اور پہاڑوں کو طے کراتے ہوئے ہندوستان پہونچایا اور پانی پت میں اس طرح آراستہ کردیا کہ وہیں کے ہوگئے- وہیں دفن ہوئے وہیں مزار بنا- اور اسی خاک پاک سے قیامت کے روز آپ کا شاہانہ جلوس آئے گا- (انشاءاللہ)

وطن اور سلسلہ نسب

مولانا غلام سرور صاحب نے معارج الولایت کے حوالہ سے نقل کیا ہے- کہ خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی- شیخ احمد یسوی کے فرزندوں میں سے ہیں- چند واسطوں سے آپ کا سلسلہ نسب حضرت محمد بن حنفیہ بن علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ تک پہونچتا ہے-

صاحب سیر الاقطاب تحریر فرماتے ہیں کہ آپ کا وطن اصلی ترکستان ہے- اور آپ سادات میں سے ہیں-

سیر الاقطاب میں چند پشتوں تک آپ کے بزرگوں کے نام بھی تحریر کیے ہیں- شیخ شمس الدین ترک ' ابن سید احمد بزرگ ' ابن سید عبدالمومن ' ابن سید عبدالملک ' ابن سید سیف الدین ' ابن خواجہ قرعتاد ' ابن بابا قرعتاد-

قرعتاد ' غالباً ترکی لفظ ہے- بابا قرعتاد کے بعد کا سلسلہ درج نہیں ہے- بہر حال نام کی عجمیت سے اتنی بات ظاہر ہے کہ سلسلہ نسب میں ابھی بہت سے واسطے اور ہیں- اور یہ کہ کافی مدت سے یہ خاندان ترکستان میں آچکا ہے- یہاں تک کہ نام پر بھی عجمیت کا اثر پڑ گیا- پھر چونکہ بابا قرعتاد کے بعد سلسلہ کے دوسرے بزرگوں کے نام صاحب سیر الاقطاب کو بھی معلوم نہیں ہے- لہٰذا اس کی تردید نہیں ہو سکتی کہ آپ محمد بن حنفیہ کی اولاد میں سے نہیں ہیں- نہ اس کا کوئی ثبوت ہے کہ آپ فاطمی ہیں- پس فیصلہ یہی کرنا پڑتا ہے کہ آپ علوی سادات میں سے ہیں-

تعلیم اور تاھل

مولانا غلام معین الدین صاحب مصنف معارج الولایت تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ شمس الدین رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے وطن ہی میں علوم ظاہری کی [illegible] کی- اور جیسا کہ آئندہ سیر الاقطاب کے حوالہ سے نقل ہوگا- آپ وہاں [illegible] اہل و عیال بھی ہو گئے- پھر آپ طلب حق میں اپنے وطن سے روانہ ہوئے [illegible] ہمارے خیال میں طلب حق کے جائے صحیح یہ ہے کہ آپ طلب مولیٰ اور جستجو [illegible] میں وطن سے روانہ ہوئے- ترکستان کو خیرباد کہا- ماورالنہر پہونچے- وہاں کے [illegible] مشائخ سے استفادہ کیا- مگر تسکین نہیں ہوئی تو ہندوستان کا رخ کیا- سینکڑوں [illegible] کی مسافت طے کر کے آپ "اجودھن" پہونچے- جہاں حضرت بابا فرید الدین [illegible] شکر رحمتہ اللہ علیہ کا دربار جما ہوا تھا- جہاں درد دل کے مریضوں کا دار الشفاء [illegible] یہاں کتنا عرصہ آپ نے "دل صدپارہ" کی مرہم پٹی میں صرف کیا [illegible]

نہیں- البتہ "صاحب سیر الاقطاب" کی شہادت یہ ہے کہ آپ اس دار الشفاء سے یہاں تک فیضیاب ہوئے کہ عشق حقیقی کی سند یعنی خرقہ خلافت آپ کو عطا ہو گیا- خرقہ خلافت سند عشق ہے- اس سے میکدہ عشق میں داخلہ ہو سکتا ہے- مگر یہ داخل ہونے والا ساقی نہیں بن سکتا-

یہ جو ترکستان سے وادی عشق کے سنگریزوں اور خار مغیلاں کو بوسہ دیتے ہوئے آئے تھے- صرف اپنی سرمستی اور اپنی وارفتگی پر راضی نہیں ہو سکتے تھے جب تک وہ جام و سبو ہاتھ نہ آجائے جو دوسروں کو بھی اسی طرح سرمست اور وارفتہ بنا سکے-

جب حضرت شمس الدین ترکؒ نے اس جذبہ کے ساتھ آستانہ فریدی پر نظر ڈالی ' تو جواب یہ ملا- کہ ساقی میکدہ بنتا ہے تو ہمارے صابر کی خدمت میں حاضری دو-

مخدوم المشائخ حضرت خواجہ علاؤالدین صابر کلیری جو اپنے ماموں اور مربی روحانی حضرت فریدالدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ مطبخ اور لنگر خانہ کے بارہ سال تک منتظم و مہتمم رہے اور ایک نوالہ کسی کھانے کا نہیں چکھا- کیونکہ حضرت شیخ کی طرف سے جب خدمت اہتمام سپرد ہوئی تو واضح الفاظ میں اس کی اجازت نہیں دی گئی تھی-

یہ احتیاط بھی قابل قدر تھی- مگر اس سے زیادہ قابل قدر وہ ضبط و تحمل اور وہ اخفا تھا کہ بارہ سال تک کسی کو خبر نہیں ہونے دی کہ اپنے خورد و نوش کا فاقہ مستانہ نظام مطبخ سے قطعاً جدا ہے- جس کا ہنڈیا چولہا جو کچھ بھی ہے- وہ "توکل" ہے-

غالباً ضبط و اخفا کی یہی بے نظیر طاقت تھی جس نے حضرت خواجہ فریدالدین رحمتہ اللہ علیہ کو موہ لیا- چنانچہ جب حضرت گنج شکرؒ کو علم ہوا تو وجد آفریں کیفیت پیدا ہوئی اور بے اختیار زبان مبارک سے نکلا-

علاؤالدین علی احمد ما صابر ست (ہمارا علاؤالدین علی احمد "صابر" ہے)

حضرت شیخ کی زبان مبارک سے لفظ "صابر" اس طرح ادا ہوا کہ یہی لفظ خطاب بن گیا- اور یہاں تک مشہور ہوا کہ حقیقی نام کی روشنی بھی اس کے سامنے ماند پڑ گئی-

یہی "صابر" ہیں جن کی خدمت میں حاضری اور جن کی بارگاہ سے وابستگی کا حکم حضرت ترکؒ کے لیے حضرت گنج شکر کی بارگاہ سے صادر کیا جا رہا ہے۔

اب حضرت "ترک" رحمتہ اللہ علیہ کی نکتہ شناسی ملاحظہ ہو۔ کہ حضرت "صابر" کے دامن سے وابستہ ہوئے تو اسی "جوہری وصف" کو اپنے لیے بھی منتخب کر لیا۔ جو خطاب "صابر" کی بنیاد تھا۔

"محتاط خدمت" حضرت خواجہ علاؤ الدین علی احمد کا طرۂ امتیاز تھا۔ اسی گوہر آبدار کو حضرت "ترک" نے اپنے امتیاز کے لیے بھی منتخب فرمایا۔ چنانچہ پندرہ سال تک حضرت شیخ کے وضو اور غسل اور عام مہمانوں کے لیے کھانا پکانے اور جنگل سے لکڑیاں لانے کی خدمت اپنے ذمے لئے رکھی۔ اور اس خوش اسلوبی ت انجام دیتے رہے کہ حضرت شیخ کی طرف سے جب "خرقہ خلافت" عطا ہوا تو فرزند کا خطاب بھی "سونے پر سہاگے" کا کام کر رہا تھا۔ اور حضرت شمس الدین ترک دوچند مبارکباد کے مستحق تھے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ان چند نکتوں کی بھی وضاحت کر دی جائے۔ جن کو ارباب طریقت کی اصطلاح میں "رموز" کہا جا سکتا ہے۔ اور جو اس موقع پر دامن غور و فکر کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

(۱) مصیبت کے وقت جزع فزع نہ کرنا اور خاموش بیٹھے رہنا بھی صبر ہے۔ مگر صرف اسی کیفیت میں صبر کا انحصار نہیں ہے۔ "صبر" در حقیقت ایک طاقت ہے ایسی طاقت کہ رب العزت نے اس سے مدد لینے کی ہدایت فرمائی ہے "استعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ (صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو) یہ ا[illegible] طاقت ہے جس کا دوسرا نام "ضبط و تحمل" ہے۔ مصائب کو جھیلنا۔ اور پیشانی پر شکن نہ آنے دینا۔ نصب العین پر اس طرح جم جانا کہ بڑی سے بڑی مصیبت اور [illegible] سے سخت حادثہ بھی پائے استقلال میں جنبش نہ پیدا کر سکے۔ یہ ایک طاقت [illegible] جس کا نام صبر ہے۔ جس سے تاریخی زندگی کے ہر ایک موڑ پر واسطہ پڑتا [illegible] حضرت خواجہ گنج شکر نے جب علاؤ الدین علی احمد کو صابر فرمایا۔ تو گویا معنی "صبر"

کی تفسیر بھی کر دی۔ وہ ضبط و تحمل کی مثبت طاقت ہے۔ جس کی تصویر حضرت علی احمد کلیری نے اپنے عمل سے پیش کی۔

(۲) ہمیں ان بزرگوں کے اوصاف خصوصی میں صرف "رقص و سماع" یاد رہ گیا۔ حالانکہ حضرت صابر کی خصوصیت وہ غیر معمولی تقویٰ ہے۔ جس نے بارہ سال برابر مطبخ کے ایک ایک دانہ کو حرام بنائے رکھا۔ حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ حضرت صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ کے ماموں تھے۔ ماموں کی غیر معمولی شفقت تھی یا حضرت کلیری کی غیر معمولی سعادت اور صلاحیت کہ آپ کو حضرت فرید "فرزند" بھی فرمایا کرتے تھے۔ جب تعلقات اس درجہ ہوں تو کھانے پینے کی چیزوں میں رکھ رکھاؤ نہیں رہا کرتا۔ قرآن حکیم نے بھی اس کی اجازت دی ہے کہ ایسے تعلقات میں بلا اجازت بھی کھا پی سکتے ہو۔ سورہ نور)

لیکن اس گہری یگانگت کے باوجود جو شخص اتنا محتاط ہو۔ کہ بارہ سال تک متوکلانہ زندگی کی دشواریاں اور تلخیاں برداشت کرتا رہے۔ اور ایک دانہ بھی مطبخ سے نہ چکھے۔ کیونکہ ان کو مطبخ کا "امین" اور مہتمم بنایا گیا تھا۔ اور "امین" کے لیے احتیاط اور تقویٰ یہی ہے کہ خیانت کا کم سے کم اور کمزور سے کمزور شبہ بھی نہ آنے دے۔ کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ وہ رب العزت کے دوسرے احکام اور رسول خدا ﷺ کے ارشادات کے بارہ میں محتاط اور متقی نہ ہو گا۔

افسوس سوانح نگاروں نے اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالی۔ مگر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جو عقل کی روشنی سے پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت صابر اپنے دور کے عظیم الشان متقی اور پرہیزگار بھی تھے۔ ظاہر ہے جو شخص انسانی حقوق میں اس درجہ متقی ہو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حق میں کیا کچھ متقی نہ ہو گا۔

(۳) ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے لفظ ترک بھی مشہور ہو گیا تھا۔ حضرت خواجہ شمس الدین صاحب مسلمان تھے اور ترکستان سے بھی آئے تھے۔ لیکن حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتی کی تحقیق یہ ہے کہ حضرت شیخ شمس

الدین رحمتہ اللہ علیہ کے لیے جو لفظ بطور خطاب استعمال ہوتا ہے وہ ترک (تا کے
زبر کے ساتھ) ہے۔ جس کی ہندی "تیاگ" ہے۔ اور ظاہر ہے اس سے بڑھ کر
ترک اور تیاگ کیا ہو سکتا ہے کہ آپ نے وطن چھوڑا۔ اہل و عیال چھوڑے۔ مال و
متاع چھوڑا' جو کچھ تھا سب ہی ترک کر کے راہ خدا میں قدم رکھا۔ اور جب حضرت
صابر اور ان کے مہمانوں کی خدمت ذمہ لی۔ جس کے لیے لکڑیاں جنگل سے لانی
پڑتی تھیں تو ظاہر ہے "آرام و سکون" بھی ترک کر دیا۔ اہل و عیال کو ترکستان میں
چھوڑا تو اس طرح کہ پھر آخر تک "تجرد" کی زندگی بسر کی۔ اتباع سنت کے لیے
صرف پہلی شادی ہی کو کافی سمجھا۔ "ترک" تاء کے پیش کے ساتھ اس لیے بھی
قرین قیاس نہیں کہ آپ نسلاً ہاشمی اور علوی سید تھے۔

فوجی ملازمت

سوانح نگاروں کا متفقہ بیان ہے کہ حضرت خواجہ شمس الدین ترک "غیا
الدین بلبن" کی فوج میں بھرتی ہوئے۔ اور ایک عرصہ تک فوجی خدمات انجا
دیں۔ خیال ہو سکتا ہے کہ شاید ہندوستان میں آپ کی تشریف آوری طلب معا
کے لیے ہو جیسا کہ اس وقت کا معمول تھا۔
لیکن اگر آپ کا یہ سفر طلب معاش کے لیے ہوتا تو آپ کے قدم "دہلی" ک
طرف اٹھتے۔ دہلی دار السلطنت تھا۔ اور پنجاب کا دار الحکومت لاہور یا ملتان تھا
لیکن آپ نے نہ لاہور کا رخ کیا نہ دہلی کی سمت دیکھا۔ آپ سیدھے اجودھن گئے
جو "راہ عشق کی منزل" تھی۔
ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ کو جیسے ہی حضرت خواجہ صابر کلیری کی وفا
کا علم ہوا تو فوج سے رخصت ہو کر "کلیر شریف" پہونچ گئے۔ جہاں حضرت صا
رحمتہ اللہ علیہ کا جنازہ مبارک بے گور و کفن تھا۔ ایک شیر اس کی حفاظت کر رہا
لیکن یہ روایت اس لیے غلط ہے کہ غیاث الدین بلبن جس کی فوج میں آ
تھے۔[1] اور اس کی زندگی ہی میں آپ مستعفی ہو گئے۔ اس کی وفات حضر

کلیری کی وفات (۶۹۰ھ) سے چار سال پہلے ۶۸۶ھ میں ہو چکی تھی۔
اس کے برعکس صاحب سیر الاقطاب نے تحریر کیا ہے کہ :-
آپ پندرہ سال تک حضرت خواجہ کلیری کی خدمت میں حاضر رہ کر غسل
وضو' کھانا پکانے اور جنگل سے لکڑیاں لانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کے
بعد آپ فوج میں ملازم ہوئے اور اخفاء کی زندگی بسر کرنے لگے۔ پھر جب فوج میں
آپ کی کشف و کرامت کا ظہور ہوا۔ اور آپ کے اخفاء کا پردہ چاک ہونے لگا تو آپ
فوج سے مستعفی ہو کر "پیر روشن ضمیر" کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ کچھ عرصہ
بعد آپ کو خرقہ خلافت عطا ہوا۔ اور "پانی پت" کا حلقہ آپ کے سپرد ہوا۔
صاحب معارج الولایت نے لکھا ہے :-

> جب حضرت خواجہ علی احمد کلیری رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کا زمانہ
> قریب ہوا تو آپ نے خرقہ خلافت عطاء فرمایا اور پانی پت جانے
> کی اجازت بخشی۔ مگر یہ بھی ارشاد فرمادیا کہ میری وفات کے بعد
> تین روز یہاں قیام کریں پھر پانی پت تشریف لے جائیں۔

فوجی ملازمت کب کی؟

بہر حال یہ تو عقل اور نقل دونوں سے ثابت ہو گیا کہ جب حضرت خواجہ
صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو آپ فوج میں ملازم نہیں تھے۔ بلکہ فوجی
ملازمت ترک کر کے آ چکے تھے۔
پھر جب کہ سوانح نگاروں کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ آپ غیاث الدین بلبن
متوفی (۶۸۶ھ) کے زمانہ ہی میں فوجی ملازمت سے کنارہ کش ہو کر کلیر شریف
اپنے پیر روشن ضمیر کی بارگاہ میں حاضر ہو چکے تھے۔ تو ظاہر ہے آپ ۶۸۶ھ (سال
وفات بلبن) سے ایک دو سال قبل اور ممکن ہے اس سے بھی زیادہ عرصہ پہلے کلیر
شریف واپس آ چکے ہیں۔
پھر جب یہ بھی صحیح ہے کہ پندرہ سال آپ حضرت خواجہ کی خدمت میں کلیر

شریف رہنے کے بعد فوجی ملازمت کے لیے گئے تھے تو کلیر شریف میں آپ کی حاضری ۶۶۰ھ سے پہلے ہو چکی ہے-

حضرت خواجہ فرید الدین شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ کے سال وفات میں اختلاف ہے- آپ کا سال وفات ۶۶۰ھ-۶۶۶ھ اور ۶۷۰ھ بتایا گیا ہے-

ہم احتیاطاً پہلی روایت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ۶۵۹ھ یا ۶۶۰ھ میں حضرت خواجہ ترک- اجودھن سے کلیر حاضر ہوئے- پندرہ سال حضرت "صابر" کی خدمت کی- پھر تقریباً ۶۷۶ھ میں فوجی ملازم ہوئے- اور پانچ چھ سال ملازمت کر کے تقریباً ۶۸۲ھ میں پھر حضرت صابر کے آستانہ پر آپڑے- اور اب آخری تربیت اور تکمیل کے بعد آپ کو تقریباً ۶۹۰ھ میں پانی پت کا علاقہ سپرد ہوا- اور یہ ہدایت فرمائی گئی کہ حضرت صابرؒ کی وفات سے چند روز بعد آپ پانی پت تشریف لے جائیں-

اس سے حضرت قلندر صاحب کی سوانح کا بھی ایک حصہ سامنے آجاتا ہے کہ ۶۹۰ھ کا وہ دور تھا کہ آپ پر کیفیت جذب طاری ہو چکی تھی- حتیٰ کہ سلسلہ ارشاد و تربیت آپ کے بجائے حضرت خواجہ ترک کے سپرد ہوا- اور آپ کو پانی پت سے باہر تشریف لے جانے کی ہدایت ہوئی- ہم نے حضرت قلندر صاحب کے تذکرہ میں تحریر کیا ہے- کہ غیاث الدین بلبن کی وفات کے بعد طوائف الملوکی کے بھیانک دور نے آپ کی حساس طبیعت پر خاص اثر کیا تھا- واقعات کی مندرجہ بالا ترتیب سے اس کی بھی توثیق اور تائید ہو جاتی ہے- (واللہ اعلم بالصواب)

فوجی ملازمت کیوں کی؟

دربار "اجودھن" میں داخلہ، وہاں ذکر و شغل اور ریاضت و مجاہدہ پھر حضرت گنج شکر کے ارشاد پر کلیر شریف میں حاضری- حضرت صابر کی غلامی- اور پندرہ سال تک غلامانہ خدمت، نیاز مندی، اور تعلقات دنیا سے یہاں تک کنارہ کشی کہ آپ کا خطاب ہی "ترک" ہو گیا-

...ج کی ملازمت، اور فوج بھی ایک بادشاہ کی فوج، جس کے لیے ... کہ وہ پابند شریعت ہو-

...غیاث الدین اگرچہ نیک خصلت بادشاہ تھا- مگر تاہم بادشاہ تھا- بادشاہت سے اسلام کو جو نفرت ہے- اس کا اندازہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے ہو سکتا ہے- کہ:

"اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ قابل نفرت خطاب یہ ہے کہ کسی کو "ملک الاملاک"- "شاہنشاہ" کہا جائے- (ترمذی شریف)

پھر عجیب لطیفہ یہ ہے کہ مصنف سیر الاقطاب جو ان بزرگان سلسلہ صابریہ چشتیہ کے سب سے بڑے مداح ہیں- تحریر فرماتے ہیں کہ جب حضرت مخدوم خواجہ علاؤالدین علی احمد صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ نے آپ کو پانی پت بھیجنے کا ارادہ فرمایا- تب:

"عرض کرد کہ بندہ ہنوز لیاقت آں ندارد- اگر فرمان شود- چندگاہ مزدوری کند- حضرت مخدوم التماس ایشان قبول نمودہ رخصت فرمود-"

ترجمہ: عرض کیا کہ بندہ اس خدمت کی لیاقت نہیں رکھتا- اگر اجازت ہو کچھ دنوں مزدوری کر لوں- حضرت مخدوم (کلیری) نے ان کی درخواست منظور فرما کر ان کو رخصت فرمایا-

گویا آپ فوج میں بھرتی اس لیے ہوئے تھے کہ کچھ مزدوری مل جائے- فاقہ مستی ختم ہو- کچھ ہاتھ کھلے- اور کچھ دام پلے میں ہوں تو پانی پت جا کر کام کر سکیں- ایک بلند و بالا مقصد کے لیے کوئی شخص کچھ دولت فراہم کرتا ہے جو اس کے لیے توشہ کا کام دے سکے تو خلاف شریعت نہیں- بلکہ نظر شریعت میں خ... ارشاد ربانی- "وتزودو افان خیر الزاد التقویٰ-" (اور توشہ لے لو- ... بہترین توشہ تقویٰ ہے) کے پیش نظر یہ ایک ارشاد خداوندی کی تعمیل ہے- ...

واقعہ یہ ہے کہ ان بزرگوں کی متوکلانہ زندگی کے ساتھ یہ بات جوڑ نہیں کھاتی کہ روپیہ فراہم کرنے کے لیے فوج کی نوکری کی-

حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات جس طرح دین اسلام کو کامل و مکمل سمجھتے تھے ایسے ہی ان کی کوشش یہ بھی ہوتی تھی کہ دین کے تمام احکام پر عمل کریں- اور شریعت کا جو حکم بھی اہمیت کے ساتھ سامنے آئے اس کی پوری پوری تعمیل کریں- جس طرح رب العالمین کا حکم یہ ہے:

یا ایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ - ولا تتبعوا خطوات الشیطان- (سورہ بقرہ)

اے مسلمانو! اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ (کہ اس کے ہر ایک عقیدہ کو تسلیم کرو اور اس کے ہر ایک حکم پر عمل کرو- کسی عقیدہ کو مان کر اور کسی سے انکار کر کے یا کسی حکم پر عمل کر کے اور کسی سے معاذ اللہ انکار کر کے) شیطان کی پیروی نہ کرو-

اسی طرح ارشاد ربانی یہ بھی ہے:-

ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ- یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون و یقتلون- (سورہ توبہ)

بے شک اللہ تعالیٰ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس معاوضہ میں کہ ان کو جنت ملے گی- یہ مسلمان راہ خدا میں جہاد کرتے ہیں- قتل بھی کیے جاتے ہیں- اور دوسروں کو بھی قتل کرتے ہیں-

جب نفس مومن، دین وملت، ملک و قوم کے تحفظ، دفاع اور قتل و قتال کے لیے خریدا جا چکا تو کبھی ایسا بھی ہونا چاہیے کہ اس بچی ہوئی جان کو خریدار کے ہاتھ میں پھینک دے- وہ اس کو اپنے پاس رکھ لے- یا کچھ عرصہ کے لیے اس کے

رہنے دے-

فمنھم من قضیٰ نحبه ومنھم من ینتظر (سورہ احزاب)

کچھ اپنی نذر اور منت پوری کر چکے (اپنی جان، جان آفرین کے حوالہ کر دی) اور کچھ انتظار کر رہے ہیں- (کب وقت آئے اور کب ہم جان عزیز کی حقیر پونجی مالک حقیقی کے سپرد کریں-)

قرآن پاک کے اعجاز اور شیریں بیانی کا بھی کیا ٹھکانا- کہ شہید ہونے والوں کے لیے فرمایا ہے- قضیٰ نحبه- یعنی اس نے اپنی منت پوری کر دی- یعنی مومن کی شان یہ ہے کہ وہ راہ خدا میں شہادت کی منت مانگے-

محدثین کے سرتاج- حضرت محمد بن اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ بخاری (امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ) کے جلیل القدر استاذ سیدنا حضرت عبداللہ بن مبارک، خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور میں گزرے ہیں- آپ جس طرح جلیل القدر محدث و مفسر اور عظیم الشان فقیہ تھے- ایسے ہی پر شوکت مجاہد، باہمت و جفاکش مبلغ عالی حوصلہ- شیخ طریقت بھی تھے- آپ نے سال کے بارہ مہینوں کو چار حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا- جس طرح روزہ- حج، درس و تدریس اور طلب معاش کے لیے سال کے مہینے مقرر کیے تھے- ایسے ہی سال کا ایک حصہ جہاد کے لیے بھی مقرر کیا تھا- منشا یہ تھا کہ ---- اللہ تعالیٰ سے جو خود اپنی جان کے متعلق عہد ہوا ہے- اس کی تکمیل ہو-

کیا وجہ ہے کہ ہم شیخ شمس الدین ترک رحمۃ اللہ علیہ کی اس شرکت فوج کو بھی اسی طرح کا فعل نہ مانیں- بلاشبہ آپ نے بھی فوج میں شرکت کر کے- "متاع جان" اس کے خریدار اور اس کے مالک حقیقی کی بارگاہ میں پیش کر دی- اور یہ آخری درجہ کی ریاضت تھی- جس کی ضرورت خصوصیت سے اس وقت تھی جب آپ کو کلیری شریف کے دربار سے پانی پت جانے کا حکم ہو رہا تھا-

باقی یہ سوال کہ غیاث الدین بلبن خلیفہ نہیں بادشاہ تھا- اور ضروری نہیں تھا

کہ اس کی فوج کشی کو "جہاد" کہا جا سکے - یہ سوال اپنی جگہ درست ہے اور اس بنا پر یہ حضرات بادشاہی کاموں سے قطعاً کنارہ کش رہا کرتے تھے - لیکن یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ان بادشاہوں کی ہر ایک لشکر کشی غیر اسلامی ہی ہو -

بادشاہ اگر حملہ آور ہو' تو یہ سوال ہو سکتا ہے کہ یہ حملہ اور یہ اقدام اسلام کی حمایت میں ہے یا ملک گیری کی ہوس میں - لیکن اگر بادشاہ ملک سے دفاع کر رہا ہے - مثلاً حملہ آور کا مقابلہ کر رہا ہے یا باغی کی بغاوت کچل رہا ہے تو اس صورت میں اس کی امداد و اعانت لامحالہ ضروری ہو گی - اور اس جائز بلکہ نہایت ضروری مقصد کے لیے بادشاہ کے ساتھ تعاون کرنا فرض ہو گا -

غیاث الدین بلبن بادشاہ ضرور تھا - مگر صرف مسلمانوں نے نہیں بلکہ ہندو مصنفین نے بھی اعتراف کیا ہے - کہ :-

(۱) وہ سختی سے عدل و انصاف پر قائم رہتا تھا - اس کے یہاں رورعایت نہیں ہوتی تھی -

(۲) اس نے اپنی سلطنت کی توسیع کے لیے دوسرے ملکوں پر یورش نہیں کی مگر اپنی سرحدوں کو ہر طرح محفوظ رکھا -

(۳) اس کے بہتر نظم و نسق کا اثر یہ ہوا کہ بغاوتوں کا کہیں نام باقی نہیں رہا -
(تاریخ ہند از تاراچند صاحب)

غیاث الدین کے دور حکومت کے دو واقعے نہایت اہم ہیں -

(۱) ۶۷۸ھ (۱۲۷۹ء) میں بنگال کے حاکم طغرل نے بغاوت کر دی - بلبن نے بنگال پر فوج کشی کر کے بغاوت فرد کی اور طغرل کو قتل کر دیا -

(۲) ۶۸۴ھ (۱۲۸۵ء) میں شمالی مغربی سرحد پر مغلوں نے حملہ کیا - بلبن کا سب سے بڑا اور سب سے لائق اور قابل لڑکا "محمد" اس لڑائی میں شہید ہوا -

ان دونوں واقعات میں طغرل کے قتل کر دینے پر فقہی نقطہ نظر سے [illegible] گنجائش ہے - لیکن جہاں تک فوج کشی کا تعلق ہے - ظاہر ہے کہ دونوں لڑا[illegible] شرعی جہاد کا حکم رکھتی ہیں - اور صاحب حوصلہ مسلمان پر اگر وہ جہاد کی طاقت [illegible]

ہو - جہاد لازم اور ضروری قرار دیتی ہیں -

اب قرین قیاس یہ ہے کہ حضرت ترک رحمتہ اللہ علیہ مزدوری حاصل کرنے کے لیے فوج میں بھرتی نہیں ہوئے - بلکہ تحفظ وطن اور ملک کے امن و امان کو باقی رکھنے کے لیے فوج میں بھرتی ہوئے -

حاکم بنگالہ کی بغاوت میں معمولی بات نہیں تھی' اس کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے بادشاہ نے امداد و اعانت کی عام اپیل کی ہو گی - (۱) اس اپیل پر لبیک کہنا - ہر ایک حامی ملک و ملت کا فرض تھا - حضرت ترک نے یہ فرض ادا کیا (رحمتہ اللہ) اور جیسے ہی یہ فرض ادا ہوا' باغیوں کو شکست ہوئی - حضرت ترک فوج سے رخصت ہو کر اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہو گئے -

دولت دنیا کمانے کے لیے حضرت ترک نہیں گئے تھے بلکہ فریضہ دینی کا ایک اہم تقاضا تھا - اس کو پورا کرنے کے لیے فوج میں بھرتی ہوئے تھے - یہ فریضہ دینی یقیناً پانی پت پہونچ کر ارشاد و تبلیغ سے بہت زیادہ اہم تھا - اسی بنا پر جب حضرت شیخ کلیری نے پانی پت جانے کی فرمائش کی تو آپ نے معذرت پیش کی جو فوراً قبول ہوئی - کیونکہ معذرت کا حاصل یہ تھا کہ فریضہ جہاد' اس وقت تبلیغ و ارشاد سے مقدم ہے -

یہ خیال بھی ہو سکتا ہے کہ آپ دوسرے معرکہ میں شریک ہوئے ہوں - جو مغلوں سے پیش آیا - مگر یہ خیال اس بنا پر صحیح نہیں کہ حضرت ترک اس فوج میں

۱- حاکم بنگالہ کا قتل اور بادشاہ کی شکست ۶۷۸ھ کا واقعہ بیان کیا گیا ہے - اور ہمارے حساب سے جو دو صفحہ پہلے گذر چکا ہے حضرت شیخ شمس الدین ترک" تقریباً ۶۷۶ھ میں فوج میں بھرتی ہوئے ہیں - اب یہ تو معین ہو جاتا ہے کہ جس جنگ میں حضرت شیخ کی شرکت ہوئی وہ یہی بنگالہ کی جنگ ہے - البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ بادشاہ نے فوجی بھرتی کا اعلان ۶۷۶ھ میں کیا ہو - بہر حال دہلی سے بنگال تک سفر کرنے اور اس طویل سفر اور پھر اس عظیم جنگ کی تیاری میں وقت صرف ہوا ہو گا - اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حضرت خواجہ فرید کی وفات ۶۶۶ھ میں تسلیم کی جائے اور حضرت شیخ شمس الدین صاحب کی کلیر شریف آوری ۶۶۳ھ میں مانی جائے تو پندرہ سال ۶۷۸ھ میں پورے ہوتے ہیں - واللہ اعلم

تھے جس کی کمان خود بادشاہ کر رہا تھا- مغلوں کے مقابلہ میں کمانڈر بادشاہ نہیں تھا-
بلکہ اس کا محبوب اور قابل فرزند "محمد" تھا جو شہید ہوا-

فوج میں کشف و کرامت کا ظہور

اب آیئے کچھ ان حضرت کی روایتوں سے بھی دلچسپی لے لیجیے- جو سوانح نگار حضرات نے بیان فرمائی ہیں- جن کے نزدیک عظمت و تقدس کا مدار کرامتوں پر ہے- صاحب سیر الاقطاب تحریر فرماتے ہیں کہ :-

بادشاہ کسی قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا- کافی مدت گذر گئی تھی کہ قلعہ فتح نہیں ہو سکا تھا- ایک روز اتفاق سے ایسی آندھی چلی کہ فوج کے خیمے اکھڑ گئے- آندھی کے بعد موسلا دھار بارش ہوئی- سردیوں کا موسم تھا- پورے لشکر کو سخت پریشان ہوئی- آندھی میں جب خیمے بھی اڑ گئے تو شمع یا چراغ تو کیا حقیقت تھی- سب چراغ بھی بجھ گئے- شاہی خیمہ میں بھی اندھیرا ہو گیا- اب روشنی اور گرم پانی کے لیے آگ کی ضرورت پڑی- تو شاہی باورچی خانہ کا باورچی اور ایک سقہ آگ کی تلاش میں چلے کہ شاید کہیں کوئی چنگاری مل جائے- مگر کہیں کوئی چنگاری تو کیا کوئی ٹمٹماتی ہوئی شمع بھی نہیں ملی- البتہ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد خرگاہ کے ایک کنارے پر ایک خیمہ میں چراغ جلتا ہوا نظر آیا- باورچی کو تعجب بھی ہوا- کہ یہ شمع کس طرح باقی ہے اور مسرت بھی بے حد ہوئی- کہ "طلب" اور جستجو میں کامیابی ہو گئی- پھر یہ دونوں اس خیمہ کی طرف لپکے- دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف فرما ہیں شمع سامنے ہے اور وہ خود تلاوت کلام پاک میں مشغول ہیں- باورچی قریب پہونچا مگر اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ تلاوت کے مقدس مشغلہ میں خلل انداز ہو- د[illegible] خود اس بزرگ کی نظر اٹھی- دیکھا ایک شخص کھڑا ہے- فرمایا کیا بات ہے؟ اس وقت یہاں کیسے؟ عرض کیا- شاہی باورچی خانہ کا انچارج ہوں- آگ کی ضرورت ہے- پورے لشکر میں گھوم لیا- آگ تو آگ کہیں چراغ بھی نہیں جل رہا- آپ یہاں شمع روشن ہے- اجازت ہو تو اس سے اپنی شمع روشن کر لوں-

بزرگ- شوق سے اپنی شمع روشن کیجیے-

بہر حال باورچی نے شمع روشن کی- ایک لکڑی میں آگ لگا کر جلتی ہوئی لکڑی باورچی خانہ میں لے گیا- اور وہاں اپنا کام شروع کر دیا-

اس وقت تو باورچی کے ساتھ سقاء بھی چلا گیا- مگر اس کو سخت حیرت رہی کہ "یہ درویش" کون ہیں؟ جن کے انفاس قدسیہ میں یہ طاقت ہے کہ آندھی کی سرتابیوں کو بھی وہ مطیع اور فرماں بردار بنا دیتے ہیں-

سردیوں کی رات دراز ہوتی ہے- سقاء جو محو حیرت تھا- جب سونے کے لیے لیٹا تو نیند غائب تھی- خدا خدا کر کے آنکھ لگی تو پھر فوراً ہی کھل گئی- بالآخر اس سے نہ رہا گیا- جیسے ہی تہجد کا وقت ہوا- سقاء اپنا بستر چھوڑ کر کھڑا ہو گیا- اور اسی خیمہ پر پہونچا کہ ان بزرگ صاحب کی زیارت کر سکے- مگر اس کو بہت افسوس ہوا- جب اس نے دیکھا کہ وہ بزرگ خیمہ سے غائب ہیں- مگر وہ مایوس نہیں ہوا اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو کنارہ پر ایک تالاب نظر آیا- سقہ ان طرف چلا قریب پہونچا تو دیکھتا ہے کہ ایک صاحب ایک گھاٹ پر تشریف فرما ہیں- اور بڑے اطمینان سے وضو کر رہے ہیں- سردی سخت ہے- پالا پڑ رہا ہے- پانی جما جا رہا ہے- اس سقے کی حالت یہ ہے کہ ہاتھ پاؤں ٹھٹرے جا رہے ہیں- مگر یہ بزرگ بڑے اطمینان سے سنن و مستحبات کے ساتھ وضو فرما رہے ہیں-

آگے بڑھ کر سقے نے کچھ اور غور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ وہی بزرگ ہیں' جن کی پیشانی شمع کی روشنی میں خیمہ کے اندر چمک رہی تھی- سقہ اس وقت کچھ نہیں بولا- البتہ جب وہ بزرگ اپنے خیمہ میں پہونچ چکے تو سقہ تالاب کے گھاٹ پر اسی جگہ پہونچا- جہاں اس خیمہ والے بزرگ نے وضو کیا تھا- سقے نے ڈرتے ڈرتے پانی میں ہاتھ ڈالا کہ پانی ٹھرا ہوا ہے- ہاتھ بھی سن ہو جائے گا- مگر اس کو سخت تعجب ہوا کہ جہاں سے ان بزرگ صاحب نے وضو کیا تھا- وہاں پانی گرم ہے- ٹھنڈک کا نام نہیں- بہر حال سقے نے بھی وضو کیا- پھر مشکیزہ میں پانی بھر لیا- اور لشکر گاہ میں لے کر آیا- بادشاہ کے وضو کا وقت آیا تو اسی پانی سے وضو کرایا-

سقے نے یہ سب کچھ دیکھا۔ مگر وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ ماجرا کیا ہے۔ غالباً اس کو یہ خیال ہوا کہ ممکن ہے یہاں گندک کا چشمہ ہو۔ جس کی وجہ سے پانی گرم رہتا ہو۔ اگلی شب وہ خیمہ والے بزرگ کے وقت سے پہلے اس گھاٹ پر پہونچ گیا۔ اس نے پانی میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ تو پانی یخ تھا۔ اس کا ہاتھ بھی ٹھر گیا۔ اب یہ ایک کنارہ پر آڑ میں کھڑا ہو گیا اور خیمہ والے بزرگ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ بزرگ آئے۔ گھاٹ پر پہونچے تو اس نے محسوس کیا کہ پانی میں ایک طرح کی لہر پیدا ہوئی۔ ان صاحب کرامت بزرگ نے حسب معمول اطمینان سے وضو کیا۔ اور اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے۔ اب یہ سقہ آیا۔ اور اس نے پانی میں ہاتھ ڈالا تو پانی گرم تھا۔ اب اس کو یقین ہو گیا کہ یہ گندک کی حرارت نہیں۔ بلکہ اس بزرگ کی کرامت ہے۔ اب اس نے اس کا چرچا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ بادشاہ تک خبر پہونچی۔ بادشاہ نے سقے کو طلب کر کے پورا قصہ سنا۔ پھر وہ آخر شب میں خاص طور پر تالاب پر گیا۔ اور سقہ کی طرح پہلے پانی کو دیکھ لیا تو پانی ٹھنڈا تھا۔ پھر بزرگ آئے' وضو کیا۔ جب وہ واپس ہوئے اور بادشاہ نے آکر پانی میں ہاتھ ڈالا تو پانی گرم تھا۔ اب بادشاہ کو بھی عقیدت ہو گئی۔ اور تحقیق شروع ہوئی کہ یہ کون صاحب ہیں۔ کہاں سے آکر فوج میں بھرتی ہوئے ہیں۔ جب بادشاہ کو ان کے بلند مرتبہ کا اندازہ ہوا۔ تو اس نے آپ سے دعا کی استدعا کی۔ سیر الاقطاب کے الفاظ یہ ہیں کہ بادشاہ نے عرض کیا۔

زہے طالع وسعادت من کہ مثل شا دوست خدا در عسکر من بود۔ باایں ہمہ ہزار حیف کہ ایں قلعہ فتح نمی شود۔

(میری بہت بڑی خوش نصیبی اور سعادت ہے کہ آپ جیسے خدا کے دوست میرے لشکر میں ہیں۔ مگر پھر ہزار افسوس کہ یہ قلعہ فتح نہیں ہوتا۔)

بادشاہ کے جواب میں حضرت شمس نے بہت زیادہ تواضع اور انکساری سے کام لیا۔ اپنی بے حقیقی اور عاجزی ظاہر کی۔ مگر بادشاہ دعا کے لیے اصرار ہی کرتا رہا۔ مجبوراً حضرت شمسؒ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اور جب دعا سے فارغ ہوئے

بادشاہ سے فرمایا کہ :

"فوراً سوار ہو جائیے اور حملہ کر دیجئے۔ انشاء اللہ فتح ہو گی۔"

بادشاہ نے ارشاد گرامی کی تعمیل کی اور خدا کا فضل ہوا کہ قلعہ فتح ہو گیا۔ یہ تو کرامت ہوئی۔ اب ایک دوسرا لطیفہ ملاحظہ فرمائیے۔ یہی مصنف سیر الاقطاب جس نے دو صفحہ پہلے کہا تھا کہ کچھ مزدوری کمانے کے لیے فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ اس قصہ کے نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔ کہ

"اگلے روز بادشاہ نے ارادہ کیا کہ پابرہنہ خدمت مبارک میں حاضر ہو۔ اور عقیدت کے پھول پیش کرے۔"

ظاہر ہے بادشاہ کے عقیدت کے پھول کس قدر قیمتی ہوتے۔ مگر مصنف مذکور تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شمس الدین رحمتہ اللہ علیہ کو جیسے ہی نور باطن سے بادشاہ کے ارادہ کا علم ہوا۔ فوراً روانگی کی تیاری کر لی۔ آپ کا گھوڑا نہایت قیمتی تھا۔ آپ نے اس کو ساز و سامان سے آراستہ کیا۔ اور فرمایا کہ فلاں بیوہ کے یہاں بالغ لڑکی ہے۔ اس کے فقر اور مسکینی کے سبب سے کہیں سے لڑکی کا رشتہ نہیں آتا۔ تو اس بیوہ کے پاس پہونچ جا۔ وہ تجھ کو فروخت کر کے اپنا کام چلا لے گی۔ گھوڑا اس بیوہ کے یہاں پہونچا۔ ادھر اس بیوہ کو غیب سے آواز آئی کہ ایک درویش کا عطیہ پہونچ رہا ہے۔ تو اس کو فروخت کر کے اپنا کام چلا۔

حضرت شمس نے اپنے قیمتی گھوڑے سے تو یہ کام لیا۔ اس کے بعد جو کچھ تھا "بقول سیر الاقطاب"

باقی ہر چہ بود آنحضرت اسباب خود را بفقراء بداد و خود دلق پوشیدہ از لشکر برآمد و خدمت پیر خود رسید۔

(باقی جو کچھ تھا۔ حضرت نے اپنا تمام اسباب فقراء کو تقسیم کر دیا۔ اور خود ایک گدڑی پہن کر لشکر کے حلقہ سے باہر تشریف لائے۔ پھر اپنے پیر کی خدمت میں پہونچ گئے۔)

بہر حال مزدوری اور دولت تو حضرت شمس کے نہ پہلے پیش نظر تھی نہ بعد

میں جہاد کے لیے آپ نے قیمتی گھوڑا بھی خریدا تھا- اور سامان واسباب بھی فراہم کیا تھا- مقصد پورا ہو گیا- جہاد ختم ہو گیا- تو جو کچھ فراہم کیا تھا- وہ بھی راہ خدا میں خرچ کر کے اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہو گئے-

فریضہ جہاد کی ادائیگی کے وقت نوافل اور مستحبات کا ثواب دو چند اور چہار چند ہو جاتا ہے- ذکر واذکار کی بھی یہی شان ہے کہ قلب ضوریز زمانہ جہاد میں ذکر و مراقبہ سے دو چند و چہار چند نور حاصل کرتا ہے- اب حضرت شمس اس نور کامل کے ساتھ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ارشاد ہوا کہ نور کو گوشہ میں چھپ کر نہیں رہنا چاہیے- اس کو میدان میں پہونچ کر پورے ماحول کو روشن کرنا چاہیے- لہٰذا آپ پانی پت پہونچ کر اللہ کے دیئے ہوئے نور کو پھیلائیں- اور بقول صاحب معارج الولایت حضرت شمسؒ نے جب عرض کیا-

> آنجا شرف الدین بو علی قلندر ست- ماندن من در انجا چہ طور صورت پذیر خواہد بود-
>
> (وہاں حضرت قلندر صاحب موجود ہیں- میں وہاں کس طرح رہ سکوں گا)

تو حضرت شیخ نے ارشاد فرمایا:

> ولایتش بآخر رسید- چوں تو در آنجا خواہی رسید او از شہر بدر خواہد آمد-
>
> ان کی ولایت ختم ہو رہی ہے (غالباً اس لیے کہ ان پر جذب غالب ہو چکا ہے اب وہ ارشاد و تربیت نہیں کر سکتے-) جب تم وہاں پہونچ جاؤ گے تو وہ شہر سے باہر تشریف لے جائیں گے-

چنانچہ ایسا ہی ہوا- جیسا کہ دوسرے موقع پر حضرت قلندر صاحب حالات میں تفصیل سے عرض ہو چکا ہے-

پانی پت میں تشریف آوری

پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت خواجہ شمس الدین ترک رحمتہ اللہ پانی پت پہونچے- تو قطعاً غیر معروف تھے- نہ پانی پت میں آپ کسی کو جانتے تھے نہ کوئی آپ کو جانتا تھا- آپ قلندرانہ چرمی لباس پہنے ہوئے پانی پت رونق افروز ہوئے- اور ایک دیوار کے سایہ میں (اور ایک روایت کے بموجب حضرت امام بدر الدین بدر عالم رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کی دیوار پر) بیٹھ گئے- شیخ شرف الدین بو علی قلندر رحمتہ اللہ علیہ سے آپ کا تعارف ضرور تھا- مگر شاید ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی- لیکن اس تعارف کی شان عجیب تھی- ملاحظہ ہو-

حضرت قلندر صاحب کو نور باطن اور کشف کے ذریعہ آپ کی تشریف آوری کا علم تو ہو گیا- اور آپ نے اپنے عزیز منظور نظر حضرت جلال الدین صاحب سے فرما بھی دیا کہ تمہارے پیر آگئے- فلاں جگہ بیٹھے ہوئے ہیں جاؤ زیارت کر لو- ایک حلوائی کے لڑکے کو بھی اطلاع دیدی- مگر خود ایک اجنبی مہمان کی مدارت اس طرح کی کہ اپنا بوریا بستر باندھ کر شہر سے باہر تشریف لے گئے- "طاقت مہمان نداشت خانہ مہمان گذاشت-" یعنی ناشتہ یا کھانا پیش کرنے کے بجائے فی الواقع اپنا مسکن پیش کر دیا-

چنانچہ یہ بھی روایت ہے کہ حضرت ترکؒ حضرت قلندر صاحب کے حجرہ میں سکونت پذیر ہوئے-

بہر حال اگر ہماری طرح خاطر مدارت کرتے تو آپ کو "قلندر" ہی کیوں کہا جاتا- اب اس نوارد و مہمان کی پیش کش بھی ملاحظہ فرمایئے- (وردغ بر گردن راوی) سیر الاقطاب کی روایت ہے-

> حضرت خواجہ شمس الدین ترک رحمتہ اللہ علیہ نے پانی پت میں قیام کے بعد ایک پیالہ میں دودھ بھر کر خادم کے ہاتھ حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں بھیجا- اور کہا کہ برادرم

شرف الدین قلندر صاحبؒ کو ہمارا سلام پہونچا کر یہ کٹورا
پیش کر دو۔

جب حضرت قلندر صاحب کی خدمت میں یہ دودھ سے لبریز پیالہ پیش کیا گیا
تو آپ نے اس میں ایک گلاب کا پھول ڈال دیا۔ اور واپس کر کے فرمایا۔ کہ یہ برادرم
شمس الدین کی خدمت میں سلام کے بعد پیش کر دیں۔

جب خدام نے اس معمہ کی شرح چاہی تو حضرت خواجہ نے فرمایا۔ کہ دود
سے لبریز پیالہ بھیجنے کا مقصد یہ تھا۔ کہ یہ شہر اب میری ولایت سے معمور ہو چکا ہے
اب حضور والا کے لیے یہاں گنجائش نہیں رہی۔

اس کے جواب میں قلندر صاحب کی طرف سے پھول ڈال کر واپس کرنے کا
مطلب یہ ہے۔ کہ ولایت آپ کو مبارک رہے۔ میں اس شہر میں آپ کی ولایت
کے باوجود پھول کی طرح تیر تا رہوں گا۔

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد راوی کا ارشاد ہے۔

چنانچہ ہر دو حضرات میں نہایت گہرے مراسم رہے۔ جس
طرح شیخ جلال الدین رحمتہ اللہ علیہ دونوں کے مشترک نور
نظر رہے۔

تبصرہ

ان دونوں بزرگوں کے گہرے مراسم مسلم اور یہ بھی تسلیم ہے کہ حضرت
جلال الدین صاحب پر دونوں بزرگوں کی غیر معمولی شفقت تھی۔ لیکن اگر
حضرت قلندر صاحب پہلے ہی پانی پت چھوڑ چکے تھے۔ اور آپ نے شہر
تشریف لے جا کر ڈیرہ ڈال دیا تھا تو پھر ان رموز اور معمون کی ضرورت کیا
اور کیا حضرت شمس الدین ترکؒ کا وسیع ظرف اور آپ کے اعلیٰ اخلاق انہیں
اجازت دے سکتے تھے کہ وہ اپنی ولایت کو اس طرح جتائیں۔ دنیا کے جاہ
کر سکتے ہیں۔ مگر

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر

پھر یہ شان تو بادشاہوں کی ہوتی ہے کہ بقول حضرت شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ
"دو بادشاہ در یک اقلیم نہ گنجند۔" دو بادشاہ ایک ولایت (مملکت) میں نہیں سما سکتے۔
باقی درویشوں کی شان تو حضرت سعدیؒ نے یہ بیان فرمائی ہے کہ۔ "ہفت درویش
در یک گلیم بخسپند۔" یعنی ولایت اور مملکت تو درکنار ایک کمبل میں سات درویش
سو سکتے ہیں۔

کرامت کے ذریعہ سید ہونے کا ثبوت

سیر الاقطاب کی روایت ہے کہ پانی پت کے سادات کو جب علم ہوا کہ آپ بھی
سید ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو آپ سے ثبوت طلب کیا۔ آپ نے فرمایا۔ میں نے
اپنے آباؤ اجداد سے یہی سنا ہے اور ہمارے یہاں شجرہ نسب بھی موجود ہے۔ یہ
معترض صاحب اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ تو حضرت شمس رحمتہ اللہ علیہ
کو جوش آ گیا۔ اور فرمایا۔ عوام میں مشہور ہے کہ جو شخص صحیح النسب حضرت علی
مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہوتا ہے۔ آگ میں اس کا بال بھی نہیں جلتا۔
اگرچہ اب تک اس عقیدہ کا تجربہ نہیں ہوا ہے۔ مگر میرے خیال میں آج وقت ہے
کہ اس کا تجربہ کیا جائے۔ اس کے تجربہ کے لیے اس وقت سے بہتر کوئی وقت نہیں
ہو سکتا۔ بس آیئے۔ میں اور آپ دونوں اس تنور میں کود جائیں۔ اور تجربہ کر لیں۔

حضرت خواجہ شمسؒ نے جیسے ہی یہ جملہ ختم فرمایا۔ فوراً ایک "تنور" میں (جو
وہیں خانقاہ میں یا خانقاہ کے پاس دھک رہا تھا) کود پڑے۔ "اور وہاں سے سید صاحب
کو آواز دی کہ "آپ بھی تشریف لایئے" اب یہ پانی پتی سید صاحب بہت پریشان اور
شرمندہ ہوئے۔ تنور کے کنارے پر پہونچ کر جھانکا۔ تو دیکھا حضرت شمس اطمینان
سے تنور کے اندر تشریف فرما ہیں۔ گویا آپ سمندر (آگ کا کیڑا) ہیں۔ سید صاحب
نے یہ تماشہ تو دیکھا۔ مگر تنور میں کود پڑنے کی ہمت پھر بھی نہیں ہوئی۔ بلکہ جب
تنور کو جھانک کر سید صاحب واپس ہونے لگے تو ان کے دامن کو آگ لگ گئی۔ اب

سید صاحب نے بدحواس ہو کر چلانا شروع کیا- تو حضرت شمسؒ تنور سے باہر تشریف
لائے اور اپنے ہاتھ سے دامن کی آگ بجھائی- پانی پتی سید صاحب بہت نادم ہوئے
اور توبہ کی- پھر حضرت شمسؒ رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت ہو گئے-

تبصرہ

ہم اولیاء کرام کی کرامات کے قائل ہیں- ہمیں بھی یقین ہے کہ سید کے بال
نہیں جلتے- مگر یہ کرامت اس کوئلے اور لکڑی کی آگ میں ظاہر نہیں ہوتی- با
ظلم اور مصائب کی آگ میں اس کرامت کا ظہور ہوتا ہے- سید وہی ہے کہ جبر و قہر
تنور اس کو جلانے کے بجائے اور نکھار دے-

حضرت جوہر نے فرمایا :-

"اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد"

آپ فرما سکتے ہیں :

"سادات زندہ ہوتے ہیں ہر کربلا کے بعد"

حضرت شمس الدینؒ کی خدمات

آپ کی جلیل القدر خدمات کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سلسلہ صابر
وہ آفتاب ہیں کہ نور و ہدایت کی جتنی بھی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں وہ آپ کی
کرنیں ہیں- بقول راوی-

> حضرت مخدوم صابر پاک کی حیات میں آپ کا ایک پیر بھائی
> دہلی سے کلیر پہونچا- بھائیوں میں بات چیت ہونے لگی- اسی
> اثنا میں دہلوی صاحب کو معلوم ہوا کہ حضرت مخدوم صابرؒ کے
> صرف ایک مرید ہیں تو بہت تعجب ہوا- کیونکہ حضرت صابر
> کے دوسرے پیر بھائی اور حضرت بابا فرید کے دوسرے خلیفہ
> حضرت شیخ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے اتنے مرید
> تھے کہ ان کا شمار کرنا مشکل تھا- چنانچہ جب حضرت مخدوم

> صابرؒ نے ان دہلوی صاحب سے دریافت فرمایا- کہ برادرم
> نظام الدین کے کتنے مرید ہیں تو دہلوی صاحب نے برجستہ
> جواب دیا- "جتنے آسمان پر تارے" اس پر حضرت مخدوم صابر
> کلیری رحمتہ اللہ علیہ کو جوش آگیا- اور آپ نے فرمایا:
> "جب میرا شمس آسمان طریقت پر تاباں ہوگا تو سارے تارے
> ماند پڑ جائیں گے-"

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مخدوم کلیری رحمتہ اللہ علیہ کی یہ پیشین گوئی بڑی حد
تک صحیح ثابت ہوئی-

اس وقت (۱۳۸۲ھ میں) اگر شمار کیا جائے تو سلسلہ صابریہ کے متوسلین کی
تعداد زیادہ ہوگی- اس سے آگے کچھ عرض کرنا سوء ادب ہے-"

حضرت شمس رحمتہ اللہ علیہ کی وفات

مولانا غلام سرور فرماتے ہیں کہ سیر الاقطاب- تذکرۃ العاشقین اور معارج
الولایت وغیرہ میں آپ کا سال وفات سات سو پندرہ ہجری بیان کیا گیا ہے- اور
مصنف شجرۂ چشتیہ نے سال وفات سات سو اٹھارہ قرار دیا ہے- مگر زیادہ تر ۷۱۵ھ
ہی سال وفات بیان کیا گیا ہے-

اولاد

۱۰۵۰ء (عہد شاہجہانی) کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب سید صفدر نام شاہجہان
بادشاہ کی طرف سے خان کا خطاب حاصل کیے ہوئے تھے- اس لیے سید صفدر کے
بجائے صفدر خان سید کہلاتے تھے- وہ اکبر آباد آگرہ کے صوبہ دار تھے وہ کسی وجہ
سے وہاں منتقل کر دیئے گئے یا معزول کر دیئے گئے- تو دہلی جاتے ہوئے "پانی پت"
میں فروکش ہوئے- یہاں کے بزرگوں سے ملے- علماء سے ملاقاتیں کیں-
مزارات پر حاضری دی- وہ شہر کے ایک کنارے پر ایک بزرگ کے مزار پر بھی
حاضر ہوئے- جو "شیخ شمس الدین ترک" کا مزار کہلاتا تھا- جن کی وفات کو تقریباً

ساڑھے تین سو برس گذر چکے تھے۔

حضرت ترک کے مزار کے مجاوروں سے بات چیت ہوئی۔ کچھ حضرت "ترک" کے حالات معلوم کیے اور جب یہ سنا کہ یہ بزرگ "ترکستان" سے تشریف لائے تھے تو ایک جستجو ذہن میں پیدا ہوئی۔

سید صفدر صاحب ترکستان کے رہنے والے تھے۔ ان کا وہی شہر تھا جو حضرت ترک کا وطن اصلی بتایا گیا۔ ان کے بزرگوں میں سے ایک صاحب بیوی بچوں کو چھوڑ کر فقیری اختیار کر کے لاپتہ ہو چکے تھے۔ سید صفدر نے خاندان کے بڑے بوڑھوں سے ان کا تذکرہ سنا تھا۔ ان لاپتہ ہونے والے بزرگ کا نام بھی شمس الدین ہی تھا۔

یہ خواجہ شمس الدین ترکؒ جو سلسلہ صابریہ کے "میزاب رحمت" ہیں۔ کیا وہی دادا شمس الدین ہیں۔ جن کی گم شدگی کا قصہ اپنے بزرگوں سے سنا تھا؟ اس کی تحقیق کس طرح ہو۔ ؟ کیا یہاں ان کا کوئی شجرہ نسب ہے ؟

ان مجاوروں سے جب بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا۔ کہ حضرت "ترک" کا شجرہ نسب بعد کا تو نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ترک نے شادی ہی نہیں کی تھی۔ البتہ حضرت ترک سے پہلے بزرگوں کا شجرہ نسب موجود ہے ---- سید صفدر کو جس طلب اور جستجو کی لگن لگی ہوئی تھی۔ یہ خبر اس کے لیے مژدہ جانفزا تھی۔

متولی اور مجاور حضرات سے درخواست کی کہ مہربانی فرما کر وہ شجرہ لائیں۔ شجرہ منگایا گیا۔ ایک شجرہ اپنے نسب کا خود صفدر صاحب نے بھی محفوظ کر رکھا تھا اور آج کل اس کی قدر ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس زمانہ میں جب شاہی ملازمتوں میں بڑی حد تک نسب اور خاندان کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ شجرہ نسب جو مقامی بزرگوں اور ائمہ کی مہروں سے آراستہ ہو بہت ہی قیمتی چیز تھا۔ اور ایک قیمتی دستاویز کی طرح رکھا جاتا تھا۔ بہر حال سید صفدر صاحب نے بھی اپنا محفوظ شجرہ نسب سامنے رکھا اور مقابلہ کیا تو بعینہ ایک دوسرے کی نقل تھا۔

اب جس طرح مجاور صاحبان کے پیش کردہ شجرہ کی تصدیق ہوئی اس کا بھی انکشاف ہو گیا کہ حضرت ترک رحمتہ اللہ علیہ لاولد نہیں تھے۔ بلکہ آپ

خلف رشید "سید احمد" تھے۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ وطن ہی میں رہے۔ ان کے سلسلہ میں خدا نے برکت بخشی۔ ان کے متعدد لڑکے تھے۔ اور یہ سید صفدر صاحب انہیں کی اولاد میں سے ہیں۔

سید صفدر صاحب جو آج تک پانی پت میں اجنبی تھے اور اگرچہ شاہی افسر رہے تھے۔ مگر معزول ہونے کے بعد غریب الدیار مسافر تھے۔ اب وہ بزرگان پانی پت کے پیرزادہ ہو گئے۔ ایک پیرزادہ کی طرح ان کی خاطر مدارات ہونے لگی۔

شاہی وقائع نگار اس زمانہ میں ہر ایک مرکزی مقام پر رہتے تھے۔ پانی پت بھی مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ واقعہ بہت ہی عجیب تھا کہ حضرت ترک رحمتہ اللہ علیہ جو ساڑھے تین سو برس تک لاولد تسلیم کیے گئے تھے۔ آج وہ ایک عظیم الشان اور بہت وسیع خاندان کے مورث اعلیٰ ثابت ہو گئے۔ اور یہ صفدر صاحب اور ان کے خاندان کے بزرگ حضرت ترکؒ کے اخلاف ہیں۔ وقائع نگار نے اس عجیب و غریب خبر کی رپورٹ ضرور کی ہوگی۔ جس کا اثر شاہجہاں بادشاہ پر یہ پڑا کہ ان کی معزولی کو حالی سے بدل دیا۔ بلکہ غالباً کسی قدر ترقی دے کر ان کو کابل اور قندھار کا صوبہ دار بنا دیا۔

صاحب سیر الاقطاب تحریر فرماتے ہیں کہ صفدر خاں سید' اور ان کے جانشین اگرچہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ ان میں سے بعض ایسے بھی تھے۔ جن کو پنجہزاری منصب عطا ہوا تھا۔ مگر انداز ان سب کا درویشانہ تھا۔ خدا پرست' غریبوں کے ہمدرد۔ ہر ایک کے کام آنے والے' نہایت مہمان نواز' بااخلاق' بلند حوصلہ۔ (رحمہم اللہ)

دوم المشائخ شیخ محمد جلال الدین

کبیر الاولیاء عثمانی قدس سرہ

یاد ہوگا- حضرت قلندر صاحب نے ایک نوجوان کو دیکھا جو اسپ تازی پر سوار کہیں جا رہا تھا- تو فرمایا تھا-

زہے اسپ و زہے سوار

(کیا خوب گھوڑا- اور کیا خوب سوار)

پھر اسی قلندرانہ شان میں برجستہ یہ شعر موزوں فرمادیا تھا-

گل گوں لباس کرد و سوار سمند شد
یاراں حذر کنید' آتش بلند شد

(لباس گلگوں کیا اور سرخ رنگ کے عمدہ گھوڑے پر سوار ہوا- دوستو! احتیاط سے کام لو- آگ بلند ہو گئی ہے-

پھر آپ نے یہ بھی ملاحظہ فرمالیا ہوگا- کہ اس قلندرانہ شعر کا اثر اس نوجوان پر یہ ہوا تھا-

"ہرچہ از دنیا بدست داشتند- ازاں بیروں آمد و آں اسپ را نیز للہ یکے داد و راہ صحرا گرفت-"

(دنیاداری کی جتنی بھی چیزیں تھیں سب سے کنارہ کش ہو گئے- اس گھوڑے کو بھی اللہ کے واسطے کسی کو دیدیا- اور صحرا کا راستہ اختیار کیا- رحمہ اللہ)

آپ شاید پہچان گئے ہوں- یہ نوجوان کون تھے-؟

نام نامی

یہ وہی جوان صالح تھے جن کا نام والد صاحب مرحوم نے محمد رکھا تھا- پیر روشن ضمیر نے "جلال الدین" تجویز کیا- ارشاد و طریقت کے گوہر شناسوں نے کبیر الاولیاء کا خطاب دیا- اور عوام میں "مخدوم صاحب" کے "خطاب بزرگ" سے مشہور ہوئے-

وطن اور سلسلہ نسب

خواجہ عبدالرحمٰن صاحب گاذرونی- پانچویں صدی ہجری کے ایک بزرگ تھے- سلسلہ نسب اگرچہ خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ تک پہونچتا تھا- مگر آپ کے ایک مورث (اتفاق سے ان کا نام نامی بھی عبدالرحمٰن ہی تھا) مدینہ طیبہ سے منتقل ہو کر "گاذرون" آگئے تھے-

خواجہ عبدالرحمٰن گاذرونی محمود غزنوی کی فوج میں کسی منصب پر فائز تھے- اور محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو یہ اس کے ساتھ تھے- محمود واپس چلا گیا- اور یہ پانی پت میں سکونت پذیر ہو گئے- پھر شاہی فرمان کے ذریعہ پانی پت کا پورا علاقہ آپ کے سپرد ہو گیا-

حضرت مخدوم خواجہ محمد جلال الدین کبیر الاولیاء رحمتہ اللہ آپ ہی کی اولاد میں ہیں- اور اسی لیے آپ کو گاذرونی کہا جاتا ہے-

سلسلہ نسب یہ ہے-

شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء رحمتہ اللہ علیہ- ابن خواجہ محمود ابن خواجہ یعقوب ابن خواجہ عیسیٰ ابن خواجہ اسمٰعیل ابن خواجہ محمد ابن خواجہ ابی بکر ابن خواجہ علی ابن خواجہ عثمان ابن خواجہ عبد- ابن خواجہ عبدالرحمٰن ثانی ابن خواجہ عبدالعزیز سرخسی ابن خواجہ خالد ابن خواجہ ولید ابن خواجہ عبدالعزیز اکبر ابن خواجہ عبدالرحمٰن اکبر' ابن خواجہ عبداللہ ثانی' ابن خواجہ عبدالعزیز' ابن عبداللہ کبیر' ابن حضرت خواجہ عمرو ابن امیر المومنین ذی النورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ-

خواجہ عبدالرحمٰن اکبر جو نمبر ۱۵ پر ہیں- مدینہ طیبہ سے گاذرون تشریف لائے اور خواجہ عبدالرحمٰن ثانی جو نمبر ۱۰ پر ہیں- پانی پت رونق افروز ہوئے- رحمہم اللہ-

سلسلہ پرورش

حضرت کبیر الاولیاء کا بچپن ہی تھا کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا- عم محترم نے پرورش کی-

تعلیم و تربیت

سوانح کی کتابیں جو ہمارے سامنے ہیں' ان میں تعلیم کا تذکرہ نہیں ملتا- البتہ صاحب سیر الاقطاب نے بلیغ انداز میں تحریر فرمایا ہے :-

(۱) از ایام طفلی محبت الٰہی و جذبہ شوق درگاہی گریباں گیر وقت ایشاں بود- و اکثر سر بصحرا انہادے و مشغول بذکر خدا ماندے-

ترجمہ: بچپن ہی سے اللہ کی محبت اور شوق درگاہ خداوندی کا جذبہ آپ کے اوقات عزیز کے گریبان سے الجھا ہوا تھا- اکثر ایسا ہوتا کہ اسی ذوق و شوق میں آپ کسی جنگل میں پہونچ جاتے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہتے-

(۲) حضرت قطب ابدال شیخ شرف الدین بو علی قلندر قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز آنحضرت را از ہنگام طفولیت بغایت دوست مے داشت- و منظور نظر ایشاں بود- چنانکہ ہر روز برائے دیدن ایشان مے رفت و حضرت رامے دید- واگر آن قطب ربانی جائے مے رفت و جہاں جا تشریف مے برد-

ترجمہ: حضرت شیخ بو علی قلندر رحمتہ اللہ علیہ آنحضرت (حضرت کبیر الاولیاء رحمتہ اللہ علیہ) پر بچپن کے زمانہ سے ہی بہت زیادہ شفقت فرماتے تھے- آپ کے کچھ ایسے منظور نظر تھے کہ ہر روز ان کو دیکھنے جاتے تھے- اور اگر آپ (حضرت

کبیر الاولیاء) مکان پر نہ ہوتے تو جہاں وہ ہوتے وہیں تشریف لے جاتے-

بہر حال ان روایتوں سے یہ تو معلوم ہوا کہ حضرت مخدوم صاحب کی سیرت اور آپ کے اخلاق و کردار کی تعمیر میں حضرت قلندر صاحب کے فیض صحبت اور آپ کی توجہ خصوصی کو بہت دخل ہے- لیکن علوم ظاہری کی تعلیم کا کچھ پتہ ان سے نہیں چلتا- البتہ آپ کی مشہور تصنیف "زاد الابرار" جو سلسلہ ارشاد و طریقت کی اہم اور نہایت مفید کتاب ہے وہ آپ کی اعلیٰ قابلیت کی شہادت ہے-

اور اس شہادت کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے وطن عزیز (پانی پت) کے اساتذہ ہی سے تعلیم حاصل کی-

نگرانی

ارشاد اور طریقت تو بہت بڑی چیز ہے کسی معمولی "فن" میں بھی درجہ تکمیل تک پہونچنے کے لیے تعلیم کے علاوہ نگرانی کی بھی ضرورت ہوتی ہے- نگرانی کی یہ خدمت بھی حضرت قلندر صاحب نے ہی انجام دی-

حضرت خواجہ کبیر الاولیاء کو سرخ لباس پہنے ہوئے سرخ گھوڑے پر سوار دیکھ کر جو حضرت قلندر صاحب نے فرمایا دیا تھا- "یاراں حذر کنید کہ آتش بلند شد-" غور سے دیکھا جائے تو یہ صرف قلندرانہ ترنگ یا صرف شاعری نہیں تھی- بلکہ غالب یہ ہے کہ یہ ایک تنبیہ تھی-

حضرت کبیر الاولیاء شکار کے شوقین تھے- اور یہ شوق آخر تک باقی رہا اور باوجودیکہ ابتداء سے جذب و شوق غالب تھا- اور اسی جذبہ میں اکثر آپ آبادی سے باہر الگ جنگلوں میں چلے جاتے تھے- عرصہ تک وہاں ذکر و عبادت میں مشغول رہتے تھے- لیکن طبع مبارک میں رنگینی بھی تھی-

یہ قدرتی بات ہے عاشق مزاج رنگین طبع ہوا کرتے ہیں- یہ طبع مبارک کی رنگینی ہی تھی کہ گھوڑا سرخ تھا تو لباس بھی گلگوں (گلاب کے پھول جیسا سرخ)

استعمال کیا- لیکن بو علی شاہ جیسا قلندر جو اتباع سنت کے عشق میں مجذوب ہوا ہو جو
شریعت مطہرہ کا یہاں تک گرویدہ اور عاشق ہو- کہ اپنی داڑھی کو بار بار اس لیے
بوسے دیئے کہ ایک حکم شریعت کی تعمیل اور اتباع سنت مبارکہ کے سلسلہ میں
پکڑی گئی تھی) اس کو ایسے جوان صالح کی یہ رنگینی پسند نہ آئی- جس کو دنیا-
کبیر الاولیاء کا خطاب دینے والی تھی اور جو بچپن ہی سے یاد خدا کا شوقین اور محبت الٰہی
کا دلدادہ تھا- اور غالباً یہی وجہ ہے کہ حضرت کبیر الاولیاء نے حضرت قلندر
صاحب کے اس جملہ اور اس شعر سے یہ اثر لیا کہ نہ صرف اس لباس گلگوں کو جدا
کیا- بلکہ اس گھوڑے کو بھی راہ خدا میں بخش دیا- اور آبادی کے بجائے صحرا کا راستہ
اختیار کیا-

ذریعہ معاش

خاندان کا ذریعہ معاش زمیندارہ تھا- خود اپنے طور پر بھی کاشت کرتے تھے-
خود حضرت کبیر الاولیاء رحمتہ اللہ علیہ بھی جوانی کے زمانہ میں کھیت پر جا کر کاشت
کے کام میں حصہ لیا کرتے تھے-

سیر الاقطاب میں کھیت کے اوپر کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے- جو نہایت
دلچسپ ہے- آپ بھی ملاحظہ فرمایئے اور محظوظ ہوئیے- واقعہ یہ ہے :-

حضرت قلندر صاحب رحمتہ اللہ علیہ جن کی شفقت کی حالت یہ تھی کہ جب
تک کبیر الاولیاء نظر نہ پڑ جاتے تھے- چین نہیں آتی تھی- ایک روز کبیر الاولیاء
رحمتہ اللہ علیہ کے مکان پر تشریف لے گئے تو معلوم ہوا کہ حضرت کبیر الاولیاء
کھیت پر تشریف لے گئے ہیں- اب حضرت قلندر صاحب نے کھیت کا رخ کیا-
گھوڑے پر سوار ہوئے اور کھیت کی طرف چل دیئے- نوجوان کبیر الاولیاء نے
حضرت قلندر صاحب کو دور سے دیکھ کر پہچان لیا- تو آپ نے چنے (نخود) جو اس
کھیت کی پیداوار تھے ایک چھاج (غلہ افشان) میں بھرے اور جیسے ہی قلندر صاحب
کھیت کے قریب پہونچے- کبیر الاولیاء نے "چنوں" کی نذر پیش کی- حضرت قلندر

صاحب نے چنوں کا بھرا ہوا چھاج دیکھا تو مسکراتے ہوئے فرمایا- بیٹا کیا لائے ہو؟

جوان صالح کبیر الاولیاء کا یہ حسن ادب تھا کہ آپ نے یہ نہیں عرض کیا کہ
آپ کی خدمت میں چنے پیش کر رہا ہوں- کیوں کہ چنا کوئی قیمتی چیز نہیں ہوتا-
غلوں کی جنس میں بھی دوسرے درجہ کی جنس سمجھا جاتا ہے- آپ نے عرض کیا-

"حضرت والا کے گھوڑے کے لیے تھوڑا سا دانہ پیش کر
رہا ہوں"

حضرت قلندر صاحب نے فرمایا- "گھوڑے سے پہلے پوچھ لو- کیا وہ بھوکا
ہے- کیا اس کو دانہ چاہیے- اگر وہ دانہ کھانا چاہے تو اس کو کھلا دو-"

حضرت مخدوم نے یہ چھاج گھوڑے کے سامنے پیش کیا- گھوڑے نے بھی
کھانے سے انکار کر دیا- اور کہا میرا پیٹ بھرا ہوا ہے- حضرت نے پہلے دانہ کھلا دیا
تھا پھر سوار ہوئے تھے- (غالباً زبان حال سے گھوڑے نے یہ جواب دیا-)

اب حضرت مخدوم (کبیر الاولیاء) حیران تھے- کہ نہ خود حضرت قلندر
صاحب یہ پیش کش منظور فرماتے ہیں نہ ان کا گھوڑا-

حضرت قلندر صاحب نے جوان صالح خواجہ محمد (حضرت کبیر الاولیاء) کو
پریشان اور نادم دیکھا- تو فرمایا :-

"پریشان نہ ہو- ہم نے تمہاری نذر منظور کر لی ہے- اور اب
ہم یہ غلہ اپنی طرف سے تمہیں بخش رہے ہیں- اور میں اللہ
رب العزت سے دعا کر رہا ہوں کہ ہر دانہ کے بدلہ تمہیں
لڑکا بخشے-"

حضرت مصنف سیر الاقطاب فرماتے ہیں :-

اللہ تعالیٰ نے حضرت قلندر صاحب کی دعا قبول فرمائی- چنانچہ اتنی اولاد ہوئی
اور وہ اتنی پھیلی کہ اگر آپ کو (نوح ثانی) کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا-
(سیر الاقطاب)

خود احقر کے وطن عزیز قصبہ (۱) دیوبند میں بھی ایک عثمانی خاندان ہے جس کا سلسلہ حضرت کبیر الاولیاء سے ہے۔

نکاح

مگر دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ یہ مورث محترم جن کو مصنف سیر الاقطاب "نوح ثانی" فرما رہے ہیں۔ یہ خود طے کیے ہوئے تھے کہ نکاح نہیں کریں گے۔ حضرت پیر مرشد کے شدید اصرار پر آپ نے یہ سنت ادا فرمائی تھی۔ پورا واقعہ اور حضرت شیخ سے گفتگو۔ سیر الاقطاب کے حوالہ سے درج کی جا رہی ہے۔

ملاحظہ فرمایئے۔

مصنف سیر الاقطاب جن کا اسم گرامی اللہ دیا ہے۔ (خلف شیخ عبدالرحیم ابن شیخ پناہ حکیم جو حضرت کبیر الاولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں سے ہیں) تحریر فرماتے ہیں۔

حضرت مخدوم حضرت ترک رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت ہو چکے۔ خلافت بھی مل گئی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد حضرت مرشد نے بہت اصرار کیا۔ کہ حضرت مخدوم نکاح کر لیں۔

حضرت مخدوم کبیر الاولیاء نے معذرت کی کہ یہ خادم تو طے کر چکا ہے۔ کہ نکاح نہیں کرے گا۔ آپ نے عرض کیا۔ میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی سعادت اور سب سے زیادہ قیمتی پونجی حضرت والا کی خدمت کو سمجھتا ہوں۔ جو لمحہ بھی ایسا گذرے کہ یہ خادم حاضر خدمت نہ ہو۔ وہ میرے حق میں نقصان عظیم ہے۔ فدوی قطعاً گوارا نہیں کرتا کہ کوئی ایسا مشغلہ اختیار کرے۔ جس سے حضرت والا کی

ا۔ دیوبند کے مشہور علماء مثلاً حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ۔ حضرت مولانا [illegible] احمد صاحب بھی عثمانی ہیں۔ مگر اس خاندان کا سلسلہ دوسرا ہے۔ ان کے علاوہ عثمانی حضرات کا ایک [illegible] خاندان بھی ہے وہ علمی لحاظ سے تو اتنا اونچا نہیں ہے۔ البتہ دیوبند کے خاندانوں میں فائق مانا جاتا [illegible] برخوردار عزیز مولوی سید حامد میاں سلمہ (امیر جامعہ مدینہ لاہور) کے نانا اسی خاندان سے تھے۔ [illegible] حضرت کبیر الاولیاء کے سلسلہ نسب میں داخل ہونے کا فخر حاصل ہے۔ (محمد میاں)

خدمت میں خلل واقع ہو۔

حضرت شیخ (خواجہ شمس الدین ترک رحمتہ اللہ علیہ) نے مرید باسعادت کا بیان سنا۔ تو فرمایا۔

> "بے شک آپ کے اخلاص اور آپ کی محبت و عقیدت کا فیصلہ یہی ہے۔ اور جس طرح آپ کو مجھ سے تعلق خاطر ہے۔ ایسے ہی مجھے بھی آپ سے غیر معمولی انس ہے۔ میں خود بھی نہیں چاہتا کہ آپ مجھ سے جدا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں آپ کو اپنی اولاد سمجھتا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہتا ہوں کہ آپ میرے صحیح جانشین بنیں۔ مخلوق خدا کو آپ سے فائدہ پہونچے۔ لیکن آنحضرت ﷺ کی سنت مبارکہ کا درجہ ہماری ان تمام آرزوؤں اور تمناؤں سے بڑھا ہوا ہے ---- نکاح آنحضرت ﷺ کی سنت ہے۔ اس پر ضرور عمل ہونا چاہیے۔

حضرت مخدوم کبیر الاولیاء ---- حضرت میں تو اس جھگڑے میں اب تک اس لیے بھی نہیں پڑا کہ خدا جانے کس قماش کی اولاد پیدا ہو۔ اور میری گردن پر اس کے اعمال و افعال کا وبال رہے۔

حضرت پیر مرشد۔ گھبرایئے نہیں۔ اگر اولاد صالح ہو تو وہ "باقیات صالحات" ہوگی۔ اور اگر خدانخواستہ بد قماش اور طالح ہوئی تو اس کا بوجھ تو میری گردن پر ہوگا۔ میں آپ کو نکاح کے لیے اصرار کر رہا ہوں۔

اللہ دیا صاحب۔ راوی ہیں کہ حضرت شمس رحمتہ اللہ علیہ نے پھر حضرت مخدوم کو یہ بھی سمجھایا کہ میں لوح محفوظ میں دیکھ چکا ہوں کہ آپ کے اتنی اولاد ہوگی کہ اس کا شمار مشکل ہوگا۔

بہر حال کافی رد و قدح کے بعد حضرت مخدوم (خواجہ محمد) نکاح کے لیے تیار ہوئے تو کرنال میں ایک خاندان تلاش کیا گیا۔ جہاں آپ کا رشتہ بھیجا گیا۔ پھر نکاح ہوا۔

اللہ دیا صاحب- اپنے مخصوص انداز میں جس کے ہر جز میں کسی کرامت کا اظہار ہوتا ہے- یہ بھی فرماتے ہیں کہ نکاح کے بعد جو مصنوعی شرم کے تکلفات عرصہ تک باقی رہتے ہیں- حضرت مخدوم نے اس کی اجازت نہیں دی- بلکہ جیسے ہی دولہن آپ کے دولت کدہ میں پہونچیں- آپ نے فرمایا-

"بی بی یہ تکلف چھوڑو- نظر اٹھاؤ- کام کرو- وضو کے لیے پانی لاؤ-"

بہر حال خدا کے فضل و کرم سے نکاح بہت مبارک ثابت ہوا- جتنی اولاد ہوئی نہایت صالح، متقی، صاحب کشف و کرامت- (تفصیل آگے آئے گی انشاء اللہ)

سیاحت اور حج

اگرچہ سوانح نگاروں کی بہت سی باتیں ہماری سمجھ سے بالا ہیں- ان میں سے کچھ باتیں آئندہ بلا تبصرہ یا مناسب تبصرہ کے ساتھ نقل بھی کر دی جائیں گی- مگر تین باتیں ایسی ہیں جن پر تبصرہ ضروری ہے- کیونکہ وہ تینوں باتیں سوانح کے اہم ابواب ہیں-

(۱) چالیس سال سیاحت میں صرف کیے-

(۲) چالیس حج کیے-

(۳) آپ کی عمر مبارک ایک سو ستر (۱۷۰) سال ہوئی- سال وفات ۷۶۵ھ ہے-

ایک صاحب نے یہ بھی تحریر فرمادیا کہ سنہ ولادت ۵۹۵ھ ہے-

اللہ دیا صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

منقول ہے کہ جب حضرت مخدوم العالمین کبیر الاولیاء چالیس سال کے بعد وطن مالوفؒ میں تشریف لائے اور حضرت مخدوم شیخ شرف الدین بو علی قلندرؒ سے (جن سے زمانہ طفولیت سے پورا اخلاص اور اعتقاد رکھتے تھے) بیعت ہونے

کی درخواست کی تو حضرت قلندر صاحب نے فرمایا- آپ کی کامیابی کا مدار ایک دوسرے صاحب پر ہے- جو عنقریب امروز فردا میں یہاں پہونچنے والے ہیں-

یہ پہلے گذر چکا ہے کہ حضرت خواجہ شمس الدین ترک رحمتہ اللہ علیہ کو ان کے مرشد محترم حضرت مخدوم المشائخ خواجہ علاؤالدین صابرؒ (کلیری) کا حکم تھا- کہ ان کی وفات کے بعد تین دن کلیر شریف میں گذاریں- پھر پانی پت روانہ ہو جائیں-

حضرت خواجہ کلیری رحمتہ اللہ علیہ کی وفات ۶۹۰ھ میں ہوئی پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسی سنہ میں حضرت شمسؒ کلیر سے پانی پت تشریف لائے- اور اسی ۶۹۰ھ میں حضرت کبیر الاولیاء حضرت شمس الاولیاء سے بیعت ہوئے- پس اگر حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کی ولادت ۵۹۵ھ میں تسلیم کی جائے- تو ۶۹۰ھ میں آپ کی عمر ۹۵ سال ہوگی- اور اس عمر میں ممکن ہے کہ چالیس سال سیاحت میں صرف کیے- اور اسی دوران یا اس سے کچھ آگے کچھ پیچھے چالیس حج بھی کر لیے ہوں- لیکن قابل توجہ یہ ہے کہ جو صاحب سنہ ولادت ۵۹۵ھ قرار دے رہے ہیں وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں :-

ایام طفولیت میں حضرت قطب ابدال شاہ شرف الدین بو علی قلندر قدس سرہ آپ کو لوریاں سنا سنا کر کھلایا کرتے تھے- اور اس لوری ہی میں حضرت قلندر صاحب نے خوش خبری دی تھی- کہ تو خواجہ ترک کے نقش قدم پر چلے گا-

پھر یہی مصنف صاحب حضرت قلندر صاحب کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں- ۶۰۵ھ میں خشی ہند- قطب ابدال مولانا شاہ شرف الدین بو علی قلندر پانی پت میں پیدا ہوئے-

یعنی خود ان کی روایت کے مطابق حضرت مخدوم کبیر الاولیاء حضرت قلندر صاحب سے دس سال بڑے ہوئے تو لوریاں سنانے- ایام طفولیت میں شفقت-

تحنن میں خوشخبری سنانے وغیرہ کی تمام باتیں غلط ثابت ہوتی ہیں۔

اور اگر یہ باتیں صحیح تسلیم کی جاتی ہیں تو یہ قطعاً غلط ہوگا۔ کہ حضرت مخدوم صاحب نے ۷۰ سال کی عمر پائی۔

اب صرف یہ نہیں کہ سنہ ولادت ۵۹۵ھ کے علاوہ کوئی اور تسلیم کرنا پڑے گا۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہوگا۔ کہ حضرت قلندر صاحب کو عمر میں اتنا بڑا تسلیم کیا جائے۔ کہ حضرت قلندر صاحب کا دور قلندری ہو اور حضرت کبیر الاولیاء کا دور طفولیت اور تحنن ہو۔

یہاں یہ بھی نظر انداز نہ ہونا چاہیے کہ سوانح نگاروں کے بیان کے بموجب چالیس سال کی عمر میں حضرت قلندر صاحب پانی پت سے دہلی تشریف لے گئے ہیں۔ پھر چالیس سال قطب مینار کے نیچے درس دیتے رہے۔ اس کے بعد یا اسی دور میں بیس سال منصب قضاء سنبھالے رہے۔ اب یا تو حضرت مخدوم الاولیاء کی ولادت کا وہ دور مانا جائے۔ جب حضرت قلندر صاحب دہلی نہیں تشریف لے گئے تھے بلکہ پانی پت ہی میں مقیم تھے۔ یعنی ۶۴۵ھ سے پہلے مثلاً ۶۳۵ھ یا ۶۴۰ھ یا وہ دور تسلیم کیا جائے جب حضرت قلندر صاحب دہلی سے واپس تشریف لا کر پانی پت میں مقیم ہو چکے ہیں۔ جو کم از کم ۶۶۵ھ کے بعد کا زمانہ ہوگا۔ مگر اس صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حضرت قلندر صاحب نے درس و افتاء کی خدمت چالیس سال نہیں بلکہ صرف بیس سال انجام دی ہے۔ (جیسا کہ ... سوانح نگاروں نے تحریر کیا ہے)

ان دونوں صورتوں میں یہ تسلیم کرنا بعید از قیاس ہوگا کہ حضرت کبیر الاولیاء نے چالیس سال سیاحت میں صرف کیے۔ اس کے بعد آپ حضرت ترک ... ہوئے۔ کیونکہ اگر سنہ ولادت ۶۶۵ھ مانا جائے تو سال بیعت یعنی ۶۹۰ھ میں عمر شریف صرف پچیس سال ہوگی۔ اور اگر سال ولادت ۶۳۵ھ مانا جائے تو ۶۹۰ھ میں آپ کی عمر ۵۵ سال ضرور ہوگی۔ مگر یہ قطعاً بعید از قیاس ہوگا۔ کہ چالیس سال آپ نے سیاحت میں بھی صرف کر دیے ہوں۔ غالباً کوئی سوانح نگار بھی اس کو

نہیں کرے گا کہ صرف پندرہ سال کی عمر میں آپ سیاحت کے لیے وطن عزیز سے نکل چکے تھے۔

پھر حضرت قلندر صاحب کے شعر موزوں کرنے۔ نیز حضرت مخدوم الاولیاء کے کھیت پر قلندر صاحب کے تشریف لے جانے کے واقعہ کو یا ان جیسے اور واقعات کو غلط تو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ البتہ ان کو صحیح تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہے۔ کہ حضرت قلندر صاحب اور حضرت مخدوم صاحب کی عمروں میں اتنا تفاوت ہو کہ حضرت قلندر صاحب جوان ہوں اور حضرت مخدوم صاحب کا ایسا تحنن ہو جس میں لوریاں دی جاتی ہیں۔ اور جب حضرت مخدوم صاحب جوان ہو کر اس قابل ہو گئے ہوں کہ زراعت کا انتظام کر سکیں۔ ایک بانکے نوجوان کی طرح سرخ لباس پہن کر شہ سوار بن سکیں تب حضرت قلندر صاحب کا دور قلندری شروع ہو گیا ہو۔

اس تمام بحث اور تبصرہ و تنقید کا خلاصہ یہ ہے کہ پوری عمر ۷۰ اسال اور سنہ ولادت ۵۹۵ھ کی روایتیں قطعاً غلط ہیں۔ قرین قیاس یہ ہے کہ آپ کی ولادت تقریباً ۶۳۵ھ میں ہوئی ہے۔ جب حضرت قلندر صاحب کی عمر شریف تقریباً تیس سال تھی۔ اور ابھی آپ دہلی تشریف نہیں لے گئے تھے۔ پھر ۶۴۵ھ سے تقریباً ۶۸۰ھ تک حضرت قلندر صاحب دہلی میں رہے۔ اور حضرت مخدوم الاولیاء جوان ہوئے تو صحرا نوردی شروع کر دی۔ اور تقریباً بیس پچیس سال کی صحرا نوردی اور سیاحت کے بعد جب عمر شریف تقریباً پینتالیس سال ہوئی تب آپ تقریباً ۶۸۰ھ میں پانی پت تشریف لائے۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب حضرت قلندر صاحب دہلی کی سکونت اور سلسلہ درس و تدریس اور منصب قضا و افتاء ختم کر کے پانی پت تشریف لے آئے تھے۔ اس صورت میں انہیں مصنف صاحب کی یہ روایت بھی صحیح ہو جاتی ہے۔ جو خود انہیں کے الفاظ میں درج کی جا رہی ہے۔

بیعت

حضرت مخدوم خواجہ محمد جلال الدین کبیر الاولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی تعلیم و تربیت حضرت قطب ابدال (قلندر صاحب) نے ہی فرمائی- اسی وجہ سے بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور محبوب حقیقی کی طلب رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی- حضرت قطب ابدال کو آپ سے بدرجہ غایت محبت تھی- اور آپ ہی نے مدارج معرفت طے کرائے- لیکن مرید نہ کیا- شیخ جلال (مخدوم صاحب) جب کبھی مرید ہونے کی درخواست کرتے تو قطب ابدال از راہ شفقت فرماتے کہ تو تو ہماری بیٹی ہے- جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ تو تجھ کو جہیز میں دیں گے اور تیرا شوہر تجھے اس گھر کا مالک بنائے گا- چنانچہ جب خواجہ شمس الدین ترک "پانی پت" تشریف لائے تو حضرت قلندر صاحب نے خود شیخ جلال کو حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی کی خدمت میں مرید ہونے کے لیے بھیجا- اس طرح شیخ جلال دولت قلندری سے مالا مال ہو کر "دولت صابری" کے وارث بنے- رحمتہ اللہ-

حضرت شیخ کی خدمت

بیعت ہونے کے بعد خدمت شیخ کے متعلق کوئی واضح روایت نہیں ملتی- البتہ شادی کے سلسلہ میں جو گفتگو پہلے نقل کی جا چکی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

> ہمہ وقت حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر رہتے اور آپ کی خدمت کرنے کو حضرت کبیر الاولیاء نے زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا- آپ کو گوارا نہیں تھا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی حضرت شیخ کی خدمت سے علیحدہ ہوں- اسی بنا پر آپ نکاح کے لیے بھی آمادہ نہیں تھے-

حضرت شمس الاولیاء کی وفات ۷۱۵ھ میں ہوئی- اس حساب سے ۲۵ سال (از ۶۹۰ھ تا ۷۱۵ھ) حضرت کبیر الاولیاء اپنے شیخ کی خدمت میں مصروف رہے-

ایک جوہر شفاف- جو پہلے ہی تمام کدورتوں کو دور کر چکا ہو اس پر شمس منیر پچیس سال تک ضیا پاشی کرتا رہے تو وہ جو کچھ بھی ہو جائے کم ہے-

اب ہم سیر الاقطاب کی ایک روایت خود مصنف کے الفاظ میں نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں- اس روایت میں صرف "چہل" کے لفظ سے ہمیں اختلاف ہے- باقی تمام عبارت ایک فصیح و بلیغ سند ہے-

> "منقول است کہ آن قطب المکرمین چہل سال مسافرت کرد و مکرر حج الحرمین شریفین ادا نمود- و از بسیار مشائخ کرام و اولیاء عظام نعمت یافتہ- پس بوطن رسید کہ بعنایت ظاہری و باطنی حضرت صاحب ولایت سرفراز گردید- و بالہام ربانی ارادت بآنحضرت آورد و خدمتہا نمود- و ریاضت و مجاہدہ از حد گذرانید- خلافت یافت و اسم اعظم کہ سینہ بسینہ رسیدہ بود و نسبت سینہ خواجگان چشت بیاموخت و ہم بجائے فرزند صاحب سجادگی نیز بایشان رسید- و خانقاہ و خدمت روضہ منورہ نیز بایشان متعلق گشت-"
>
> ترجمہ: منقول ہے کہ (آن قطب المکرمین) یعنی (حضرت مخدوم کبیر الاولیاء رحمتہ اللہ علیہ) چالیس سال سفر اور سیاحت کرتے رہے- اسی عرصہ میں بار بار حرمین شریفین کی زیارت کی (متعدد حج کیے) بہت سے مشائخ اور اولیاء کرام کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے فیض اور روحانی نعمت حاصل کی- اس کے بعد وطن عزیز واپس ہوئے- یہاں حضرت صاحب ولایت (حضرت شیخ شمس الدین ترک) کی ظاہری اور باطنی عنایتوں سے سرفراز ہوئے- اور غیبی اشاروں کی بنیاد پر آپ کے حلقہ ارادت و بیعت میں داخل ہوئے- حضرت شیخ کی خدمت تن دہی، جانفشانی اور سلیقہ سے کرتے رہے- اور حد

سے زیادہ محنت اور کوشش صرف کی- پھر خرقہ خلافت حاصل کیا- اور اسم اعظم جو سینہ بسینہ چلا آرہا تھا- اور حضرت خواجگان چشت کی نسبت مبارکہ حاصل کی- بہر صورت جب کہ حضرت مخدوم الاولیاء حضرت خواجہ ترک کے فرزند کی جگہ تھے- تو آپ ہی حضرت خواجہ ترک کے سجادہ نشین قرار دیئے گئے- اور خانقاہ اور حضرت خواجہ ترکؒ کے مزار مبارک کی خدمت آپ ہی کے سپرد ہوئی-)

سند خلافت

سیر الاقطاب میں وہ سند خلافت جو حضرت خواجہ شمس الدین ترکؒ نے حضرت مخدوم کبیر الاولیاء رحمتہ اللہ علیہ کو عطا فرمائی تھی- پوری نقل کی گئی ہے- اس کے ابتدائی حصے میں آنحضرت ﷺ سے لے کر حضرت خواجہ علاؤالدین علی احمد صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ تک سلسلہ کے تمام مشائخ رحمہم اللہ کے اسماء گرامی ہیں- اس کے بعد اپنی طرف سے حضرت مخدوم الاولیاء کو خلافت عطا کرنے کا تذکرہ ہے- پھر وہ الفاظ ہیں جن میں اپنے اور حضرت مخدوم الاولیاء کے تعلقات مخدوم الاولیاء کی صلاحیتوں اور ان کے کمالات وغیرہ کا تذکرہ ہے- اور یہ کہ حضرت ترک کو حضرت مخدوم پانی پتی پر پورا اعتماد ہے کہ وہ اس سلسلہ کی قدر کریں گے- اور اپنی بہترین صلاحیتوں سے اس کو ترقی دیں گے اور اس کے فیض کو عام کریں گے- یہ الفاظ بہت شاندار ہیں- مگر کتابت کی غلطیوں نے ان کی صورت یہاں تک بگاڑ دی ہے کہ ناقابل فہم ہوگئے ہیں- ہم صرف چند الفاظ نقل کرتے ہیں-

حضرت ترک اپنے شیخ محترم حضرت خواجہ علاؤالدین کے اسم گرامی کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

هو اعطى الفقير مع ولايت پانی پت -------
وانا اعطيت تنسرة و خرقة و مقراضا و عصا و

كاسا و سلمت ما فی قلبی و روحی وجمی و عینی و بدنی وجنی و اسرادی و خفائی و اعلانی- ظاهر اوباطنا للا بن القلبی و حریف اسراری محمد بن محمد دين يعقوب و خطبته خطابا باسم جلال الدين وانا اقمته فی مقامی هذا و خططته مع سوادها وانا الاخذ بيدرجل من الرجال من بعد -----------

وشيخ جلال المذكور هو عالم بطريق الاسرار الا لهية وانا اعلمه فی مابقی و هواليق منهذه الدرجة - الخ

ترجمہ: حضرت خواجہ کلیریؒ نے اس فقیر کو خلافت عطا فرمائی- اور خدمت کے لیے یہ علاقہ پانی پت کا احقر کو سپرد کیا- اور میں عطا کر رہا ہوں- ٹوپی، خرقہ (عبا) مقراض، عصا اور پیالہ- اور جو کچھ میرے قلب، میری روح، میرے جسم، میری آنکھ، میرے بدن، میرے ظاہر اور پوشیدہ اور مخفی یا علانیہ میں میرے پاس ہے- وہ سب میں عطا کر رہا ہوں اپنے روحانی فرزند- واقف اسرار محمد بن محمود بن یعقوب کو، اور میں نے اس کو "جلال الدین" کا خطاب دیا ہے- اور اپنے مقام پر اس کو قائم کیا ہے- اور یہ پورا علاقہ مع اس کے مضافات کے اس کے سپرد کر دیا ہے- میں اب اس علاقہ میں کسی کو مرید نہ بناؤں گا- یہ شیخ جلال الدین اسرار خداوندی کے طریقوں سے واقف ہیں اور جو باقی ہیں ان کی میں تعلیم دے رہا ہوں- وہ اس درجہ اور مرتبہ کے لیے بہت موزوں ہیں-

کمالات و کرامات

جس برگزیدہ شخصیت کو حضرت خواجہ شمس الدین ترک جیسا شمس الاولیاء واقف اسرار الٰہیہ فرمائے۔ اور اپنے روحانی فیوض و کمالات سے یہاں تک مالا مال کردے کہ جو کچھ اس کے پاس ہو وہ سب اس کے حوالہ کردے۔ تو اس کے کمالات کے لیے کسی مزید بیان اور تحریر کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم چند کمالات اور کرامتیں تحریر کی جاتی ہیں۔

(۱) سیر الاقطاب میں آپ کا ایک کمال یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ :۔

"آنحضرت ہر کجا خواستے در طرفۃ العین آنجا رسیدے دہمچناں باز آمدے۔ ہر چند آن مقام دور تر بودے۔ چنانکہ اکثر نماز جمعہ بکعبۃ اللہ ادا کردے۔"

ترجمہ: آنحضرت (مخدوم صاحب) جہاں چاہتے پلک کے ایک جھپکے میں وہاں پہونچ جاتے پھر اسی طرح واپس آجاتے۔ خواہ وہ مقام کتنا ہی دور ہوتا۔ چنانچہ جمعہ کی نماز اکثر آپ خانہ کعبہ میں ادا کرتے تھے۔

سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک وزیر کا یہ کمال کلام اللہ شر میں بیان فرمایا گیا ہے۔ کہ انہوں نے ملکہ بلقیس کے بہت بڑے تخت کو قرآن حکیم نے "عرش عظیم" سے تعبیر کیا ہے۔ پلک جھپکنے سے بھی پہلے میل کے فاصلہ پر (یمن سے شام) پہونچا دیا تھا۔

اس وزیر کی خصوصیت قرآن حکیم میں یہ بیان فرمائی گئی ہے۔ " من الکتاب" اس کو کتاب (توراۃ) کا ایک علم حاصل تھا۔

پس جب تورات کے عالم کو خدا نے یہ کمال عطا فرمایا تھا۔ تو پھر قرآن حکیم کے کسی صاحب علم کو یہ کمال حاصل ہو کہ وہ پلک بھر میں کہیں پہونچ جائے۔

مگر یہ کمال کسی ایثار، جفاکشی اور قربانی کی خبر نہیں دیتا۔ اور فقہی نقطہ نظر بھی اس کی کچھ زیادہ تائید نہیں کرے گا۔ کیونکہ پنج وقتہ نمازوں میں تو شریعت نے مسجد محلہ کی جماعت میں شرکت کی تاکید فرمائی ہے۔

بیشک نماز جمعہ محلہ کی مسجد میں ٹھیک نہیں ہے۔ مگر جو شخص ہندوستان سے مکہ معظمہ پہونچے گا۔ اس پر سفر کے احکام عائد ہوں گے۔ مسافر کے حق میں نماز جمعہ کی وہ اہمیت نہیں رہتی۔

بہر حال ہمارے خیال میں حضرت مخدوم رحمتہ اللہ علیہ کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ باہر لنگر خانے میں ہر روز ایک ہزار مہمان کھانا کھاتے تھے اور گھر کی حالت یہ کہ "قوت لایموت" بھی مشکل سے میسر ہوتا تھا۔

ایک طرف فتوحات کی یہ کثرت کہ ہزار مہمانوں کو بروقت طرح طرح کے کھانے کھلائے جائیں۔ دوسری جانب اپنے ذاتی آمد و صرف کا یہ عالم کہ فاقوں کی بھی نوبت آتی رہے۔

یہ تھا دادا پیر حضرت صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ کا مسلک کہ بارہ سال تک حضرت خواجہ شکر گنج کے لنگر خانے کے مہتمم و منتظم رہے۔ اور ایک دانہ اس کھانے میں سے منہ میں نہیں ڈالا۔ حضرت مخدوم کبیر الاولیاء بھی ساری عمر اسی مسلک پر قائم رہے۔

سیر الاقطاب کی پوری روایت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:۔

"آنحضرت کو ظاہری تصرف بھی اس درجہ حاصل تھا کہ مطبخ میں ہر روز ایک ہزار آدمیوں کا کھانا تیار ہوتا تھا۔ دستر خوان پر پورے ایک ہزار آدمی بیٹھتے تھے اگر کبھی مہمان اتنی تعداد میں نہیں ہوتے تو خدام کو حکم تھا کہ کوچہ و بازار سے کچھ آدمیوں کو بلا لائیں۔ اور ہزار کی تعداد پوری کریں۔ کھانے طرح طرح کے ہوتے تھے۔ اگر حضرت مخدوم پانی پت سے باہر شکار میں ہوتے کبھی پندرہ بیس روز کبھی ایک ایک

مہینہ شکار میں رہتے - وہاں بھی مطبخ اور مہمانوں کی یہی شان رہتی تھی -

اس دریادلی اور فراخی حوصلہ کے باوجود :-

اگر کسے درخانہ آنحضرت خبری گرفت و مطلع می شد حیران می ماند - ازانکہ فقر و فاقہ اختیاری چنداں بکمال داشت کہ قوت یک روزہ ہم موجود نمی بود - وخداداند کہ این چہ تصرف و ولایت میسر گردیدہ بود -

ترجمہ : اگر کوئی آنحضرت مخدومؒ کے اندرون خانہ کی خبر لیتا - اور وہاں کی کیفیت و حالت سے مطلع ہوتا تو حیران رہ جاتا تھا کہ اپنے اختیاری فقر و فاقہ سے حالت یہ تھی کہ ایک دن کی خوراک کا سامان بھی گھر میں موجود نہیں ہوتا تھا - اور خدا جانے یہ کس قسم کی ولایت اور کس طرح کا تصرف آپ کو میسر ہوا تھا - (کہ گھر میں فاقہ اور باہر لنگر)

مصنف سیر الاقطاب نے آخر میں ایک سوال کر کے جواب کی طرف اشارہ کر دیا اور ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم جواب کی وضاحت کریں -

یہ اسی کا فقر و فاقہ تھا جو کاشانہ نبوت (صلی اللہ علیٰ صاحبہا وسلم) کی خصوصیت تھا کہ درہم و دینار کے ڈھیر - سرور کائنات ﷺ کی مسجد مبارک کے صحن میں لگے ہوئے ہیں - اور فخر الانبیاء رحمتہ اللعالمین ﷺ ان کو تقسیم فرما رہے ہیں - کہ تاریکی شب کی آمد سے پہلے پہلے یہ سب ان کے پاس پہنچ جائیں جو ان کے مستحق ہیں - نبی ﷺ کے لیے قطعاً موزوں نہیں کہ اس کے شبستان میں سونے یا چاندی کا کوئی ریزہ رات گذار سکے -

ہم اکثر پڑھا کرتے ہیں - لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ - (تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارک میں بہترین نمونہ ہے) مگر روپیہ پیسے کے معاملہ میں ہمیں اس اسوہ حسنہ اور "بہترین مثال" کا تصور کم

نہیں آتا - ہم اپنے مدرسوں اور مذہبی اداروں کے لیے اہل خیر سے چندے وصول کرتے ہیں - چندہ دینے والے ہمیں عطیہ نہیں دیتے بلکہ وہ ہمارے ادارہ کو عطیہ دیتے ہیں - مگر یہ احتیاط ہم سے ان چندوں کے بارہ میں بھی نہیں ہو سکتی جو ہمارے پاس صرف امانت ہوتے ہیں - اس کے برعکس حضرت مخدوم کبیر الاولیاء رحمتہ اللہ علیہ کو لوگ جو کچھ ان کو دیا کرتے تھے - اس قسم کی فتوحات عام طور پر ذاتی ملک تصور کی جاتی ہے - لیکن سرور کائنات ﷺ کی صحیح اتباع سنت یہ ہے کہ آپ ان ذاتی اور شخصی عطیات کو بھی امانت قرار دیتے تھے - اور جو کچھ فتوحات ہوتی تھی وہ لنگر خانے کی امانت تصور فرماتے تھے -

پھر اس امانت داری سے بھی بڑھا ہوا کمال وہ "اخفاء" ہے - جو بذات خود ایک کرامت ہے - یعنی گھر کی حالت گویا اندرون خانہ کی امانت ہوتی تھی - ناممکن تھا کہ کسی کو اس کا پتہ بھی چل جائے -

قرآن حکیم نے قرن اول (دور رسالت علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام) کی یہ شان فرمائی ہے - یحسبہم الجاہل اغنیاء من التعفف - جو لوگ ان کے اندرونی حالات سے ناواقف ہیں وہ ان کو امیر اور تونگر سمجھتے ہیں - اس لیے کہ وہ اظہار ضرورت کے ہر ایک موقع سے پاکدامن رہتے ہیں - وہ ہرگز گوارا نہیں کرتے کہ اشارہ و کنایہ میں بھی کوئی ایسی بات کسی کے سامنے آ سکے جس سے گھر کے فقر و فاقہ کا اس کو احساس ہو جائے -

مستجاب الدعوات ہونا

حضرت خواجہ محمد پانی پتی کو شیخ نے جلال الدین اور مشائخ نے کبیر الاولیاء اسی لیے کہا کہ وہ قرن اول کے بزرگوں کی اس خصوصیت کے حامل تھے کہ اندرون خانہ فاقہ مست اور باہر بادشاہوں سے بھی زیادہ تونگر اور سخی داتا - رحمہ اللہ -

یہ ایثار - اور دوسروں کے لیے یہ ترجیحی سلوک کہ گھر میں فاقہ اور دوسروں کے لیے طرح طرح کے شکم سیر کھانے - یہ اس درد کا پتہ دیتا ہے جس کا نام ہے

خلق خدا کی غمخواری ہے، یہ غمخواری اور یہ ہمدردی خلق خدا وہ کیمیا ہے جو مشت
خاک کو کندن بنا دیتا ہے۔ اور انسان کو فرشتوں سے بھی اوپر پہونچا دیتا ہے۔ پس ایسا
شخص اگر مستجاب الدعوات ہو۔ اور بقول سیر الاقطاب اگر اس کی حالت یہ ہو کہ :۔

"ہرچہ از زبان مبارکش بر آمدے ہماں شدے۔"

(ان کی زبان مبارک پر جو کچھ آتا وہی ہوتا تھا۔)

تو مقام تعجب نہیں۔ کیونکہ زبان مبارک پر وہی آئے گا۔ اور دعا کے لیے ہاتھ
اسی کی خاطر اٹھیں گے جو ہمدردی خلق خدا کی چھلنی میں چھنا ہوا ہوگا۔

(۲) اسی قبولیت دعا کے سلسلہ میں وہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ جس نے اس
زمانہ کے بادشاہ فیروز شاہ کو بھی یہاں تک متاثر کر دیا تھا کہ وہ سلام کرنے اور دعائیں
لینے کے لیے پانی پت حاضر ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ مخدوم جہانیاں حضرت سید جلال اپنے وطن
"اوچ" سے دہلی تشریف لائے ہوئے تھے۔ بادشاہ کے مہمان
تھے کہ سخت بیمار ہو گئے۔ یہاں تک کہ نزع کی کیفیت شروع
ہو گئی۔ لوگ مایوس ہو کر جنازہ وغیرہ کے انتظام میں مصروف
ہونے لگے۔ دفعتہً حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء
وہاں پہونچے۔ بیمار کے سرہانے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ بیمار
نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ حضرت مخدوم پانی پتی نے فرمایا۔
اٹھئے وضو کیجئے۔ حضرت سید جلال جو بیمار تھے اور نزع کی
حالت میں تھے اٹھے۔ وضو کیا۔ پھر دعا کی۔ اور خدا کے فضل
سے اچھے ہو گئے۔ بیماری کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ یہ سلب
مرض کی ایسی عجیب و غریب صورت تھی جس کو کرامت ہی
کہا جا سکتا ہے۔ بادشاہ جو سید جلال مخدوم جہانیاں جہاں گشت
سے بیعت تھا۔ وہ بھی وضو وغیرہ کر کے اس لیے آ رہا تھا کہ
اپنے پیر کی آخری زیارت کر لے۔ جب اس نے یہ کرامت

دیکھی تو وہ بھی حیران رہ گیا۔

اس کے بعد حضرت سید جلال دس سال تک زندہ رہے۔

اب اس واقعہ کو سیر الاقطاب میں جس انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ بھی
ملاحظہ فرمائیے۔

مصنف سیر الاقطاب اللہ دیا صاحب عثمانی۔ حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے
سب سے بڑے صاحبزادے حضرت شیخ عبدالقادر رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں سے
ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت کے پانچوں فرزند حاضر تھے۔ حضرت
مخدوم کبیر الاولیاء نے فرمایا :۔

"حضرت حق جل مجدہ کا فرمان یہ ہے کہ میں اپنی عمر کا کچھ
حصہ اپنے ہمنام "سید جلال" کو دیدوں۔ وہ بیمار ہیں اور ان کی
عمر پوری ہو چکی ہے۔ صاحبزادوں نے جب یہ سنا تو چاروں نے تو
عرض کیا" کہ حضرت کی زندگی اتنی قیمتی ہے کہ ہماری آرزو
یہ ہے کہ ہم سب کی عمریں آپ کی نذر ہو جائیں تو ہم اس کو
اپنی اور ساری مخلوق کی بہت بڑی سعادت سمجھیں گے۔ پس
ہم یہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ حضرت کی عمر میں کمی ہو۔"

پانچویں فرزند حضرت شبلی نے عرض کیا کہ اگر فرمان خداوندی یہی ہے۔ تو
آپ یقیناً اپنی عمر مبارک کا کچھ حصہ سید جلال کو عطا کر دیں۔ تاکہ خلق خدا ان کے
فیوض سے اور زیادہ بہرہ یاب ہو سکے۔ کیونکہ موت تو لامحالہ آنے والی ہے۔ جناب
والا اپنی عمر کا ایک دن دیدیں یا بالکل کچھ نہ دیں۔ اور آپ کی عمر اتنی بڑھ جائے۔ کہ
ایک ہزار سال تک آپ کے فیض کے چشمے بہتے رہیں تب بھی موت سے نجات
نہیں۔ وہ اب نہ سہی، ایک ہزار سال بعد آئے گی مگر لامحالہ آئے گی۔

پس اگر اشارہ خداوندی یہ ہے کہ آپ اپنی عمر کا کچھ حضرت سید جلال کو
دیدیں تو بہتر یہ ہے کہ خوشنودی دوست کی خاطر یہ قربانی منظور فرمائیں۔

حضرت مخدوم پانی پتی اس جواب سے خوش ہوئے۔ پھر آپ استغراقی کیفیت

طاری ہوگئی- سب صاحبزادے بھی یہاں سے رخصت ہوگئے- صرف شیخ
عبدالقادر صاحب جو مصنف سیر الاقطاب کے مورث ہیں' وہیں ٹھہرے رہے-
حضرت مخدوم پانی پتی استغراقی کیفیت سے بیدار ہوئے چشم مبارک کھولی تو وہاں
عبدالقادر صاحب موجود تھے- فرمایا اچھا- تم یہاں موجود ہو تو آؤ- میرے ساتھ
چلو- یہ فرما کر عبدالقادر صاحب سے فرمایا- اپنے پاؤں میرے پاؤں پر رکھو اور
آنکھیں بند کر لو- حضرت خواجہ عبدالقادر نے آنکھیں بند کر لیں- پھر حضرت
مخدوم نے فرمایا- اب آنکھ کھولو- حضرت خواجہ عبدالقادر نے آنکھ کھولی- تو دیکھا
کہ وہ بجائے پانی پت کے دہلی کے شاہی محل میں ہیں- جہاں حضرت سید جلال پر
نزع کی کیفیت طاری ہے- حضرت مخدوم پانی پتی مریض کے سرہانے پہونچے اور
سلام کیا- سید جلالؒ نے فوراً آنکھیں کھولیں- سلام کا جواب دیا- حضرت مخدوم پانی
پتی نے فرمایا- اٹھو' وضو کرو- سید جلال صاحب بستر مرض سے جو اب بستر مرگ
بنا ہوا تھا اٹھے- وضو کیا- پھر حضرت مخدوم پانی پتی سے کچھ درخواست کی- حضرت
مخدوم نے انگلیوں سے اشارہ کر کے یہ بتایا کہ اپنی عمر میں سے دس سال حضرت سید
جلال کو دیدیئے- چنانچہ حضرت سید جلال فوراً تندرست ہوگئے- حضرت مخدوم
پانی پتی فوراً رخصت ہو کر پانی پت پہونچ گئے- جب فیروز شاہ کو یہ معلوم ہوا کہ
حضرت سید جلال تندرست ہوگئے تو وہ فوراً حاضر ہوا- اور عرض کیا- میری بڑی
خوش قسمتی ہے کہ میرے زمانہ سلطنت میں اللہ تعالیٰ کے ایسے برگزیدہ بندے
ہیں- بادشاہ نے اپنے شیخ طریقت سید جلال مخدوم جہانیاں سے عرض کیا کہ
چاہتا ہے میں حضرت مخدوم پانی پتی کی خدمت میں حاضر ہوں- سید صاحب
فرمایا- بہت بہتر ہے- آپ ضرور حاضری دیجئے- چنانچہ بادشاہ شاہانہ انداز
پت پہونچا- خدمت مبارک میں حاضر ہوا- شکریہ ادا کیا- پھر عرض کیا-
لایا ہوں- وہ منظور فرمالیجئے-

چنانچہ بہت سے خوان ہیرے جواہرات' سونے چاندی کے سکوں اور اعلیٰ
کے کپڑوں سے لبالب بھرے ہوئے پیش کیے گئے-

حضرت مخدوم پانی پتی نے فرمایا- یہ ہمارے کس کام کے ہیں- ہم فقیر لوگ
ہیں ہمارے یہاں نہ کوئی دربان نہ چوکیدار' دروازے کے کواڑ بھی ہمارے یہاں
رات کو بند نہیں ہوتے- ان ہدایا کی حفاظت کی مصیبت کون مول لے- آپ کے
یہاں ہی ان ہی حفاظت کا انتظام ہے- یہ آپ کو ہی مبارک ہوں- بادشاہ نے ہر
چند خوشامد کی مگر شنوائی نہیں ہوئی- جب بادشاہ حضرت مخدوم کی منظوری نہ
حاصل کر سکا- تو اس نے آپ کے صاحبزادوں کو راضی کرنا چاہا- وہ بھی تیار نہ
ہوئے- کہ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ ہمیں دے رکھا ہے- کسی کا احسان نہیں ہے- تو
ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اپنے "فقر" اور استغناء کو چھوڑیں- احسان مند بنیں- اور
ان کی حفاظت کے انتظام میں وقت عزیز ضائع کریں- بہر حال جب بادشاہ کو سب
طرف سے مایوسی ہوئی تو حکم دیا کہ یہ سب خوان ہی آستانہ مخدوم پر چھوڑ دیئے
جائیں-

پھر چشم نم رخصت ہوا- اور دہلی واپس آ گیا-

ایک علمی لطیفہ

اسی اثناء میں جب بادشاہ خدمت میں حاضر تھا تو اس نے عرض کیا- حضرت
والا- کیا جناب نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے-

حضرت مخدوم پانی پتی نے جواب دیا- شریعت کی تصریح ہے کہ ان آنکھوں
سے خداوند عالم کو دیکھنا ممکن نہیں ہے- پس خدا کو تو نہیں دیکھا- البتہ "سایہ خدا"
(یعنی بادشاہ) کو دیکھا ہے- بادشاہ کو عموماً "ظل اللہ" کہا جاتا تھا- یعنی اللہ کا سایہ-
بادشاہ اس برجستہ جواب سے بہت خوش ہوا- اور وہ ہدیے پیش کیے جن کا ذکر اوپر
گذرا ہے-

ضروری تبصرہ

ہم نے یہ واقعہ سیر الاقطاب کے حوالہ سے نقل کر دیا ہے مگر تاریخی قرائن
اس کی تائید نہیں کرتے- کیونکہ اس واقعہ کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھی قبولیت دعاء

اور شفایابی کا یہ قصہ پیش آیا ہو اس وقت سے دس سال بعد حضرت مخدوم جہانیان کی وفات ہو گئی ہو۔

حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کی وفات ۷۶۵ھ میں ہوئی ہے۔ فرض کریئے کہ اسی سال یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت کبیر الاولیاء نے اپنی عمر کے دس سال حضرت مخدوم جہانیان کو دیدیئے تو حضرت مخدوم جہانیان کی وفات ۷۷۵ھ میں ہو جانی چاہیے۔ لیکن آپ کی وفات ۷۷۵ھ میں نہیں ہوئی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ دس سال بعد ۷۸۵ھ یا تیرہ سال بعد ۷۸۸ھ میں ہوئی۔ اخبار الاخیار میں سال وفات ۷۸۵ھ ہے اور معارج الولایت میں ۷۸۸ھ۔

حضرت مولانا عبدالحق صاحب محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ سید جلال بخاری جن کا لقب مخدوم جہانیان ہے۔ یہ ایک ایسے باکمال بزرگ تھے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت بھی عطا فرمائی تھی۔ اور ولی کامل بھی تھے اور خاندانی لحاظ سے سید بھی تھے۔

خزینۃ الاصفیاء میں ہے کہ آپ مادر زاد ولی تھے۔ پہلے شیخ الاسلام شیخ رکن الدین قریشی سے بیعت ہوئے اور خلافت حاصل کی۔ آپ کو سیاحت کا شوق تھا بہت سے ممالک میں آپ تشریف لے گئے۔ حج بیت اللہ شریف سے بار بار مشرف ہوئے۔ بہت سے علماء اور مشائخ سے علوم ظاہری و باطنی کا استفادہ کیا۔ ... سلسلوں سے آپ کو خلافت ملی تھی۔ سلطان فیروز کے زمانہ میں اوچ ... تشریف لائے۔ ۷۰۷ھ کی شبرات کو آپ کی ولادت ہوئی تھی۔ اور ۷۸ ... ۸۱ سال عمر پوری کر کے ۷۸۵ھ یا ۷۸۸ھ کی عید الاضحیٰ کے روز آپ کی ... ہوئی۔ اوچ ملتان کے قریب کوئی مقام تھا۔ (اخبار الاخیار و خزینۃ الاصفیاء)

(۳) مصنف سیر الأقطاب نے ایک اور واقعہ بھی بیان کیا ہے۔ مگر ... برعکس ہے۔ یعنی "مرنے" کی خبر دی۔ اور جیسے خبر دی تھی ویسے ہی موت ...

اس کے متعلق سیر الاقطاب کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ کا ... تھا۔ "فتح خاں" یہ بادشاہ سے بہت بے تکلف تھا۔ اس زمانہ میں آنحضرت ...

پائے مبارک کا نقش بھی کسی طرح بادشاہ کو میسر آ گیا تھا۔ ماموں بھانجہ (بادشاہ اور فتح خاں) میں سے ہر ایک کی تمنا تھی کہ یہ نقش مبارک دفن کے وقت اس کے سینہ پر رکھا جائے۔ دونوں میں کافی بحث ہوئی۔ بالآخر ایک ایسی بات پر فیصلہ ہوا جس نے ہر ایک کو پہلے مرنے کا آرزو مند بنا دیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں میں سے جو پہلے مرے یہ نقش مبارک اس کے سینہ پر رکھا جائے گا۔

معلوم ہوتا ہے "فتح خاں" کی تمنا بڑھی ہوئی تھی۔ اسے گویا عشق ہو گیا۔ کہ یہ نقش مبارک اس کے سینہ کا زیور بنے۔ اس عشق نے اس کو "موت" کا بھی آرزو مند بنا دیا۔ مگر خودکشی حرام ہے۔ تو اس نے اکابر مشائخ کی خدمت میں حاضری شروع کی۔ کہ یہ روحانی مقصد انہیں کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ جو اس شاہراہ کی منزلوں سے واقف ہوتے ہیں۔ جب اسے حضرت خواجہ جلال الدین کبیر الاولیاء کی اس کرامت اور آپ کی دعا کی اس غیر معمولی مقبولیت کا علم ہوا۔ کہ دم کے دم میں بادشاہ کے پیر خدا کے فضل سے صحت مند و تندرست ہو گئے۔ تو اس کو یقین ہو گیا کہ جس کی دعا موت کو زندگی سے بدل سکتی ہے یقیناً اس کے انفاس قدسیہ زندگی سے بیزار کو موت کا عطیہ بھی عطا فرما سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ پانی پت پہونچا۔ اور بے مہابا حجرہ مبارکہ میں داخل ہونے لگا۔

شیخ زینا جو حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے خادم خاص اور خلیفہ تھے آستانہ پر حاضر تھے۔ اور بالفاظ سیر الاقطاب "حلقہ حجرہ در دست گرفتہ ایستادہ بسان فیل مست بے جنبد۔" (حجرہ مبارک کی زنجیر ہاتھ میں تھامے کھڑے تھے اور مست ہاتھی کی طرح جھوم رہے تھے)

شیخ زینا نے جب اس نوجوان کو بے باکانہ حجرہ میں داخل ہوتے دیکھا تو ڈانٹ کر کہا۔۔۔ او بچہ! کہاں جاتے ہو۔ کیا تم زندہ سلامت واپس آنا نہیں چاہتے۔

فتح خاں نے تڑخ کر جواب دیا۔ "سلامت می روم و سلامت باز آیم" (زندہ سلامت جاؤں گا اور اسی طرح زندہ سلامت واپس آؤں گا۔)

شیخ زینا! اگر تم زندہ سلامت واپس آجاؤ تو میرا کرتا چاک کر دینا۔ ورنہ میں

تمہاری "پی پی" کو (یعنی تمہارے کپڑے کو) پارہ پارہ کر دوں گا۔

فتح خاں کی آرزو ہی یہ تھی کہ موت کی پیشین گوئی کسی طرح میسر آجائے اس نے شیخ زینا کے اِس جملہ کو اپنی مراد کے لیے فال نیک تصور کیا۔ اور اسی طرح زبردستی حجرہ میں داخل ہو گیا۔

حضرت شیخ مراقبہ میں مصروف تھے۔ فتح خاں برابر میں دست بستہ کھڑے ہو گئے۔ حضرت شیخ تھوڑی دیر کے بعد مراقبہ سے فارغ ہوئے تو اتفاق سے زبان مبارک سے یہ جملہ صادر ہوا۔ "برو بمیر" (جاؤ مر رہو) اس جملہ کے سنتے ہی فتح خاں مسرت سے بے خود ہو گیا۔ اور مریدانہ انداز میں آداب بجا لاتے ہوئے حجرہ سے باہر آیا۔ شیخ زینا۔ اسی طرح آستانہ پر حاضر تھے۔ فتح خاں نے مخاطب ہو کر کہا۔ دیکھیے کس طرح زندہ سلامت نکل آیا۔

شیخ زینا: سلامتی کہاں۔ تیر نشانہ پر پہونچ گیا۔ موت کو سر پر سوار کر کے لائے ہو۔ دہلی تک صحیح سالم نہیں پہونچ سکتے۔

فتح خاں کی خود تمنا یہی تھی۔ اس نے کہا۔ حضرت زینا میری تو آرزو یہی ہے۔ اسی لیے تو آیا تھا۔ اور حضرت مخدوم کے ارشاد کے بعد آپ کی زبان سے بھی یہی کہلوانا چاہتا تھا۔ تاکہ بات پکی ہو جائے۔

اب فتح خاں خوش تھا۔ پھرتی سے گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور دہلی کی طرف گھوڑا دوڑا دیا۔ دہلی کے قریب پہونچا تو اس کو نیند آنے لگی۔ گھوڑے کو ٹھہرایا۔ اور چادر تان کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ اور فوراً ہی "جان حق تسلیم کر دی" (جان جان آفرین کے حوالہ کر دی۔

بادشاہ کو اس کی وفات کا علم ہوا تو اس کی موت سے زیادہ اس کا افسوس ہوا کہ وہ بازی لے گیا۔

چنانچہ دفن کے وقت یہ نقش مبارک اس کے سینہ کا زیور بنایا گیا۔

اللہ دیا صاحب مصنف سیر الاقطاب تحریر فرماتے ہیں:

"تا حال مطاف خلائق گردید۔"

(یہ مزار اب تک مخلوق کی زیارت گاہ ہے۔"

اللہ دیا صاحب نے سیر الاقطاب کی تصنیف ۱۰۳۶ھ میں شروع کی تھی۔ اور جیسا کہ آخر میں خود تحریر فرمایا ہے۔ ۱۰۵۶ھ میں ختم کی۔ یہ شاہجہاں بادشاہ کا دور حکومت ہے۔ اس وقت یہ مزار زیارت گاہ خلق خدا ہوگا۔

ایک گنبد پانی پت کے راستہ میں موضع باولی کے قریب دہلی سے تقریباً ۱۳ میل کے فاصلہ پر اب بھی ہے۔ اس کے متعلق اسی قسم کی روایت مشہور ہے۔ مگر اب یہ زیارت گاہ نہیں رہا۔ بلکہ غیر آباد کھنڈر ہے۔ ممکن ہے دہلی کی بڑھتی ہوئی آبادی چند روز ہی میں اس کو بے نشان کر دے۔

(۴) یوں تو عام طور پر ارادت مندوں اور معتقدین کی درخواست اپنے مشائخ سے ہوا کرتی ہے۔

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

(وہ جو خاک کو بھی ایک نظر سے کیمیا بنا دیتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نظر ہم پر بھی ڈال دیں۔)

مگر حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے متعلق ایسی روایتیں بھی مشہور ہیں۔ کہ آپ نے دلوں کی کھوٹی پونجی ہی کو کیمیا نہیں بنایا۔ بلکہ آپ کی نظر کیمیا اثر نے سنگریزوں کو پارس کی پتھری اور لکڑی اور لوہے کے سامان کو زر خالص بنا دیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ کسی دریا کے کنارے پہونچے۔ وہاں ایک جوگی آنکھ بند کیے بیٹھا تھا۔ حضرت شیخ اس کے پاس پہونچے تو اس نے آنکھ کھولی۔ اور کہا خوب آئے۔ میرے پاس پارس کی پتھری ہے۔ میں نے طے کر لیا تھا۔ کہ جب میں آنکھ کھولوں گا تو جو بھی سامنے ہوگا۔ یہ پتھری اس کو دیدوں گا۔ یہ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ تم سامنے ہو۔ لو اس پتھری کو احتیاط سے رکھو۔ دولت لازوال تم کو میسر آگئی۔

حضرت شیخ نے وہ پتھری لی۔ اور لاپروائی سے دریا میں پھینک دی۔ جوگی کو

اس حرکت پر بہت طیش آیا- اس نے حضرت شیخ کی شان میں بہت سخت سست الفاظ کہنے شروع کیے- حضرت شیخ نے فرمایا- پتھری تم مجھے دے چکے تھے- اب اگر میں نے اس کو دریا میں ڈال دیا تو میری چیز تھی- میں نے اس کو ضائع کر دیا- اب آپ خفا کیوں ہوتے ہیں- مگر جوگی کا غصہ فرو نہیں ہوا- وہ اور تیزی سے برہم ہونے لگا- اور یہ کہ وہ پتھری واپس کرو ورنہ میں تجھے یہاں سے جانے نہ دوں گا-

حضرت شیخ نے جب اس کو حد سے زیادہ برافروختہ دیکھا تو فرمایا: خفا نہ ہو جایئے- دریا میں نظر ڈالیے- آپ کو اس جیسی بہت سی پتھریاں ملیں گی- اپنی پتھری لے لیجئے- مگر دیکھئے صرف ایک ہی پتھری لینا- یہ نہ ہو کہ طمع میں آ کر دامن بھرنے لگو-

جوگی نے نظر ڈالی تو واقعی دریا میں پارس کی پتھریاں بے شمار پڑی تھیں اب جوگی حیران ہوا- اول تو اس نے چاہا کہ کئی پتھریاں اٹھالے- مگر حضرت شیخ نے فوراً روکا- کہ اپنے وعدہ پر قائم رہو- ایک سے زیادہ نہ لو-

بہر حال جوگی کا جوش اور غصہ ختم ہوا- تو حضرت شیخ نے فرمایا- جس کو خدا نے یہ طاقت بخشی ہو کہ معمولی سنگریزوں کو پارس کی پتھری بنا دے- وہ پارس کی ایک پتھری کی کیا قدر کر سکتا ہے- اور بھائی جوگی' پارس کی پتھری کی تلاش بے کار ہے- اس طاقت کی جستجو کرو- جو سنگریزوں کو پارس کی پتھری بنا دیتی ہے-

اب جوگی کی آنکھیں کھلیں' پارس کی پتھری کا خمار دماغ سے دور ہوا- اور اس حقیقی طاقت کی جستجو میں وہ آپ کے دامن سے وابستہ ہو گیا- چنانچہ دولت اسلام کے ساتھ اس کو خدا شناسی اور خدا رسی کی لازوال دولت بھی میسر آئی-

(۵) اسی طرح ایک مرتبہ حضرت شیخ کہیں سفر میں تشریف لے جا رہے تھے- شب کے وقت ایک گاؤں میں قیام فرمایا- دیکھا کہ گاؤں والے اپنا سامان اٹھا کر اور اپنے کپڑوں کی پٹلیاں باندھ کر گاؤں سے فرار ہونے کی تیاری کر رہے ہیں حضرت نے وجہ دریافت کی- تو گاؤں والوں نے عرض کی- کہ اس سال ژالہ باری سے ہماری فصلیں تباہ ہو گئی تھیں- حاکم سے ہم نے معافی کی درخواست کی- اس

نے محصول معاف نہیں کیا- وہ کل کو یہاں آنے والا ہے- ہم پر ظلم و ستم کرے گا- اس لیے ہم یہاں سے بھاگ رہے ہیں-

آپ نے فرمایا: اگر تم لوگ یہ گاؤں میرے ہاتھ فروخت کر دو- اور اس کا نام بدل کر جلال آباد رکھ دو- تو تم کو میں اتنا سونا دیدوں گا کہ تمہارا محصول ادا ہو جائے گا- باقی کو تم اپنے کام میں بھی لا سکو گے اور خوشحال ہو جاؤ گے-

گاؤں والوں کے لیے اس سے زیادہ اطمینان اور خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی وہ سب تیار ہو گئے-

آپ نے فرمایا- اچھا ایک کام کرو- تمہارے یہاں جتنے لوہے کے اوزار ہیں- سب کو اکٹھا کر لو- اور لکڑیوں کا ایک انبار لگا لو-

گاؤں والے جو ان تمام اوزاروں کو چھوڑ کر فرار ہو رہے تھے وہ اس کے لیے آمادہ ہو گئے- اور اپنے تمام اوزار اکٹھے کر دیئے- لکڑیوں کا بھی انبار لگا دیا- حضرت شیخ نے لکڑیوں میں آگ لگائی- اور فرمایا صبح کو اپنے اپنے اوزاروں کو دیکھنا- لکڑیوں کے انبار نے جب آگ پکڑ لی تو نصف شب کے قریب حضرت شیخ اس گاؤں سے روانہ ہو گئے- جب صبح ہوئی- گاؤں والے لکڑیوں کے اس چٹے پر جو رات بھر چل کر اب خاک ہو گیا تھا پہونچے- دیکھا کہ جو اوزار لوہے کے تھے- وہ سب سونے کے ہو گئے تھے- ان غریبوں نے اپنے یہ اوزار لیے اور حاکم کا واجبی محصول ادا کر دیا- باقی تمام سونا آپس میں تقسیم کر کے مالا مال ہو گئے اور حسب وعدہ گاؤں کا نام "جلال آباد" رکھ دیا-

ان روایتوں کے مطالعہ سے ایک ظاہر بیں کی نظر حضرت مخدوم کی قوت تصرف پر ہو گی- مگر ہماری نظر اس استغنا اور بے نیازی پر ہے جو ان کرامتوں کی بنیاد ہے- جو حقیقی پر تو ہے سید الکونین رحمۃ للعالمینؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوہ مبارکہ اور آپ کی سیرت مقدسہ کا-

آپ نے سیرت کی کتابوں میں پڑھا ہو گا- کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دربار رسالت میں عرض کیا تھا کہ اگر اجازت ہو تو احد کے اس اونچے

پہاڑ کو آپ کے لیے سونا بنا دیا جائے- تو سید الکائنات کا جواب یہ تھا-
خداوندا! مجھے یہ فقر ہی پسند ہے- ایک وقت بھوکا رہوں تو صبر کروں دوسرے وقت کھانا مل جائے تو شکر کروں- صبر و شکر دونوں کمال ہیں- دونوں کی فضلیتیں میسر آتی رہیں-

اسی کو صوفیا "فقر اختیاری" کہہ دیتے ہیں کہ دولت بداماں ہوتے ہوئے اپنی مرضی سے تہی دست ہیں-

چنانچہ سیر الاقطاب میں واقعہ نقل کیا ہے- کہ ایک کیمیا گر اتفاق سے پانی پت پہونچ گیا تھا- اس کو کسی طرح خانگی حالات کا علم ہو گیا- تو اس نے حضرت مخدوم کبیر الاولیاءؒ کے ایک صاحبزادہ کو اپنا شاگرد بنانا چاہا- صاحبزادہ نے والد صاحب سے اجازت چاہی- والد صاحب (حضرت مخدوم صاحب) حجرہ میں تشریف فرما تھے- آپ نے اپنی کھنکار کا لعاب حجرہ کی دیوار پر تھوک دیا- پوری دیوار دفعتہً سونے کی بن گئی- آپ نے صاحبزادہ کو یہ منظر دکھایا- اور فرمایا- لخت جگر کیمیا گر کا کیمیا کوئی حقیقت نہیں رکھتا- اصل کیمیا یہ ہے- یہ کیمیا سعادت حاصل کرو-

(۶) حضرت مخدوم الاولیاء کی ایک اور کرامت بھی نقل کی جاتی ہے کہ حضرت ایک روز کہیں تشریف لے جا رہے تھے- راستہ میں ایک بڑھیا ملی- حد سے زیادہ کمزور، چلنا پھرنا مشکل- پانی کی ایک ٹھلیا لیے جا رہی تھی- آپ نے بڑھ کر اس غریب بڑھیا سے یہ ٹھلیا لے لی- اور فرمایا- بڑی بی! کوئی اور نہیں تھا جو پانی لے جاتا- بڑی بی! کوئی ہوتا تو میں یہ مصیبت کیوں اٹھاتی- آپ نے فرمایا: اچھا بڑی بی آپ نے ٹھلیا بھری اور اس کے مکان پر پہونچا دی- اور فرمایا: بڑی بی جب تک تم زندہ ہو- اس ٹھلیا کا پانی انشاء اللہ تعالیٰ ختم نہیں ہو گا- چنانچہ ایسا ہی ہوا- جب تک وہ بڑھیا زندہ رہی ٹھلیا کا پانی ختم نہیں ہوا-

ہمارا خیال یہ ہے کہ اس بڑھیا کا مکان کہیں دور تھا- ورنہ حضرت صدیق اکبر حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی سنت تو صحیح روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ ایسی بڑھیا کے مکان پر یہ حضرات صبح سویرے روزانہ تشریف لے جاتے تھے- اور نہ صرف

بلکہ گھر کا اور کام بھی پورا کر کے واپس آتے تھے-

(۷) حضرت مخدوم کبیر الاولیاء رحمتہ اللہ علیہ کا ایک اور کمال ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے- اس کی اگر تفصیل کی جائے تو کچھ باتیں مورخین کے لیے ناقابل فہم بھی ہیں- اس لیے جو مورخ سوانح نگاری میں روایت کے ساتھ درایت سے بھی کام لینا چاہتے ہیں- انہوں نے اس کو نظر انداز کر دیا ہے- مگر واقعہ اتنا مشہور ہے کہ اس کو نظر انداز کر دینا بھی مناسب نہیں ہے- اس لیے ہم بنام خدا اس کو تفصیل کے ساتھ نقل کرتے ہیں-

حضرت مخدوم صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا کمال اور آپ کی کرامت تو یہ ہے کہ حضرت شیخ جمال الدین احمد ہانسویؒ کا سلسلہء فیض جو حضرت خواجہ علاؤالدین علی احمد صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ کی بددعا سے بند ہو گیا تھا- حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء کی دعا سے وہ دوبارہ جاری ہوا- یہ کمال اور یہ کرامت یقیناً قابل تذکرہ ہے- لیکن پہلی بات بددعا کی ہے- کہ حضرت صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ بددعا کیوں کی؟ دوسری بات یہ کہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی رحمتہ اللہ علیہ کی وفات ۶۶۵ھ میں ہو گئی- مورخین یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں حضرت شیخ جمال الدینؒ صاحب وفات پا گئے تھے- بہر حال یہی زمانہ ہے کہ حضرت خواجہ صابر رحمتہ اللہ علیہ اسی زمانہ میں اجودھن سے کلیر تشریف لائے ہیں- اس وقت تک حضرت مخدوم کبیر الاولیاء تو کیا ان کے شیخ حضرت شیخ شمس الدین ترکؒ بھی حضرت صابر رحمتہ اللہ علیہ کے حلقہ ارادت میں داخل نہیں ہوئے تھے جیسا کہ پہلے تفصیل سے گذر چکا ہے- یا اگر داخل ہوئے تھے تو ارادت و عقیدت کا ابتدائی دور تھا- حضرت مخدوم صاحب اس سے بہت بعد تقریباً ۶۹۰ھ میں یعنی تقریباً پچیس سال بعد حضرت ترکؒ سے بیعت ہوئے ہیں پھر مراحل سلوک طے کیے ہیں- پس ۶۶۵ھ میں ان کی یہ حیثیت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ حضرت شیخ جمال الدینؒ کے لیے دعا کرتے اور اس دعا سے ان کا سلسلہ فیض جاری ہو جاتا- ان دونوں سوالوں کے جواب ان

سطروں میں درج کیے جا رہے ہیں- اور جواب سے پہلے حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ کا اتنا تعارف کرانا ضروری ہے- کہ یہ حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کے نہایت ہی برگزیدہ اور بلند پایہ خلفاء میں سے تھے- ذاتی تعلق کا یہ عالم تھا کہ ایک عرصہ تک اپنے اسی چہیتے مرید کی خاطر بابا صاحب ہانسی میں مقیم رہے تھے- پھر جب خلافت عطا کر دی- تو حضرت گنج شکر کو اپنے اس خلیفہ پر اتنا اعتماد تھا کہ جن صاحب کو سند خلافت (مثال قطبیت) عطا فرماتے تھے- ان کو پہلے ہدایت یہ فرماتے تھے کہ ہانسی پہونچ کر شیخ جمال الدینؒ سے بھی اس کی تصدیق کرالو اور ان سے مہر لگوالو-

حضرت شیخ جمال الدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو اپنے شیخ یعنی خواجہ گنج شکر کی طرف سے یہ اختیار بھی حاصل تھا کہ جس کو نااہل سمجھتے تھے- اس کی سند خلافت چاک کر دیا کرتے تھے- یہ چاک کر دینا گویا آخری فیصلہ ہوتا تھا- حضرت گنج شکر بھی اس کی خلافت مسترد کر دیتے تھے- آپ فرمایا کرتے تھے-

"پارہ کردہ جمال را فرید ہرگز نمی تواند دوخت"
(جمال کے چاک کردہ کو فرید نہیں سی سکتا)

حضرت شیخ جمال الدین احمد صاحب ہانسوی جس طرح بلند پایہ شیخ طریقت تھے- ایسے ہی بلند پایہ عالم بھی تھے- اخبار الاخیار میں ان کی ایک تصنیف کا نمونہ بھی بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے-

یہ حضرت جمال واقعی اسم بامسمی تھے- ایک مرتبہ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت شیخ المشائخ بابا گنج شکر کو لکھا کہ میرے ... مریدوں اور خلفاء کو لے لو- اور جمال الدین کو دیدو- تو حضرت بابا صاحب ... جواب دیا- کہ جمال الدین میرا جمال ہے- معاوضہ مال میں ہو سکتا ہے نہ ... میں- ادھر حضرت خواجہ صابر کلیری بھی حضرت بابا صاحب کے یہاں ... علاوہ محض اپنی روحانی بلند قابلیتوں کی بنا پر یہ درجہ رکھتے تھے کہ حضرت ... فرمایا کرتے تھے :- کہ

میرے سینہ کا علم نظام الدین (سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء بادیونی- دہلوی) کو ملا ہے اور میرے دل کا علم خواجہ علی احمد صابر کو-

کبھی یہ فرماتے تھے- کہ :

میرے ظاہری اور باطنی علوم نظام الدین میں سرایت کر گئے ہیں- اور میرے اکابر مشائخ کے ظاہری اور باطنی علوم کا اثر علی احمد صابر میں نمایاں ہوا ہے-

بہر حال یہ تینوں خلفاء ایسے بلند پایہ ہیں کہ آسمان طریقت کو بھی ان کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے-

اب وہ قصہ سنیئے جس کو ہم اپنی فہم اور قابلیت سے بالاتر قرار دیتے ہیں-

قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت بابا گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت خواجہ صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ کو پہلے دہلی کے لیے مامور فرمایا تھا- کہ وہاں پہونچ کر اپنا سلسلہ فیض جاری کریں- مگر جب آپ نے سند خلافت عطا فرما کر دہلی کے لیے روانہ فرمایا تو حسب معمول یہ ہدایت آپ کو بھی کر دی کہ پہلے شیخ جمال الدین صاحب ہانسوی کے پاس پہونچ کر اس سند پر ان کی تصدیق کرالو- حضرت صابر اپنے شیخ کی ہدایت کے موجب ہانسی پہونچے- اور جب وہ حضرت شیخ جمال الدین صاحب کے یہاں پہونچے تو مغرب کا وقت ہو گیا تھا-

آپ حضرت ہانسوی کے یہاں شب گذارنا نہیں چاہتے تھے- بلکہ چاہتے تھے کہ جلد تصدیق اور مہر وغیرہ سے فراغت ہو جائے تو اگلی منزل کے لیے روانہ ہو جائیں- بہر حال مغرب کی نماز پڑھی گئی- اس کے بعد حضرت خواجہ صابر نے مثال قطبیت (سند خلافت) تصدیق کے لیے پیش کی- تو حضرت شیخ جمال نے فرمایا کہ اندھیرا ہو گیا ہے چراغ آنے دو تب تصدیق لکھوں گا- اگرچہ حضرت خواجہ صابرؒ جلدی میں تھے- تاہم تھوڑی دیر چراغ کا انتظار کیا- پھر چراغ آیا تو اتفاق سے ہوا تیز چل رہی تھی، چراغ بجھ گیا- حضرت خواجہ صابر کلیریؒ کو ایک ایک لمحہ مشکل ہو رہا

تھا- چراغ گل ہو گیا تو چونکہ اس زمانہ میں دیا سلائی نہیں ہوتی تھی- چقماق جیسی چیزوں سے چراغ جاتے تھے- جس میں کچھ دیر لگتی تھی- حضرت صابر کو یہ دیر برداشت نہیں تھی- آپ نے فوراً چراغ پر پھونک ماری- چراغ آپ کی پھونک سے روشن ہو گیا-

حضرت شیخ جمال الدینؒ کو یہ عجلت پسند نہیں آئی- آپ نے سند خلافت چاک کردی اور فرمایا:-

"دہلی بیچارہ تاب دم آتشیں شماندارد- اگر خواہید رفت بیک دم خواہید سوخت-"

(بیچاری دہلی آپ کے دم آتشیں کو برداشت نہیں کر سکے گی- اگر آپ وہاں پہونچ جائیں گے تو ایک سانس مین دہلی کو بھسم کر دیں گے-)

حضرت شیخ جمال ہانسوی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ خیال سوانح نگاروں کی روایت کے بموجب صحیح تھا- کیونکہ دہلی کے جائے جب آپ کلیر پہونچے- تو راوی بیان کرتے ہیں- کہ شہر کلیر کو برباد کر دیا تھا- جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے- کہ جامع مسجد میں جب حضرت صابر پہونچے تو لوگوں نے جگہ نہیں دی- اور ایک غریب مسافر سمجھ کر پہلی صفوں سے پیچھے ہٹا دیا- یہاں تک کہ آپ مسجد سے باہر نکل کر نماز پڑھ سکے- اس پر حضرت صابر کو طیش آیا- جس کا نتیجہ یہ ہوا- کہ یہ مسجد منہدم ہو گئی- جتنے لوگ چھت کے نیچے تھے وہ وہیں ختم ہو گئے- پھر پیران کلیر اتنا ویران ہوا کہ لوگ وہاں جاتے ہوئے ڈرتے تھے- حتیٰ کہ آپ کے خلفاء بھی وہاں نہیں گئے- ایک دراز عرصہ کے بعد (جو ایک صدی کے قریب ہوتا ہے)- سب سے پہلے حضرت احمد عبدالحق ردولوی خلیفہ حضرت مخدوم کبیر الاولیاء پیران کلیر تشریف لے گئے- پھر ان کے خلیفہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے اس خانقاہ کو آباد کیا- (واللہ اعلم)

بہر حال حضرت شیخ جمال الدین احمد ہانسوی نے حضرت خواجہ صابرؒ کی

چاک کر دی تو آپ کو بہت غصہ آیا اور آپ نے فرمایا:-

"تو مثال مرا پارہ کردہ من سلسلہ ترا پارہ کردم-"

(تم نے میری سند چاک کر دی تو میں تمہارا سلسلہ چاک کرتا ہوں-)

حضرت جمال نے فرمایا:- از اول یا آخر- (شروع کا حصہ یا آخر کا) تو فرمایا شروع کا حصہ-

اس تلخ گفتگو کے بعد حضرت صابر فوراً اٹھے- دہلی کے جائے حضرت شیخ کی خدمت میں "اجودھن" پہونچے اور تمام واقعہ بلا کم و کاست بیان کر دیا- اور جب حضرت خواجہ کلیری نے بیان فرمایا- کہ جب میری سند چاک کر دی تو میں نے کہا- میں نے تمہارا سلسلہ چاک کر دیا- تو حضرت گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا- دین کے پہلوانوں کا تیر خطا نہیں کرتا- غنیمت ہوا تم نے جمال الدین کے سلسلۂ فیض کا ابتدائی حصہ ہی چاک کیا ہے- آخری حصہ تو سالم رہا- تمہارا کوئی مرید دعا کرے گا تو جمال الدین کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر جڑ جائے گا- اور چشمہ فیض جاری ہو جائے گا-

اس واقعہ کے بعد حضرت گنج شکر نے اس چاک کردہ کو تو نہیں جوڑا یعنی آپ کو دوبارہ دہلی تو نہیں بھیجا- البتہ آپ کے لیے "کلیر" کی قطبیت تجویز فرما دی کہ کلیر کو مرکز بنا کر خدمت ارشاد و طریقت انجام دیں-

بہر حال سند چاک کرنے اور حضرت صابر کی بد دعا کا قصہ تو یہ ہے- اب رہا دوسرا سوال کہ جب حضرت شیخ جمال الدین کی وفات ۶۶۵ھ میں ہو گئی تھی تو حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء) نے دعا کب کی اور کس طرح کی-

اس کا جواب سیر الاقطاب کی ایک روایت سے ملتا ہے- صاحب سیر الاقطاب- دعا کے واقعہ کو حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے زمانۂ شباب کا واقعہ بیان کرتے ہیں- مصنف سیر الاقطاب فرماتے ہیں:- کہ

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضرت مخدوم خواجہ محمد (جو ابھی تک جلال الدین

کبیر الاولیاء نہیں ہوئے تھے) چند ساتھیوں کے ساتھ ہانسی تشریف لے گئے۔
حضرت شیخ جمال الدین کو نورِ باطنی سے معلوم ہوگیا۔ کہ خواجہ محمد آرہے ہیں۔ جن کی دعا سے میرا سلسلہ فیض دوبارہ جاری ہوگا۔ تو وہ آپ کی آمد کے یہاں تک منتظر ہوئے کہ ہانسی سے باہر تشریف لے جاکر تحقیق فرمایا کرتے تھے۔

ایک روز آپ کو معلوم ہوا کہ کچھ فقراء پانی پت کی طرف سے آئے ہیں۔ تو آپ نے اپنے آدمیوں کو بھیجا کہ ان کو یہاں لے آؤ۔ آپ کے آدمی پہونچے اور ان کو لے آئے۔ حضرت شیخ جمال الدینؒ نے ان کی بہت مدارات کی۔ مگر ان میں وہ شخص نظر نہیں آیا۔ جس کی کچھ خاص علامتیں آپ کو کشف میں دکھائی گئی تھیں۔ تو آپ نے ان مہمانوں سے دریافت فرمایا۔ کہ کیا آپ کا کوئی اور ساتھی بھی ہے۔ مہمانوں نے کہا کہ ہم فقراء تو سب آگئے ہیں۔ البتہ

"یک جوان خورد سال کہ بمحافظت اسباب و اشیاء ماست
صاحب دیانت و صالح پیش او چیز خود ہا گذاشتہ آمدہ ایم۔"
(ایک کم عمر نوجوان رہ گیا ہے۔ وہ صاحب دیانت 'امانت دار اور نیک لڑکا ہے۔ اس کو اپنے سامان کی حفاظت کے لیے چھوڑ آئے ہیں۔)
شیخ فرمود "واللہ من بہماں طفل کار دارم۔"
(شیخ نے فرمایا: واللہ مجھے اسی "طفل" سے کام ہے۔)

بہر حال حضرت شیخ جمال الدینؒ نے کھانا منگایا۔ ان فقراء کے سامنے کھانا رکھا اور فرمایا کہ ایک صاحب قیام گاہ پر تشریف لے جائیں وہ اس جوان کو لے آئیں۔ اور ان کے ساتھ کھانا کھالیں۔ چنانچہ یہ جوان تشریف لائے۔ تو وہی حلیہ اور وہی شناختیں موجود تھیں۔ جو حضرت شیخ پر منکشف ہوئی تھیں۔ حضرت شیخ جمال الدین نے ان کا بہت احترام سے استقبال کیا۔ کھانا کھلایا اور جب فرائض مدارات سے فارغ ہوگئے۔ تو حضرت صابر کلیریؒ کی سند چاک کرنے اور ان کی بد دعا وغیرہ کا قصہ بیان کیا۔ اور اس جوان سے کہا کہ آپ دعا کریں۔ حضرت خواجہ

محمد (جوانِ صالح) نے دعا کی۔

مصنف سیر الاقطاب فرماتے ہیں کہ اس کا اثر یہ ہوا۔ کہ حضرت شیخ جمال کا چھوٹا بچہ نور الدین جس کی عمر حضرت شیخ کی وفات کے وقت صرف چھ ماہ تھی۔ اس کو حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیاء کی خدمت میں لے گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ آپ نے ان کو خلعت خلافت عطاء فرمائی۔ اور پھر ان سے حضرت شیخ جمال کے فیض کا سلسلہ جاری ہوا۔

مولانا غلام سرور صاحب مصنف خزینۃ الاصفیاء فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ صابر کلیری کی بد دعا کا یہ اثر ہوا کہ حضرت شیخ جمال الدین صاحب کے بڑے صاحبزادے "کہ مردے دانش مند عظیم بود۔ دیوانہ شد۔" (جو ایک بہت بڑے عالم فاضل تھے۔ دیوانہ ہوگئے۔ (یا جیسا کہ دوسرے مصنفین فرماتے ہیں مجذوب ہوگئے)

چھوٹے صاحبزادے اپنے والد صاحب سے فیض نہیں پاسکے۔ البتہ حضرت سلطان الاولیاء شیخ نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی شفقت سے وہ فیضیاب اور کامیاب ہوئے اور ان سے فیض جاری ہوا۔ (چھوٹے صاحبزادے کا نام غلام سرور صاحب نے برہان الدین تحریر کیا ہے۔ ممکن ہے ان کا نام بچپن میں نور الدین ہو۔)

شیخ اللہ دیا صاحب مصنف سیر الاقطاب تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت خواجہ محمد (مخدوم صاحب کبیر الاولیاء) کا دستور اس سفر میں یہ تھا کہ تمام ساتھیوں کا اسباب خود اٹھا کر سب سے آگے آگے چلا کرتے تھے۔ جب ان ساتھیوں نے دیکھا کہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ نے اس نوجوان کی اتنی تعظیم کی ہے تو اب ان کی آنکھیں کھلیں۔ انہوں نے اس بے تکلفی کی معافی چاہی۔ حضرت خواجہ محمد نے فرمایا۔ معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے شوق سے یہ خدمت کرتا تھا۔ اور اب بھی اسی طرح کرتا رہوں گا۔

پھر شیخ اللہ دیا صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ ساتھی قلندر تھے۔ اور حضرت

خواجہ محمد کی طبیعت میں ابتداء سے جو ایک محبت اور عشق خداوندی کا رنگ تھا-اس نے آپ کو ان قلندروں کے ساتھ کر دیا تھا-

حضرت شیخ جمال الدین نے جب یہ دیکھا کہ یہ جوان صالح جس کے مراتب اللہ تعالیٰ کے یہاں اتنے بلند ہونے والے ہیں-ان قلندروں کے جال میں پھنس رہا ہے تو آپ کو تکلیف ہوئی- آپ کو الگ بلا کر سمجھایا- یہ حضرت خواجہ محمدؒ کی سعادت تھی کہ ان کی سمجھ میں بات آگئی- مگر وہ پانی پت واپس ہونے کے لیے آمادہ نہیں تھے-اور جب یہ قلندر ہانسی سے روانہ ہوئے تو انہیں کے ساتھ ہو لیے تب حضرت شیخ جمال الدینؒ نے اپنے خاص آدمیوں کو بھیجا-وہ بمشکل تمام حضرت خواجہ محمد کو قلندروں کے پنجہ سے نجات دلا کر لائے-اور پانی پت واپس کیا-

بہر حال سند چاک کرنے کا واقعہ تو بڑوں کا واقعہ ہے-ان رموز کو بڑے ہی سمجھ سکتے ہیں-البتہ سیر الاقطاب کی اس روایت سے چند باتیں ایسی معلوم ہو گئیں-جو حضرت مخدوم صاحب کی سوانح میں خاص اہمیت رکھتی ہیں-یعنی-

(۱) حضرت خواجہ محمد (جلال الدین کبیر الاولیاء) رحمتہ اللہ علیہ آغاز شباب میں قلندروں کے ساتھ ہو لیے تھے-

(۲) جذبہ خدمت یہ تھا کہ ان کا سامان اٹھا کر آگے آگے چلتے تھے-

(۳) حضرت مخدوم جلال الدین صاحب کی عمر ۷۰ اسال نہیں ہوئی-

یعنی آپ کا سنہ پیدائش ۵۹۵ھ نہیں ہے-بلکہ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے-تقریباً ۶۳۵ھ یا ۶۴۰ھ ہے- کیونکہ حضرت شیخ جمال الدین ہانسویؒ (متوفی ۶۶۵ھ) سے یہ ملاقات حضرت خواجہ صابر کلیری کے اس واقعہ کے بعد ہوئی-اور حضرت خواجہ کلیری ۶۶۰ھ کے قریب کلیر تشریف لائے ہیں-پس ۶۶۵ھ اور ۶۶۰ھ کے بیچ میں کسی وقت یہ ملاقات ہوئی ہے-جب کہ روایت کے الفاظ کے بموجب اس ملاقات کے وقت حضرت مخدوم صاحب کا بچپن یا آغاز شباب تھا تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ کی ولادت تقریباً ۶۳۵ھ میں ہوئی ہو-کیونکہ اگر سال ولادت ۵۹۵ھ مانا جاتا ہے- تو یہ زمانہ بچپن کا نہیں ہوگا-بلکہ اس وقت

حضرت مخدوم صاحب کی عمر ساٹھ سال سے بھی زیادہ ہونی چاہیے-

نماز جمعہ

حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کا معمول تھا کہ آپ نماز جمعہ اس مسجد مین پڑھا کرتے تھے-جو حضرت سید محمود صاحب کے مزار مبارک کے قریب تھی-اس معمول کی وجہ "سیر الاقطاب" میں یہ بیان کی گئی ہے-کہ آنحضرت ﷺ نے یہی ہدایت فرمائی تھی-

اس کے متعلق سیر الاقطاب میں جو قصہ نقل کیا گیا ہے-وہ ملاحظہ فرمایئے-تحریر ہے:

"اگرچہ آنحضرت (مخدوم صاحب) بارہا حج ادا کر چکے تھے-
مگر پھر بھی آپ کا معمول یہ تھا کہ ہر جمعہ کو اپنی کرامت سے
آپ مکہ معظمہ پہونچتے اور نماز جمعہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ
حرم کعبہ شریف میں پڑھا کرتے تھے-"

یہاں لوگ حضرت مخدوم صاحب کو بہت تلاش کرتے تھے-مگر کہیں نہیں ملتے تھے-ایک عرصہ کے بعد حضرت مخدوم صاحب کے دل میں خیال آیا-

"چہ خوب باشد اگر رسالت پناہ برائے ماز جمعہ حکم فرمائید-
گاہے آنجا گاہے اینجا نماز ادا کردہ باشم-"

(کیا اچھا ہو اگر آنحضرت رسالت پناہ ﷺ جمعہ کی نماز کے
لیے مجھے حکم فرمادیں کہ کبھی یہاں نماز پڑھ لیا کروں- کبھی
وہاں-)

چنانچہ ایک مرتبہ جب جمعہ کے روز حضرت مخدوم صاحب کعبہ شریف میں نماز سے فارغ ہوئے-اور حضرت محبوب رب العالمین ﷺ سے رخصت ہونے لگے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا- "شیخ جلال الدین تمہارا کعبہ وہیں ہے جہاں میرے فرزند سید محمود کا روضہ ہے-نماز جمعہ وہیں ادا کیا کرو-" پس اس روز سے

حضرت مخدوم صاحب کا معمول یہ ہو گیا- کہ جمعہ کے روز پابرہنہ روضہ سید محمود
کی مسجد میں جاتے اور نماز جمعہ ادا کرتے- یہ روضہ شہر کے کنارے پر شہر کی مشرقی
جانب میں کسی قدر جنوب کی طرف ہٹا ہوا ہے-" (سیر الاقطاب)

ضروری تبصرہ

اس روایت کے الفاظ اور مفہوم پر نظر ڈالیے- آپ ایک تضاد محسوس کریں گے-
کعبہ شریف میں نماز جمعہ ادا کرنا- نہ فرض ہے نہ واجب- کہ اس کو مطالبہ
شرعی کہا جائے- اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے تو یہ صرف حضرت مخدوم صاحب
کے دل کی خواہش تھی- یعنی "طے ارض" کی کرامت ان کو حاصل تھی- جب ان
کا دل چاہتا تھا کہ حرم شریف میں نماز پڑھیں- تو وہاں پہونچ جاتے تھے- شریعت کا
کوئی حکم نہیں تھا کہ آپ ایسا کریں- جب حرم شریف میں پہونچنا نہ پہونچنا آپ کی
مرضی پر تھا تو پھر اس فقرہ کا کیا مطلب کہ "کبھی یہاں پڑھ لیا کروں کبھی وہاں-"

اس تضاد کے علاوہ بہت زیادہ قابل تنبیہ یہ ہے کہ اس قصہ میں
آنحضرت ﷺ کی طرف چند باتیں منسوب کی گئی ہیں-
مثلاً (۱) یہ کہ آنحضرت ﷺ نماز جمعہ پڑھا کرتے تھے-
(۲) آپ نماز جمعہ کعبہ شریف میں پڑھا کرتے تھے-
(۳) آنحضرت ﷺ نے فرمایا سید محمود ان کے فرزند ہیں-
(۴) مخدوم صاحب کا کعبہ وہی ہے- جہاں سید محمود کا مزار ہے- (وغیرہ)

اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ
آپ یہ فرما رہے تھے- تو وہ ایک خواب کی بات ہے- مگر یہاں خواب نہیں ہے
یہاں بیداری کی باتیں ہو رہی ہیں-

اس موقع پر تنبیہ یہ کرنی ہے کہ جب تک قابل وثوق سند نہ ہو
آنحضرت ﷺ کی طرف کوئی بات منسوب کرنا ایسا "گناہ کبیرہ" ہے جس سے
معاذ اللہ ایمان بھی خطرہ مین پڑ جاتا ہے- چنانچہ آنحضرت ﷺ کا مشہور ارشاد

ہے- جو نہایت صحیح سندوں سے ثابت ہے کہ جو شخص میری طرف غلط بات منسوب
کرے مناسب ہے کہ دوزخ اس کا ٹھکانا بنے- یہ حدیث نہایت صحیح السند ہے- یہ
روایت اس کے تحت میں آتی ہے- لہٰذا یہ روایت یہاں اس لیے نقل نہیں کی گئی-
کہ اس کو بیان کیا جائے- بلکہ منشا یہ ہے کہ ایسی روایتوں کے بیان کرنے سے
اجتناب کیا جائے-

آخری دور اور استغراق

اگر ہمارے اندازے کے موجب آں مخدوم کی ولادت ۶۳۵ھ مانی جائے-
تو آپ کی عمر ایک سو پینتیس (۱۳۵) سال ہوئی- اس عمر میں فطری طور پر بڑھاپے
کا ضعف بڑھ جاتا ہے- اور آپ کو ریاضتوں اور مجاہدات نے اور بھی زیادہ کمزور بنا
دیا تھا- بس آپ پر استغراقی کیفیت ہر وقت طاری رہتی تھی- انتہا یہ کہ نماز کے
وقت بھی آپ کو توجہ دلائی جاتی تھی- اور معمول یہ تھا کہ جب جماعت کا وقت آتا-
تو حق، حق، حق- کہا جاتا- اس پر حضرت مخدوم صاحب توجہ فرماتے اور نماز
پڑھنے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے- اس کے بعد آپ کے متوسلین کا یہی طریقہ
ہو گیا کہ نماز جب ختم ہو جاتی تھی- حق، حق، کہا کرتے تھے-

صاحبزادگان

حضرت مخدوم کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے پانچ صاحبزادے تھے- بقول
صاحب خزینۃ الاصفیاء پنج گنج ولایت- یعنی یہ پانچوں صاحبزادے ولایت کے پانچ
خزانے تھے-

(۱) خواجہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ- اپنی والدہ کے بائیں جانب
حضرت سید محمود کے روضے میں مدفون ہیں- مصنف سیر الاقطاب انہیں کی اولاد
میں سے ہیں-

(۲) خواجہ ابراہیم: اپنے والد کے روضۂ مبارک میں ان کے بائیں جانب
مدفون ہیں-

(۳) خواجہ شبلی : اپنے والد کے دائیں جانب محو استراحت ہیں- خواجہ شبلی اپنے والد کے عظیم المرتبت خلفاء میں تھے-

آپ کے متعلق خزینۃ الاصفیاء کے الفاظ یہ ہیں :

"عالم بعلوم شریعت و حقیقت بود- در فقہ شانے عظیم درتبہ عالی داشت- در تجرید و تفرید یگانہ زمانے داز اہل دنیا احتراز کلی مے نمود-"

حضرت شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان کی جگہ چند روز ان کے منجھلے صاحبزادے خواجہ ابراہیم نے سجادۂ مشیخت کو زینت بخشی- لیکن وہ اپنے چھوٹے بھائی خواجہ شبلیؒ کے حق میں سجادگی سے دست بردار ہو گئے- خواجہ شبلی ہمیشہ ذکر الٰہی میں مشغول رہتے- وقار' استقامت اور توکل کو اپنا طرہ امتیاز بنائے ہوئے تھے- امراء اور دولت مندوں کے دروازوں پر مطلق نہ جاتے تھے- علماء اور فضلاء ان کی صحبت میں رہ کر اکتساب فیض کرتے تھے- خلفاء اور مریدوں کی تعداد بہت کافی تھی- بقول سیر الاقطاب - "مرید و خلفاء بیشمار داشت" بہت سی کرامتیں آپ کی طرف منسوب ہیں- وجد و سماع کا شوق تھا- کہتے ہیں آپ نے اپنے کچھ افغان مریدوں کے لیے دعا فرمائی تھی- کہ ان کے تیر کبھی خطا نہیں کریں گے- چنانچہ کوئی تیر خالی نہیں جاتا تھا- ایک روز ان میں سے کسی کو خیال آیا کہ آسمان کی طرف تیر چلائیں- اور دیکھیں کوئی چیز نشانہ بنتی ہے یا نہیں- چنانچہ تیر پھینکا- ان پٹھانوں کو تعجب ہوا کہ تیر زمین پر واپس آ کر پڑا تو ایک سانپ کا سر تیر میں بندھا ہوا تھا- "تیر از سر مارے گذر کردہ" آپ کے سات فرزند تھے- تاریخ وفات ۷ / ربیع الاول ۸۵۲ھ ہے-

(۴) حضرت خواجہ کریم الدین صاحب روضہ سید محمود میں مدفون ہیں- جہاں ان کی والدہ اور بڑے بھائی آرام فرما رہے ہیں-

(۵) حضرت خواجہ عبدالواحد- اپنے والد ماجد کے روضہ مطہرہ سے باہر دروازے کے متصل مدفون ہیں- ان صاحبزادوں میں سے خواجہ کریم الدین اور

خواجہ عبدالواحد لاولد رہے-

خلفاء

آپ کے خلفاء کی تعداد چالیس بیان کی گئی ہے- مذکورہ بالا پانچ صاحبزادوں کے علاوہ باقی چند اسماء گرامی یہ ہیں-

(۶) شیخ زینا- جن کا ذکر فتح خاں کے واقعہ میں پہلے گذر چکا ہے- یہ باغبانی کرتے تھے اور ان کا خاندان حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے مورث اعلیٰ کے ساتھ "گاذردن" سے ہندوستان آیا تھا-(۱) یہ گاذردنی شیخ قصبہ "اندری" میں آرام فرما رہے ہیں-

(۷) حضرت شیخ احمد قلندر : قلعہ ملتان کے عقب میں مدفون ہیں-

(۸) حجتہ الاولیاء حضرت شیخ احمد عبدالحق رحمتہ اللہ علیہ جن سے سلسلہ ارشاد صرف آراستہ ہی نہیں ہوا بلکہ اس نے "شجرہ طوبیٰ" کی نوعیت اختیار کر لی کہ عالم ارشاد کا کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں ہے- جہاں اس کا سایہ نہ پہونچا ہو- مزار مبارک "ردولی (ضلع بارہ بنکی) میں ہے-

(۹) حضرت شیخ بہرام- مدفن قصبہ بڈولی-

(۱۰) حضرت شیخ شہاب الدین جھنجانوی- مزار مبارک جھنجانہ ضلع مظفر نگر-

(۱۱) حضرت سید موسیٰ بہار- صوبہ بہار میں کسی مقام پر مدفون ہیں-

(۱۲) قاضی محمد اولیاء سلطان پوری : سلطان پور ضلع کرنال میں مدفون ہیں-

(۱۳) شیخ شعیب نبیرہ قاضی محمد اولیاء (مذکور) مزار سونی پت میں ہے-

(۱۴) شیخ حسن : مدفن موضع پتھرہ- پرگنہ بیانہ-

(۱۵) شیخ احمد عبدالصمد سنامی- یہ سنام میں محو استراحت ہیں- آپ نے

۱- سیر الاقطاب میں یہ ہے کہ "او (شیخ زینا) ہمراہ جد کلاں حضرت مخدوم از گاذرون آمدہ بود (یہ حضرتؒ مخدوم کے پڑدادا (مورث اعلیٰ) کے ساتھ گاذرون سے آئے تھے) اور اگر یہ صحیح ہے تو شیخ زینا کی عمر کئی سو برس ہوئی ہوگی- (واللہ اعلم)

حضرت کبیر الاولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے ملفوظات مرتب فرمائے تھے-

(۱۶) حضرت سید محمود : حضرت قلندر صاحب کے روضہ مبارک کے متصل مشرق کی جانب مدفون ہیں-

(۱۷) حضرت شیخ نظام سنام : مزار مبارک سنام (پنجاب)

(۱۸) حضرت شیخ پیر بوی- آپ کا مزار مبارک بھی سنام میں ہے-

(۱۹) حضرت میر سید سراج الدین : حضرت قلندر صاحب کے روضہ منورہ کے قدیم دروازے کے متصل جانب شمال آسودۂ خواب ہیں-

(۲۰) حضرت شیخ پیر کینبا (بفتح کاف وسکون یا دنون مدغم و فتح باسکون الف) شہر سے متصل محل رانی کے قریب مدفون ہیں-

(طابع ص ۱۲۴ شیخ عبداللہ صاحب گنگوہی حاشیہ)

آپ پانی پت کے اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں- حضرت شیخ عبدالکبیر بالا پیر" حضرت مخدوم کبیر الاولیاء دو واسطوں سے آپ کے جد امجد ہیں- سلسلہ نسب یہ ہے- شیخ عبدالکبیر پسر شیخ عبدالقدوس پانی پتی - پسر حضرت خواجہ شبلی- خلف حضرت مخدوم کبیر الاولیاءؒ-

حضرت شیخ اللہ دیا صاحب مصنف سیر الاقطاب فرماتے ہیں :

"آپ ولی مادر زاد تھے- جو کچھ آپ کی زبان پر آتا- فوراً ظہور میں آجاتا تھا- اسی وجہ سے ان کو "شیخ کبیر بالا پیر" کہا کرتے تھے-" اور مصنف خزینۃ الاصفیاء کی شہادت یہ ہے :-

"سخاوت، شجاعت، خوارق و کرامت، وجد و ذوق اور سماع و شوق جیسے اوصاف بزرگانہ میں آپ یکتا تھے- "بوقت خود ثانی نداشت-"

آپ کی یہ کرامت عام طور سے مشہور ہے کہ ایک روز سلطان سکندر ا[illegible] بہلول اپنے دو وزیروں کو لے کر پانی پت پہونچا- اور آپ کے کمالات کشف آزما[illegible] چاہے- طے کیا کہ ہم کھانے کی کسی ایک ایک چیز کی نیت کر لیں- پھر دیکھیں کہ [illegible]

بالا پیر کو ہماری نیتوں کا پتہ چلتا ہے یا نہیں-

یہ تینوں صاحبان حاضر خدمت ہوئے- اور مراسم ملاقات سے فراغت پائی- تو شیخ کے مہمان خانہ سے سلطان سکندر کی خدمت میں گرم گرم گوشت کے سموسے پیش ہوئے- نان اور یخنی ایک وزیر "میاں بدھا" کے سامنے پیش ہوا- اور دوسرے وزیر ملک محمد کے سامنے حلوا پیش کیا گیا- یہ تینوں حضرات حیرت میں پڑ گئے- کیونکہ یہی کھانے تھے- جن کی نیت کی تھی- اب یہ صاحبان حضرت شیخ کی خدمت میں معذرت کرنے لگے کہ بزرگوں کو آزمانا- خود ایک گستاخانہ حرکت ہے- جس کے ہم مرتکب ہوئے- معاف فرمائیں-

حضرت شیخ نے نہایت خندہ پیشانی سے فرمایا :-

"بابا جائے حیرت چیست - خدا تعالیٰ محبان خود را پیش اہل دنیا شرمسار نمی کند-" (خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۴۱۸)

(بابا- حیرت کی بات کیا ہے- اللہ تعالیٰ دنیاداروں کے سامنے اپنے دوستوں کو شرمندہ نہیں کرتا-)

۹۴۷ ہجری میں آپ نے وفات پائی اور گنبد کلاں میں دفن ہوئے-

سیر الاقطاب میں یہ بھی ہے کہ اس کرامت سے متاثر ہو کر بادشاہ نے تو مضافات کرنال کے دو گاؤں موضع درر و سنگھواہ پیش کیے- وزیر میاں بدھا نے قصبہ جھنجانہ کے قریب موضع تاتی- حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا- اور ملک محمد وزیر نے اپنی دختر نیک اختر خدمت کے لیے پیش کر دی-

شیخ عثمان زندہ پیر

حضرت شیخ عبدالکبیر کے فرزند ارجمند - خلیفہ ارشد اور ان کے جانشین و سجادہ نشین تھے- صاحب کشف و کرامات- اور قبول خزینۃ الاصفیاء- علوم ظاہری و باطنی میں کامل و اکمل- ۹۹۰ ہجری میں وفات ہوئی- گنبد کلاں میں مدفون ہیں-

روحانی کمالات کے ساتھ آپ کو معاملہ فہمی اور فراخی حوصلہ کے جوہر بھی

عطا ہوئے تھے- آپ کے صاحبزادہ شیخ نظام الدین صاحب نے ایک [illegible]
کرایا- اور والد صاحب سے افتتاح کی درخواست کی- آپ نے فرمایا :- [illegible]
دوں گا- مگر شرط یہ ہے کہ تین من گیہوں کی روٹی پکواؤ- گائے ذبح کراؤ [illegible]
گوشت کے مناسب اور بھی سامان فراہم کرو- اور یہ سب فقراء کو کھلا[illegible] - اس [illegible]
بعد میں افتتاح کردوں گا- صاحبزادہ صاحب کو یہ حوصلہ میسر نہیں آیا تھا [illegible]
کرنے لگے- میرے پاس تو ایک بکری ہے- فرمایا- ہرگز نہیں، جو کہہ [illegible]
گویا تیر بہدف ہے- ایسا نہیں کروگے تو نقصان کا خطرہ ہے- صاحبزادے [illegible]
اس خرچ کے لیے تیار نہیں ہوئے-

کوئیں کی پوری عمارت رات ہی میں بیٹھ گئی-

معاملہ فہمی کے سلسلہ میں دو جاٹوں کا قصہ ایک اچھی مثال ہے-

ان دونوں جاٹوں کا خاندان ایک ہی تھا مگر مذہب جدا جدا تھا- ایک [illegible]
اور ایک مسلمان- ان دونوں کے آپس میں کوئی جھگڑا تھا- عرصہ ہو گیا تھا [illegible]
نہیں ہوا تھا- آخر کار ان دونوں نے اپنے یہ مقدمہ حضرت شیخ [illegible] کی [illegible]
میں پیش کردیا- شیخ عثمان نے واقعات کی تفصیلات معلوم کیں- اور پھر [illegible]
کردیا- وہ فیصلہ اتفاق سے ہندو کے خلاف تھا-

اس نے برملا کہدیا کہ آپ نے مسلمان ہونے کی رعایت کی ہے- [illegible]
تھا- اور فیصلہ میرے حق میں ہونا چاہیے تھا-

یہ اعتراض حضرت شیخ کے لیے بہت تکلیف دہ تھا- مگر صورت حال [illegible]
کہ بات چیت سے مطمئن کرنا بھی مشکل تھا- اب آپ نے ایک ایسی [illegible]
کی جو خود ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق تھی- آپ نے فرمایا- تم [illegible]
یہاں بچے ہونے والے ہیں- اب فیصلہ یہ ہے کہ سچے کے لڑکا ہوگا- اور جھوٹے [illegible]
لڑکی--- اب خدا کا کرنا کہ --- مسلمان کے لڑکا پیدا ہوا- اور ہندو کے لڑکی
یہ ایک تائید غیبی تھی- حق و صداقت اور انصاف پسندی کی- مگر اس کا [illegible]
کہ فریقین مطمئن ہوگئے- جھگڑا ختم ہوگیا-

شیخ نظام الدین

حضرت زندہ پیر اور حضرت بالا پیر کے تذکرے آپ پڑھ چکے ہیں- یہ شیخ نظام الدین قدس اللہ سرہ العزیز حضرت شیخ عثمان زندہ پیر کے فرزند ارجمند و خلیفہ اور حضرت شیخ عبدالکبیر بالا پیر کے پوتے تھے- اس خاندانی شرف کے ساتھ ذاتی سعادت و شرافت سے بھی بھرپور حصہ ملا تھا-

بقول مولانا غلام سرور- عظمائے مشائخ (اکابر اولیاء اللہ) میں سے تھے-

"باوصاف زہد و قناعت موصوف- و بریاضت و عبادت
معروف بذکر مولیٰ مستغرق- از خلق جہاں مستغنی-"

شیخ نظام الدین صاحب کے برادر بزرگ کا نام نامی "کمال الدین" تھا- آپ کا اسم بامسمّیٰ تھے- یعنی :-

"بسیار اہل کمال- صاحب جلال و جمال بود و جذبہ عشق الٰہی از
حد داشت-" (خزینہ ج ۱ ص ۴۵۵)

والد صاحب (حضرت زندہ پیر) کی وفات کے بعد حضرت شیخ کمال الدین ہی کو لوگوں نے خلیفہ و جانشین اور صاحب سجادہ بنانا چاہا- مگر آپ نے سختی سے منع کر دیا اور اپنے چھوٹے بھائی شیخ نظام الدین کے سر پر خود اپنے ہاتھ سے دستار باندھ کر گدی پر بٹھادیا-

شیخ نظام الدین صاحب نے والد ماجد کی جانشینی اور برادر بزرگ کی اس قدر افزائی کی بہت قدر کی- اور قدرت نے قدر کرنے کا موقع بھی خوب دیا- یعنی تقریباً ۵۰ سال تک چشمہ ارشاد و ہدایت جاری رکھا-

۸۷۱ ہجری سال ولادت ہے عمر ایک سو سینتالیس (۱۴۷) سال سنہ وفات ایک ہزار اٹھارہ (۱۰۱۸ھ)

شاہ اعلیٰ چشتی پانی پتی

حضرت نظام الدین کے فرزند ارجمند ہیں- ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد

باطنی کمالات کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے والد ماجد سے خرقہ خلافت حاصل
قصبہ نارنول - جو اسی علاقہ میں پانی پت سے تیس پینتیس میل
ہے - وہاں کے مشہور بزرگ شیخ نظام کا بھی یہی زمانہ ہے - یہ بھی
جلیل القدر اور صاحب کمال شیخ طریقت اور صاحب سلسلہ ولی اللہ ہیں -

حضرت شیخ نظام الدین پانی پتی کے یہ لختِ جگر کچھ ایسے پیاسے تھے
والد ماجد کے چشمہء فیض اور خرقہ خلافت سے پیاس نہیں بجھی - آپ
نظام نارنول کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے - اور اسی طرح ان کے دریا بھی
بھی شادابی حاصل کرنے لگے -

حضرت نارنولی کو بھی ایسے جوہر نایاب کی تلاش تھی - آپ نے
سے ان کو نوازا - اور یہاں تک نوازا کہ آپ کا نام نامی خود حضرت نارنولی کی
کی شہادت بن گیا -

اصلی نام

اس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ کا اصلی نام "عبدالسلام" تھا - حضرت
قدردانی اور حوصلہ افزائی نے آپ کو "اعلیٰ" کا خطاب دیا - نہ صرف اعلیٰ
یہ حضرت شیخ کی شفقتوں اور نوازشوں کی برکت ہے کہ خطاب اتنا
کہ لوگ اصلی نام بھول گئے -

والد ماجد بھی نظام - اور شیخ طریقت بھی نظام - ان دونوں نظاموں کی
سے کسی نے کہا ہے ؎

نظامش پیر و ہم پدرش نظام ست
نظام در جہاں بردے تمام ست

سالِ ولادت - بچپن اور ابتدائی دور

سال ولادت آٹھ سو نوے ہجری ہے (۱۴۸۵ء) اس زمانہ میں
حکومت تھی - جس کا آخری تاجدار ابراہیم تھا - جس کو بابر نے ۹۳۲ھ

میں پانی پت کے میدان میں شکست دے کر پٹھانوں کی حکومت کا خاتمہ کیا -
اس حرماں نصیب بادشاہ کی قبر پانی پت میں ایک چبوترہ پر آج تک ہے -

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب جو اب تک شیخ عبدالسلام عثمانی تھے - جس طرح
قدرت نے آپ کی فطرت کو شرافت اور مکارم اخلاق کے جوہر بخشے تھے - حوصلہ
مندانہ شجاعت کا بھی بھرپور خزانہ آپ کو عطا ہوا تھا - صاحب سیر الاقطاب نے چند
کرامتیں بھی ذکر کی ہیں - جن کے نتیجہ میں آپ کو تیر اندازی کا یہ کمال حاصل ہوا
تھا - کہ آپ کا کوئی نشانہ خطا نہیں کرتا تھا -

بہر حال آپ کے سپاہیانہ ذوق نے اقبال مند بابر کا استقبال اس طرح کیا کہ
آپ اس کی فوج میں بھرتی ہو گئے - "قزاخاں" جو بابر کا فوجی افسر تھا - وہ آپ کا
کمانڈر تھا - بہت جلد آپ کے فوجی کمالات ظاہر ہونے لگے - خصوصاً قدر اندازی
اور نشانہ بازی نے یہاں تک شہرت حاصل کی کہ آپ بابر کی پوری فوج میں تیر
اندازی میں یکتا - اور بے نظیر سمجھے جانے لگے -

فوجی ملازمت کیوں اختیار کی؟

شیخ اللہ دیا صاحب مصنف سیر الاقطاب نے خود حضرت شاہ اعلیٰ صاحب کا
بیان نقل کیا ہے - جس سے فوجی ملازمت ' زمانہ ملازمت اور علیحدگی وغیرہ کے
اسباب پر روشنی پڑتی ہے -

شیخ اللہ دیا صاحب فرماتے ہیں -:

> ایک مجلس میں حضرت پیر روشن ضمیر (شاہ اعلیٰ صاحب) نے
> زبان معجز نشان سے فرمایا - حضرت والد صاحب (شیخ نظام
> الدینؒ) پوری شفقت و توجہ سے میری ظاہری اور باطنی تربیت
> میں مصروف تھے - ناگاہ مجھے زیارت کعبہ معظمہ کا شوق دامن
> گیر ہوا - والد صاحب سے اجازت حاصل کی - اور سفر شروع
> کر دیا - جب دریا کے قریب پہونچا (غالباً سورت یا کھمبات مراد

ہوگا-اس زمانہ میں یہی بندرگاہ تھے) تو معلوم ہوا کہ جہاز نہیں جارہے- کیونکہ پرتگالی اور فرنگی قزاقوں نے جو اس زمانہ میں سمندر میں قزاقی کیا کرتے تھے- راستہ کو مخدوش کر رکھا ہے- مجبوراً میں وہاں سے واپس ہو کر "مالوہ" پہونچا- جہاں "قزا خاں" بابر کی طرف سے مامور تھا- میں نے اس کی ملازمت اختیار کرلی-

قزا خاں کو مجھ پر اتنا اعتماد ہو گیا کہ جو بھی نازک صورت حال پیش آتی' اکثر ایسا ہی ہوتا تھا کہ اس میں میرے مشورے کے بغیر کوئی اقدام نہیں کیا کرتا تھا-

ایک عرصہ دراز تک میں وہاں رہا- جب شیر شاہ سوری نے انقلاب برپا کر دیا- اور مالوہ بھی اس کے تصرف میں آگیا- اس وقت میرے اصطبل میں نوے (۹۰) گھوڑے تھے سب تاراج ہو گئے تو مجبوراً میں بھی وہاں سے روانہ ہوا- اور وطن کا رخ کیا- "مدسور" راستہ میں پڑتا تھا- وہاں شیخ المشائخ حضرت حمزہ کا دریا فیض جاری تھا- کچھ عرصہ وہاں قیام کیا- اور ان کے چشمہ فیض سے مستفیض ہوا-

اسلحہ کا بے پناہ شوق اور تائید غیبی کی عجیب و غریب مثال

آپ فرماتے ہیں جب میں "مدسور" سے روانہ ہوا تو تہی دستی کا عالم [illegible] میرے پاس صرف ایک "بابری ٹکہ" (اس زمانہ کا خاص سکہ) تھا- میں [illegible] میں دہلی پہونچا- یہاں بازار میں جارہا تھا کہ ایک شخص کو دیکھا کہ "سپر [illegible] (ریشمی ڈھال) فروخت کر رہا ہے- مجھے وہ بہت پسند آیا قیمت دریافت کی [illegible] روپیہ اس کی قیمت تھی- میری جیب اب بالکل خالی ہو چکی تھی- تو میں [illegible] ساتھیوں سے تین روپیہ قرض لیے اور وہ ڈھال خرید لی- اتفاق سے [illegible]

پاس بھی کل اثاثہ یہی تین روپے تھے- جو میں نے اس طرح خرچ کر ڈالے تو اب ہر ایک ساتھی بہت پریشان ہوا- اور مجھ کو ملامت کرنے لگا- میں خود نادم و شرمندہ تھا- مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے ساتھیوں کی کل پونجی یہی ہے- بہر حال میں اسی ندامت اور پریشانی میں تھا- اور سر جھکائے اس سپر پر انگلی چلا رہا تھا کہ ڈھال کے ریشمی غلاف کا ایک کنارہ اکھڑ گیا- اب جو نظر پڑی تو اس کنارہ کے نیچے سونے کا حلقہ نظر آیا- اب میں نے پورا غلام ادھیڑ دیا- تو-

"حلقہ طلا ہشتاد تولچہ بر آمد"

(اٹھارہ تولے سونے کا پترا ڈھال پر چڑھا ہوا نکلا)

اس تائید غیبی نے میری پشیمانی اور پریشانی رفع کی- میں نے فوراً یہ حلقہ الگ کیا- اور بازار میں فروخت کر کے دوستوں کا قرض بھی ادا کیا- سب کو برابر تقسیم کر دیا-

اب خدا کے فضل سے میرے پاس سامان سفر فراہم ہو گیا- میں دہلی سے روانہ ہو کر پانی پت پہونچا- اور والد صاحب قبلہ کی قدم بوسی سے مشرف ہوا-

دوبارہ تلاش ملازمت اور ناکامی

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے چند مرتبہ ملازمت کی کوشش کی- اور اسی جستجو میں کہ کوئی مناسب جگہ مل جائے میں نے چند مرتبہ ملتان- لاہور' گجرات اور جونپور وغیرہ کا سفر کیا- مگر جو صورت میں چاہتا تھا- وہ کہیں بھی میسر نہیں آئی- اور اس کا سبب یہ تھا- کہ

"والد بزرگوار مجھے سفر کی اجازت تو دیدیا کرتے تھے- مگر جب سفر کے لیے رخصت ہوتا تو یہ بھی فرمایا کرتے تھے-"

"عبدالسلام- تمہیں خدا نے دوسرے کام کے لیے پیدا کیا ہے- تم کہاں دنیا کے پیچھے سرگرداں پھرتے ہو-"

قلندرانہ زندگی اور سیاحت

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب نے اسی سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ جب چند مرتبہ جدوجہد کے باوجود ناکامی ہوئی تو :-

"دلم از مطالبات دنیاوی سرد گشت- وزمام اختیار بکوچہ عشق کشید از ہمہ تعلقات ترک گرفتہ انچہ در ملک بود بفقراء قسمت کردم وبطریق قلندرانہ روانہ شدم-"

(طلب دنیا کے جذبات سرد پڑ گئے- کوچہ عشق کی جانب زمام اختیار کی کشش ہونے لگی- تمام تعلقات سے کنارہ کش ہو گیا- اپنی پوری ملکیت فقراء کو تقسیم کر دی اور قلندرانہ انداز میں نکل کھڑا ہوا-")

جونپور وغیرہ پوربی اضلاع کی سیاحت اور اکابر علماء مشائخ سے ملاقات

اس زمانہ میں شاہان مشرق کا اقبال عروج پر تھا- جونپور جس طرح سیاسی اقتدار کا مرکز تھا- علماء اور مشائخ کا بھی وہاں کافی اجتماع رہتا تھا- حضرت شاہ اعلیٰ صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے سیاحت اختیار کی تو پہلے جونپور پہونچا- وہاں
بہاؤالدین- میر سید علی قوام شیخ شمس الدین سادجی جیسے بزرگوں کی خدمت
حاضر رہا- کوڑہ جہاں آباد میں مولانا علی احمد اور شیخ الصمد صاحب انبہٹی
الاسلام شیخ نظام- گجرات میں قاضی محمود- جیسے اکابر سے ملاقات ہوئی- مگر
میرا حصہ کسی اور جگہ مقدر تھا- اس لیے کسی بارگاہ میں بھی دلجمعی نصیب نہ ہوئی-

بہار

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب فرماتے ہیں کہ میں بہار پہونچا- وہاں شیخ علی
اور مولانا حسام الدین بغدادی- شیخ صلاح' اور شیخو خاں وغیرہ سے نیاز حاصل
آپ فرماتے ہیں- بہار میں اور عجیب واقعہ بھی پیش آیا- جس کی تفصیل یہ
جب میں بہار پہونچا- وہاں ایک جگہ قیام کیا- تو ایک عالم سے ملاقات ہوئی

نام عبدالواحد تھا- یہ حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے خلیفہ حضرت سید موسیٰ بہاری کے پوتے تھے- مولانا عبدالواحد صاحب نے میرے حالات معلوم کیے- اور جب ان کو معلوم ہوا کہ میرا خاندانی تعلق حضرت مخدوم کبیر الاولیاء رحمہم اللہ سے ہے تو انہوں نے خاطر مدارت میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا- مگر اس زمانہ میں خود مجھ پر ایک مجذوبانہ کیفیت طاری تھی- نماز بھی جماعت وغیرہ کی پابندی کے ساتھ نہیں ہوتی تھی- مولانا عبدالواحد صاحب نے جب میری یہ حالت دیکھی تو اول تو سمجھایا- اور جب دیکھا کہ ان کی فہمائش کارگر نہیں ہوتی تو جتنے وہ مہربان تھے اتنے ہی اب مخالف ہو گئے- اور ایسی ترشی اور تلخی اختیار کی کہ مجھ کو وہ جگہ چھوڑنی پڑی- شہر سے باہر ایک ویران مسجد تھی- میں اس مسجد میں جا پڑا- ایک ہی رات گذری تھی کہ اگلے روز میں نے دیکھا کہ سید عبدالواحد دو آدمیوں پر سہارا دیئے ہوئے گھسٹے چلے آرہے ہیں- زبان پر توبہ اور استغفار ہے- جب وہ قریب پہونچے تو ایک دم میرے پیروں میں گر گئے اور حد درجہ اصرار کرنے لگے کہ میں وہیں چلوں جہاں پہلے مقیم تھا-

ایک عالم' خاندان سے سید اور ایسے سن رسیدہ ضعیف کہ دو آدمیوں کے سہارے یہاں تک پہونچے- جب انہوں نے اس طرح لجاجت اور عاجزی کا مظاہرہ کیا- تو میں نے ان کے آداب کا پورا احترام کرتے ہوئے اس اصرار کا سبب دریافت کیا- تو فرمانے لگے رات میں نے اپنے دادا حضرت سید موسیٰ صاحب کو خواب میں دیکھا کہ غصہ میں بھرے ہوئے ہیں اور بہت تلخی سے فرما رہے ہیں-

"عبدالواحد تم نے میرے پیر زادہ کو رنجیدہ کیا- خدا تمہیں رنجیدہ کرے-"

جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میرے ہاتھ پاؤں "شل" ہیں- میں حرکت بھی نہیں کر سکتا- دیر تک یہی حالت رہی- آخر بمشکل کچھ حرکت ہو سکی- تو بہزار دشواری دو آدمیوں پر سہارا دے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں- للہ میرا قصور معاف کیجئے اور اپنی قیام گاہ پر تشریف لے چلئے-

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا عبدالواحد کی اس [illegible]
معذرت کے بعد میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ میں واپس آ [illegible]
میں اس پرانی قیام گاہ پر واپس پہونچ گیا تو خدا کے فضل سے سید عبد [illegible]
بھی اس آزار سے شفایاب ہو گئے۔

یہ واقعہ ایسا نہیں تھا جو چھپا رہتا۔ روئی کے گالے کی طرح اس کی [illegible]
گئی۔ میری زیارت کو لوگ آنے لگے اور میرے گرد لوگوں کا ہجوم رہ [illegible]
میرے لیے ایک آزار تھا۔ مجھے لوگوں سے وحشت اور لوگ دست [illegible]
بوسی کے لیے ہر وقت حاضر۔ چند روز اس طرح گذرے۔ آخر یہ [illegible]
ہو سکا۔ اور میں خفیہ طور سے شہر سے نکل کر آگرہ کی طرف روانہ ہو [illegible]
قیام کر کے والد صاحب کی خدمت میں پانی پت حاضر ہوا۔ اور ان کے [illegible]
زندگی گذارنے کی کوشش کر دی۔

چلہ کشی

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب (جو ابھی تک شیخ عبدالسلام ہی تھے۔ [illegible]
سر فراز نہیں ہوئے تھے) جب باقاعدہ حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے تو والد [illegible]
جواب پیر و مرشد بھی ہو گئے تھے۔ "چلہ" کی ہدایت فرمائی۔ اور حضرت شیخ [illegible]
ترک رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کے قریب ایک کوٹھری چلہ کے لیے لے [illegible]

چلہ کیا ہے؟

چلہ مشائخ طریقت کے یہاں ریاضت و مجاہدہ کا ایک چالیس روز [illegible]
ہے۔ جو مادی دلچسپیوں اور دنیاوی تعلقات ختم کرنے کے لیے سنار کی [illegible]
کام کرتا ہے۔

حضرت شیخ نظام الدین نارنولی سے رابطہ اور تعلق

آپ اب تک اپنے والد ماجد شیخ نظام الدین پانی پتی سے بیعت تھے [illegible]
دوران میں آپ نے عجیب تماشہ دیکھا۔ وہی حجرہ جو چلہ گاہ تھا۔ جس [illegible]

سب طرف سے بند رہتے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت شیخ نظام الدین نارنولی وہاں رونق افروز ہیں۔ اور فرما رہے ہیں کہ "آپ کا حصہ باطنی ہمارے یہاں ہے۔ آپ نارنول آیئے اور اپنا حصہ لے لیجیے۔"

اس کا اثر یہ ہوا کہ جیسے ہی چلہ سے فراغت ہوئی۔ آپ (بقول مولانا غلام سرور صاحب)

> "مستانہ وبے ہوشانہ نارنول پہونچے۔ اور حضرت نارنولی سے ارادت و بیعت کی سعادت حاصل کی۔ خرقہ خلافت حاصل کیا۔ اور نہ صرف خرقہ خلافت حاصل کیا۔ بلکہ بارگاہ نارنول میں یہاں تک مقبولیت اور محبوبیت حاصل کی۔ کہ بجائے شیخ عبدالسلام کے حضرت مرشد نے آپ کو "شاہ اعلیٰ" کے خطاب سے نوازا۔" سیر الاقطاب میں خود آپ کا بیان نقل کیا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔
>
> "میں ابھی نارنول میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ حضرت شیخ نارنولی کا ایک خادم میرے سامنے آیا۔ اور اس نے حضرت شیخ کا عمامہ اور آپ کے نعلین مجھے عطا فرمائے۔ پھر ابھی خانقاہ میں نہیں پہونچا تھا کہ ایک دوسرا خادم سامنے آیا۔ اور اس نے ایک کاغذ مجھے عنایت کیا۔ اس میں ایک "اسم" تحریر تھا۔ اور ہدایت تھی کہ اس کی مداومت کرو۔ اور جب تک آپ کا دل اعلیٰ نہ ہو جائے ہمارے پاس آنے کی ضرورت نہیں ہے۔
>
> حضرت شاہ اعلیٰ صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت شیخ کے ارشاد کے بموجب سات روز تک کفش دوزوں کی مسجد میں قیام کر کے اس وظیفہ کی پوری طرح پابندی کی۔ یہاں تک کہ صفائی قلب حاصل ہوئی۔ اس کے بعد حضرت مرشد کی اجازت ہوئی۔ میں بارگاہ میں حاضر ہوا۔ تو فرمایا "الحمد للہ اعلیٰ

شدی" (خدا کا شکر ہے تم اعلیٰ ہو گئے) پھر اتنی عنایتیں اور شفقتیں فرمائیں۔ کہ احاطہ تحریر سے باہر ہیں۔

اس کے بعد ایک سال پانچ ماہ سترہ روز (یعنی سترہ ماہ سترہ روز) خدمت گرامی میں حاضر رہا۔ یہ پوری مدت چلہ کشی اور ریاضت و مجاہدہ میں گذری۔ یہاں تک کہ ایک روز مجھے حجرہ خاص میں طلب فرما کر ارشاد فرمایا۔ کہ "بابا۔! مشائخ طریقت کے "چودہ خانوادوں سے (یعنی مشائخ طریقت کے چودہ سلسلے جن سے ہندوستان میں فیض جاری ہے۔ چودہ خانوادے کہلاتے ہیں) جو کچھ مجھے ملا ہے۔ وہ سب تم کو بخش رہا ہوں اور تمہیں اجازت دے رہا ہوں کہ وطن جاؤ۔ اور خلق خدا کی خدمت میں مصروف ہو جاؤ۔

پھر فرمایا: آج تیسرا روز ہے کہ آپ کے دادا حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء رحمتہ اللہ علیہ برابر خواب میں مجھے تاکید فرما رہے ہیں کہ میرے پوتے کو جلد پانی پت بھیج دو۔ کہ وہاں میری گدی خالی پڑی ہے۔

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے اس سے حیرت بھی ہوئی کہ "گدی خالی" کیوں ہے؟ جب کہ حضرت والد صاحب وہاں موجود ہیں۔ بہر حال میں حضرت شیخ کی ہدایت کے بموجب نارنول سے رخصت ہوا۔ جب آگرہ پہونچا تو معلوم ہوا کہ حضرت والد صاحب کی وفات ہو چکی ہے۔ دنیا مجھے تاریک نظر آنے لگی۔ میں نے آگرہ کا قیام مختصر کیا۔ اور جس قدر جلد ممکن ہو سکا پانی پت پہونچا۔ اور اپنے بزرگوں کی امانت کی حفاظت اور خانقاہ کی خدمت میں مصروف ہو گیا۔

قیاسات

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے مذکورہ بالا بیان سے جس کو "اپنی کہانی اپنی زبانی" کہنا چاہیے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ :۔

۱۔ تقریباً ۴۳ سال کی عمر میں آپ نے فوجی ملازمت اختیار کی (کیونکہ آپ کا سنہ ولادت ۸۹۰ھ ہے اور بابر نے دہلی کو ۹۳۳ ہجری (۱۵۲۶ء) میں فتح کیا۔ اسی سال اگر آپ نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا پھر سورت سے مراجعت کرتے ہوئے قزا خاں کی ملازمت اختیار کی تو اس وقت آپ کی عمر تینتالیس سال تھی۔)

۲۔ ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) میں شیر شاہ نے ہمایوں کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کی۔ اسی شورش میں آپ اپنے منصب سے علیحدہ ہوئے اور دہلی پہونچے۔ پھر پانی پت تشریف لے گئے یعنی تقریباً ۱۴ سال آپ فوج میں رہے۔

۳۔ والد صاحب۔ یعنی شیخ نظام الدین صاحب کی وفات ۱۰۱۸ھ میں ہوئی۔ اس سے چند سال پہلے آپ سیاحت اور قلندرانہ زندگی سے نجات پاکر والد صاحب سے بیعت ہوئے اور چلے گئے۔ اکبر بادشاہ کی وفات ۱۰۱۴ ہجری (۱۶۰۵ء) میں ہوئی تھی۔ گویا اکبر کی وفات، جہانگیر کی تخت نشینی اور پانی پت میں سیاحت بہار وغیرہ سے واپس کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کی عمروں میں عجیب برکت عطا فرمائی تھی۔ ۸۹۰ ہجری (سال ولادت سے لے کر) ۱۰۱۴ھ (سال مراجعت پانی پت) تک ایک سو چوبیس (۱۲۴) سال کی عمر ہو چکی ہے۔ پھر بھی آپ نے تقریباً بیس سال خانقاہ معلیٰ کی خدمت کی۔ اور امانت بزرگان چشت کی حفاظت کے فرض کو انجام دیتے ہوئے ۱۰۳۳ھ میں واصل حق ہوئے۔ (رحمتہ اللہ)

عجیب و غریب انکشاف

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ اسی سلسلہ کے صاحب سلسلہ مرشد طریقت ہیں۔ فرق یہ ہے کہ آپ حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے خلیفہ

حضرت احمد عبدالحق ردولوی رحمتہ اللہ علیہ سے فیض یاب ہوئے ہیں اور
شاہ اعلیٰ صاحب، حضرت مخدوم کبیر الاولیاء کے فرزند و خلیفہ حضرت
صاحب کے سلسلہ میں ہیں- آپ کا سلسلہ نسب اور سلسلہ خلافت یہ ہے-

شاہ اعلیٰ فرزند و خلیفہ حضرت شیخ نظام الدین، فرزند و خلیفہ حضرت
زندہ پیر، فرزند و خلیفہ حضرت شیخ عبدالکبیر اولیاءؒ، فرزند و خلیفہ حضرت
عبدالقدوس، فرزند خلیفہ حضرت خواجہ شبلی، فرزند و خلیفہ حضرت
کبیر الاولیاء رحمتہ اللہ علیہ-

بہر حال یہ دونوں بزرگ اگرچہ حضرت مخدوم کبیر الاولیاء ہی کے
ایک ہی سرچشمہ سے سیراب ہونے والے ہیں- مگر ابراہیم لودھی پر بابر
کیا تو سیاسی مذاق میں یہ فرق تھا- کہ حضرت شاہ عبدالقدوس صاحب کا ر
ابراہیم لودھی پھر شیر شاہ سوری کی طرف رہا-

چنانچہ بابر کی فوج نے ان کو ابتداء میں گرفتار بھی کر لیا تھا- لیکن حضرت
اعلیٰ کا رجحان اس کے برعکس مغلوں کی طرف تھا- چنانچہ آپ مغلوں کی
تقریباً چودہ سال تک ایک منصب پر فائز رہے- اور شیر شاہ کی فوج نے
سامان لوٹا-

مجاہدہ کی نوعیت اور توکل علی اللہ کی نادر مثال

حضرت شاہ اعلیٰ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے سپاہیانہ زندگی کے بعد
قطع تعلق کیا تو اس کی بھی شان عجیب تھی- مثلاً: آپ نے طے کر لیا کہ
قطع نظر محض توکل پر زندگی بسر کریں گے- حضرت شیخ محمد مودود
مقبرہ کے قریب ایک شکستہ حجرہ یا ایک غار تھا- وہاں آپ مقیم تھے- اتفاق
چیز میسر نہیں آئی- اور پانچ دن اسی طرح گذر گئے کہ ایک دانہ آپ کے
مبارک میں نہیں پہونچا- متواتر فاقہ سے نشست و برخاست مشکل ہو گئی
کے سامنے اندھیرا ہونے لگا- مگر آپ کے توکل و اعتماد علی اللہ میں کوئی فرق

آیا-

آپ اسی حجرہ میں تھے کہ باہر سے آواز آئی- کوئی آپ کو پکار رہا ہے آپ باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک نورانی صورت بزرگ سپید لباس پہنے ہوئے تشریف فرما ہیں- ایک نان ان کے ہاتھ میں ہے- یہ صاحب آگے بڑھے- نان کے ٹکڑے کیے اور خود اپنے ہاتھ سے دو ٹکڑے حضرت شاہ اعلیٰ کو تناول کرائے- نان ختم ہو گیا تو وہ صاحب روانہ ہوئے- حضرت شاہ اعلیٰ صاحب ان کے پیچھے چلے کہ معلوم کریں کون صاحب ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں مگر وہ بہت جلد آنکھوں سے اوجھل ہو گئے-

حضرت شاہ اعلیٰ کو افسوس ہوا کہ ایسے باکمال بزرگ سے کچھ باتیں دریافت کرتا- رات آئی سونے کا وقت ہو گیا- مگر آپ کو ایک یہی افسوس تھا- آنکھ لگی تو خواب میں دیکھا کہ وہی صاحب رونق افروز ہیں- آپ کی گویا تمنا پوری ہو گئی- آپ نے فوراً اپنے سوالات پیش کیے- اور اس مرشد روحانی کے جوابات سے مستفیض ہوئے-

صبر و ضبط اور تسلیم و رضا

شیخ اللہ دیا صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ اعلیٰ صاحب کے دو فرزند تھے- شاہ نور اور شاہ منصور- یہ دونوں صاحب عیال تھے- دونوں کی وفات حضرت شاہ اعلیٰ صاحب کی زندگی میں ہو گئی- پھر ان کے کئی لڑکے تھے- وہ بھی سب حضرت شاہ اعلیٰ صاحب کے سامنے ہی داغ مفارقت دے گئے- صرف ایک پوتا باقی رہ گیا- حضرت "شاہ محمد" جن کی عمر ان کے والد کی وفات کے وقت صرف چھ ماہ تھی- اور والدہ اس سے بھی پہلے رخصت ہو چکی تھیں- ان کی پرورش حضرت ہی نے کی- اور آخر میں ان ہی کو خلیفہ اور صاحب سجادہ نشین بنا دیا- مگر حضرت شاہ العالمین کے صبر و ضبط کی حالت یہ تھی کہ کسی کی وفات پر بھی قابو سے باہر نہیں ہوئے- میت کا تمام کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے- دوسروں کو صبر دلاتے رہتے-

اور جب دفن کر کے واپس ہوتے تو کھانا منگواتے اور سب آدمی جو وہاں
ہوتے ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے-

چند کرامتیں

ایسا صابر وشاکر اور ایسا قناعت پسند اور متوکل- اگر اس سے کرامتیں
ہوں تو تعجب نہیں ہونا چاہیے- حدیث شریف میں ہے کہ جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ
اس کا ہو جاتا ہے- اب جو کام وہ کرتا ہے- قدرت خدا کے خصوصی کرشمے
کے ساتھ ہوتے ہیں- چنانچہ آپ کے ایک ارادت مند جن کا نام صاحب
سیر الاقطاب نے "مولانا ظاہری" لکھا ہے- یہ مولانا ظاہری فرماتے ہیں:-

۱- ایک شب کو حضرت شاہ العالمین (شاہ اعلیٰ صاحب) نے فرمایا کہ ہم
باگھوتی پہونچ کر حضرت قلندر صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر فاتحہ پڑھیں گے
اور غریبوں کو کھانا کھلائیں گے- پھر مجھے ہدایت فرمادی کہ نماز صبح یہاں آ
پڑھو- یہ میری سعادت تھی کہ حضرت نے مجھے ہمرکاب رہنے کا حکم فرمایا میں
نے خوشی منظور کر لیا- چنانچہ میں تہجد کے وقت اٹھا- اپنے معمولات پورے کیے
اور ابھی ایک پہر رات باقی تھی کہ بادل گھر آیا- اور بوندا باندی ہونے لگی- میں
سوچا کہ ایسی صورت میں کہاں جانا ہوگا- اور یہ سوچ کر میں نے حضرت شاہ صاحب
کی مسجد کے بجائے اپنی ہی مسجد میں نماز پڑھی اور مکان پر آ گیا- فوراً ہی کسی
دروازہ پر دستک دی- میں باہر نکلا تو دیکھا کہ حضرت شاہ العالمین کے پوتے
شاہ محمد تشریف فرما ہیں اور فرما رہے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب آپ کے منتظر
ہیں- میں نے فوراً گھوڑا کسا- اور صاحبزادہ صاحب کو گھوڑے پر سوار کیا اور
دولت تک پیدل پہونچا-

حضرت کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی- فرمایا بہت اچھا ہوا- آپ آگئے
باگھوتی چلیے- میں نے عرض کی- ترشح ہو رہا ہے ایسی صورت میں کیا جانا
باگھوتی میں کوئی سایہ کا انتظام بھی نہیں ہے- آج رہنے دیجیے- کل چلیں گے-

نہیں جو طے ہو چکا ہے اس کو بدلنا نہیں- اور آپ خاطر جمع رکھیے- بارش سے آپ کو
کوئی زحمت نہ ہوگی- اتنی دیر میں بادل اور گھر آیا- بجلی کڑکی اور بارش زور سے
ہونے لگی- مگر حضرت اپنے ارادہ پر قائم رہے- اور سامان فراہم کر کے روانہ ہو
گئے- کچھ اور مرید و معتقد بھی جو وہاں موجود تھے ساتھ چل دیئے- ہم پانی پت سے
کئی میل باگھوتی گئے- وہاں فاتحہ پڑھا- نان اور یخنی جو بہت زیادہ تھی وہ تقسیم کی-
پھر واپس آئے-

اب کرامت یہ ہے کہ اس اثنا میں بارش برابر ہوتی رہی مگر ہم سب محفوظ
رہے- گویا ہم سائبان کے نیچے ہیں- آس پاس بارش برس رہی تھی- اور ہم تک
بارش تو کیا' بارش کی بوچھاڑ بھی نہیں پہونچ رہی تھی- حضرت نے جو فرمادیا تھا کہ
خاطر جمع رکھو بارش سے تمہیں کوئی زحمت نہ ہوگی- یہ ارشاد اس طرح پورا ہوا کہ
ہم جیسے سوکھے روانہ ہوئے تھے- ایسے ہی واپس آگئے-

۲- قوت کشف بھی یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ بسا اوقات لوگوں کے
ارادوں کا آپ کو کشف ہو جاتا تھا- چنانچہ ایک مرتبہ "سونی پت" سے چند صاحبان
آئے- راستہ میں گفتگو شروع ہوئی کہ ہم پہونچیں گے تو حضرت ہماری خاطر کس
چیز سے کریں گے- کسی نے کہا- حلوا پیش فرمائیں گے- کسی نے کہا نان اور مرغ
بریاں- ایک نے کہا خربوزہ عنایت فرمائیں گے- چنانچہ جب ہم حاضر خدمت
ہوئے تو ہر ایک کو وہی عنایت فرمایا جس کا خیال اس نے ظاہر کیا تھا یہاں تک کہ
خربوزہ کے خواہش مند کو خربوزہ پیش فرمایا- حالانکہ موسم نہیں تھا-

شیخ اللہ دیا صاحب فرماتے ہیں کہ اس کا تجربہ تو خود مجھے بارہا ہوا ہے کہ جس
کھانے کا مجھے خیال آیا- حضرت شاہ صاحب کے یہاں پہونچا تو وہی سامنے آگیا-

نوجوانی کے زمانہ کی بات ہے کہ حضرت کے یہاں جاتے ہوئے مجھے خیال آیا-
کہ اگر حضرت والا- مجھے "الوس خاصگی" یعنی اپنا پس خوردہ عنایت فرمادیں تو میری
بہت بڑی سعادت اور خوش نصیبی ہو- میں دولت کدہ پر پہونچا تو دیکھا کہ دستر
خوان بچھا ہوا ہے اور حضرت کھانا تناول فرما رہے ہیں- جیسے ہی مجھے دیکھا بڑے

اصرار سے بلایا- میں نے بہت کچھ معذرت کی- مگر شنوائی نہیں ہوئی- زبر
اپنے پاس بٹھالیا- مجھے ندامت ہو رہی تھی اور میں ہر گز نہیں چاہتا تھا کہ
کے برابر بیٹھوں- مگر الامر فوق الادب- مجھے ارشاد گرامی کی تعمیل کرنی پڑی
برابر میں بیٹھ گیا- حضرت نے فرمایا- یہ سب کھانا الوس ہے- کھاؤ اور
کھاؤ- چنانچہ میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا-

۳- شیخ اللہ دیا صاحب مصنف سیر الاقطاب اگرچہ حضرت مخدوم کبیر
کے بڑے فرزند حضرت خواجہ عبدالقادر صاحبؒ کی اولاد میں سے ہیں-
کے کسی بزرگ نے کیرانہ کی سکونت اختیار کرلی تھی (جو ریل کے راستہ
کل بہت دور ہو گیا ہے یعنی پانی پت سے دہلی تقریباً ۵۲ میل پر دہلی
تقریباً ساٹھ میل- مگر پیدل کے راستہ اب بھی تقریباً ۱۲ میل ہے- دریا
میں ہے- اس کے ایک جانب کیرانہ ہے دوسری طرف پانی پت) بہر حال
شیخ اللہ دیا صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ اعلیٰ صاحبؒ
تشریف لائے- کچھ دنوں پہلے شاہی دربار سے میرے عم محترم مقرب خان
پٹنہ کے صوبہ دار مقرر فرمائے گئے تھے- عم محترم پٹنہ کے لیے پورے
کے ساتھ روانہ ہوئے تو میرے بڑے بھائی مولانا شیخ قاسم صاحب جن کو
اس درجہ کا عالم و فاضل بنایا ہے کہ علم و ہنر مندی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے
اپنے جملہ متعلقین کے ساتھ چچا صاحب کے ہمراہ روانہ ہو گئے تھے-
قافلہ کشتیوں پر روانہ ہوا-

الغرض- حضرت شاہ العالمین جب کیرانہ رونق افروز ہوئے تو قصبہ کے
آدمی خصوصاً خاندان کے جملہ افراد ملاقات کے لیے حاضر ہوئے- میرے
صاحب بھی تشریف لائے- حضرت شاہ العالمین نے والد صاحب کو دیکھا
اور والد صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا- "چند روز بعد بہت وحشتناک خبر
والی ہے- مگر آپ پریشان نہ ہوں- اللہ کے بھروسہ پر صبر و سکون سے رہیں
تعالیٰ فضل فرمائیں گے-

حضرت کا یہ ارشاد خود وحشت انگیز تھا- مگر صبر و ضبط کی ہدایت تھی- اس لیے ہم نے گھبراہٹ تو ظاہر نہیں کی مگر خبر کا انتظار ضرور ہو گیا- پھر حضرت نے خود ہی خبر بھی دیدی کہ جس کشتی پر شیخ قاسم صاحب سوار تھے وہ بھور میں پھنس کر ڈوب گئی- اس پر سوار تمام مسافر غرق ہو گئے- مگر خدا کے فضل سے شیخ قاسم ان کی خوشدامن صاحبہ اور سب اہل و عیال جو اس کشتی پر تھے محفوظ رہ گئے- حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ میں یہی خبر دینے آیا تھا-

حضرت نے اس روز قیام فرمایا- اگلے دن آپ واپس تشریف لے گئے- چند روز بعد قاصد آیا- تو واقعہ بالکل وہی تھا جس کی خبر حضرت چند روز پہلے پانی پت سے تشریف لاکر ہمیں سنا چکے تھے-

۴- ایک حلوائی جو آپ کا مرید تھا- اس نے کچھ اشرفیاں ایک ٹھلیا میں بھر کر اپنے مکان میں چولہے کے قریب گاڑ دی تھیں- اتفاق سے اس کو ضرورت پیش آئی- اس نے زمین کھودی تو وہ ٹھلیا غائب تھی- وہ حضرت پیر روشن ضمیر (شاہ اعلیٰ صاحب) کی خدمت میں حاضر ہوا- اور سارا ماجرا عرض کیا- آپ نے فرمایا- جاؤ اور تلاش کرو- اس نے واپس آ کر گھر کا کونہ کونہ کھود ڈالا- مگر وہ ٹھلیا کہیں نہیں ملی- پھر آپ کی خدمت میں آیا- بہت پریشانی ظاہر کی- اور حضرت سے توجہ خصوصی کی استدعا کی- حضرت شاہ العالمین نے فرمایا- چلو مجھے بتاؤ تم نے یہ اشرفیاں کہاں گاڑی تھیں- حلوائی آپ کو اپنے مکان کی طرف لے گیا- ابھی مکان تک نہیں پہونچے تھے کہ آپ نے حلوائی سے کہا کدال لاؤ- حلوائی دوڑ کر کدال لایا- آپ نے راستہ کے بیچ میں کدال سے کچھ زمین کھودی- پھر حلوائی سے کہا کہ تم زمین کھودو- تمہاری اشرفیاں یہاں ہیں- حلوائی نے زمین کھودنی شروع کی- تھوڑی دیر میں ٹھلیا کا کنارہ نظر آیا- پھر وہی ٹھلیا اسی طرح موتھ بند وہاں سے بر آمد ہو گئی- سب کو حیرت ہوئی کہ ٹھلیا کہاں گاڑی تھی- کہاں سے بر آمد ہوئی- اور حضرت کو اس کا علم کس طرح ہوا- یہ ایک بزرگانہ کشف تھا- جس کو انعام خداوندی کہنا چاہیے-

۵- خانقاہ معلیٰ میں خود حضرت شاہ اعلیٰ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ایک کنواں کھدوایا- جب پانی نکلا تو کھاری تھا- بہر حال کنواں تیار ہو گیا- مگر پانی کھاری ہی رہا- کچھ دنوں بعد کوئی صاحب دہلی سے واپس ہوئے اور چند کیک پیش کیے- جو حضرت خواجہ کہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کی خانقاہ سے بطور تبرک لے گئے تھے- حضرت شاہ اعلیٰ صاحب نے وہ "کیک" اس شخص سے لیے اور ان کے ٹکڑے کر کے ان پر کچھ پڑھا- اور یہ ٹکڑے کنوئیں میں ڈال دیئے اور فرمایا- اس تبرک کی برکت سے کنوئیں کا پانی میٹھا ہو جائے گا- اور ارادت مندوں نے فوراً ہی پانی نکال کر پیا تو واقعی شوریت ختم ہو گئی تھی- اور پانی میٹھا ہو گیا تھا- اب اس کنوئیں کا پانی خدا کے فضل سے نہایت شیریں ہے-

وفات

حضرت شاہ اعلیٰ رحمتہ اللہ علیہ نے عظیم الشان خصوصیات کے ساتھ حیات عزیز کے ایک سو تنتالیس (۱۴۳) سال پورے کیے- اور ۵ / ربیع الاول ۱۰۳۳ ہجری (۱۶۲۴ء) چہار شنبہ کے روز اس جہان سے رخصت ہو گئے-

مزار مبارک

حضرت شاہ اعلیٰ رحمتہ اللہ علیہ نے خود ایک قبرستان شہر سے باہر سید علی تقی کے مزار کے قریب وقف کیا تھا- اپنے صاحبزادوں کو وہیں دفن کیا تھا- مگر حضرت کی وفات کے بعد متوسلین اور ارادت مندوں نے خود حضرت شاہ کو وہاں دفن کرنا پسند نہیں کیا- بلکہ خانقاہ معلیٰ ہی میں آپ کو دفن کیا گیا-

ایک خاص کرامت

شیخ اللہ دیا صاحب فرماتے ہیں:- کہ میری پردادی جو "اوستانی صاحبہ سلطان" کے نام سے مشہور تھیں- وہ حضرت شاہ صاحب سے بیعت تھیں- حضرت شاہ صاحب کی وفات سے تقریباً ڈھائی سال بعد انہوں نے حضرت کا مزار پختہ بنوانا چاہا- اس کے لیے "فتح پور سیکری" سے پتھر منگوائے- ابھی مجر کی بنیاد بھی

نہیں بھری گئی تھیں- کہ معمار نے خواب میں دیکھا کہ حضرت شاہ اعلیٰ صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمارہا ہیں کہ بنیاد میں جب آپ لوگوں نے گئی کوٹنی شروع کی تو لحد کا ایک پتھر ٹوٹ گیا ہے اور وہ میری داہنی ران پر آپڑا ہے- پہلے اس کو نکالو- پھر مجر کی تعمیر کرنا- معمار کی آنکھ کھلی تو وہ پریشان تھا- وہ محترمہ اوستانی صاحبہ کے پاس آیا- آپ نے فرمایا- حضرت نے جو ہدایت فرمائی ہے- وہ غلط نہیں ہو سکتی- قبر کھول کر دیکھو- معمار نے قبر کی مٹی ہٹائی- قصبہ کے تمام ہی سربر آوردہ حضرات اس موقع پر وہاں پہونچ گئے تھے- جب لحد تک مٹی ہٹائی گئی تو دیکھا کہ واقعی ایک پتھر ٹوٹ کر اندر گر گیا ہے- پتھر کو لحد کے اندر سے نکالا- پھر لحد درست کر کے مجر کی تعمیر کی- اس وقت جو حصہ نظر پڑا تو معلوم ہوا کہ وہ ایسا ہی صاف اور صحیح سالم تھا جیسا کہ دفن کے وقت تھا-

تنبیہ: یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ لحد بند کرنے اور قبر بھر دینے کے بعد اس کا کھولنا جائز نہیں ہے- اس قسم کے واقعات کی کوئی توجیہہ کی جائے گی- مگر ان سے حکم شریعت میں فرق نہیں آسکتا- عام حکم یہی ہے-

الحمد للہ- اس واقت ۶ شوال ۱۳۸۲ہجری (۳ مارچ ۱۹۶۳ء) یک شنبہ کے روز بعد نماز مغرب اذان عشاء کے وقت جنبش قلم ان سطور تک پہنچ چکی ہے- ان اوراق میں جو کچھ درج کیا گیا ہے- وہ زیادہ تر سیر الاقطاب سے ماخوذ ہے- مصنف سیر الاقطاب شاہجہاں بادشاہ کے ایک منصب دار ہیں-

آپ نے ۱۰۳۶ھ (ایک ہزار چھتیس ہجری میں یعنی اپنے شیخ حضرت شاہ اعلیٰ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی وفات سے تین سال بعد اس کی ترتیب شروع کی- اور سنہ ایک ہزار چھپن ہجری میں یعنی بیس سال کی مدت میں اس کو پایہ تکمیل کو پہونچا سکے-

سیر الاقطاب میں حضرت شاہ اعلیٰ صاحب تک بزرگوں کے حالات درج ہیں- ہم بھی اس سلسلہ کو حضرت شاہ اعلیٰ صاحب پر ہی ختم کرتے ہیں- مگر اکابر اور بزرگان پانی پت کا سلسلہ حضرت شاہ اعلیٰ رحمتہ اللہ علیہ پر ختم نہیں ہو جاتا-

پانی پت وہ مردم خیز خطہ ہے جہاں حضرت شاہ اعلیٰ صاحب کے بعد بھی

حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی جیسے شریعت و طریقت کے مجمع البحرین جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ ان کے تذکرہ کے لیے ایک مکمل جلد کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی صاحب ذوق کو توفیق بخشے کہ اس قومی اور ملی ضرورت کو پورا کرے۔

ہم اس کتاب کے آخری صفحات کو ایک نظم سے آراستہ کرتے ہیں۔ جو مشعل راہ کا کام دے سکتی ہے۔ کیونکہ اس میں ان بزرگوں اور اہل کمال کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جو اس دوسری جلد کا موضوع بن سکتے ہیں۔ البتہ نظم سے پہلے ایک بزرگ کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔ جو عثمانی خاندان کے پہلے بزرگ ہیں جو پانی پت میں رحلت انداز ہوئے۔ یہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب گاذرونی ہیں۔ مگر یہ تذکرہ کسی کتاب کے حوالہ سے نہیں کیونکہ کسی کتاب میں ان کا ذکر خیر نظر سے نہیں گذرا بلکہ جناب جناب شیخ مسیح اللہ صاحب کے مرتب کردہ مسودہ سے نقل کرتے ہیں۔ یہی خاتمہ کتاب ہے۔

(واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین)

حضرت خواجہ عبدالرحمٰن گاذرونی رحمتہ اللہ علیہ

آپ سلطان محمود غزنوی کی فوج میں اعلیٰ عہدے پر مامور تھے۔ سلطان محمود کی واپسی کے بعد خواجہ صاحب ممدوح نے پانی پت میں قیام کیا۔ افغان قوم کے قبیلہ سالار کے کچھ افراد نے بھی خواجہ صاحب کی وجہ سے اس شہر میں قیام کیا۔ چنانچہ اس طرح پانی پت میں مسلمانوں کے دو خاندان آباد ہو گئے۔

خواجہ عبدالرحمٰن گاذرونی کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے امیر المومنین خلیفہ المسلمین حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ اور آپ کی بارہویں نسب میں حضرت مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء جیسا شہباز طریقت پیدا ہوا۔ جس سے اطراف و اکناف عالم میں سلسلہ عالیہ چشتیہ صابریہ پھیلا۔ حضرت خواجہ صاحب کا مزار حضرت سید اسمٰعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ کے متصل جزیرہ میں زیارت گاہ عوام ہے۔ (محمد مسیح اللہ صاحب پانی پتی)

سلسلہ نسب از حضرت شاہ اعلیٰ تا حضرت عثمان ذی النورینؓ بحوالہ سیر الاقطاب

امیر المومنین امام المتقین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ خواجہ عمر۔ خواجہ عبدالعزیز کبیر۔ خواجہ عبدالرحمٰن گاذرونی۔ خواجہ عبداللہ ثانی۔ خواجہ عبدالعزیز۔ خواجہ عبداللہ کبیر۔ خواجہ ولید۔ خواجہ خالد۔ خواجہ عبدالعزیز سرخسی۔ خواجہ عبدالرحمٰن ثانی۔ خواجہ شہاب الدین۔ خواجہ یعقوب۔ خواجہ عیسیٰ۔ خواجہ اسمٰعیل۔ خواجہ محمد۔ خواجہ ابوبکر۔ خواجہ علی۔ خواجہ عثمان۔ خواجہ عبداللہ۔ خواجہ محمود۔ مخدوم جلال الدین کبیر الاولیاء۔ خواجہ شبلی۔ شیخ عبدالقدوس۔ شیخ نظام الدین۔ شیخ عثمان زندہ پیر۔ شیخ عبدالکبیر الاولیاء۔ حضرت شاہ اعلیٰ

پانی پت کے نام

(از جناب خواجہ سہیل احمد انصاری پانی پتی)

پانی پت- اے مرجع اہل صفا و علم و فن
تیرا شہرہ تھا جہاں میں انجمن در انجمن
شیخ کالو-(۱) پنج پیراں- سید روشن علی
شیخ بو اسحاق غازی حضرت سرور سخی
خاک میں پنہاں ہیں تیری قاسم و بدرو شہید
صاحب تخت امانت(۲) گاذرونی سعید
کھینچ لائی سید محمود(۳) کو تیری زمیں
آنکھ کی ٹھنڈک عراقی(۴) کو ملی آ کر یہیں
شاہ شرف الدین (۵)قلندر صاحب جذب و سلوک
فخر سے قدموں میں جس کے سر جھکاتے تھے ملوک
تیری آغوش محبت میں وہ لعل بے بہا
پرورش پا کر بنا تھا زیب تاج اولیاء
شوق کے عالم میں جب ہوتا تھا وہ نغمہ سرا
دل پہ کھل جاتا تھا صوت سرمدی کا ماجرا

۱- مشہور یہ ہے کہ ۹۴۱ھ میں حضرت امام بدر لعین بدر عالم کی زیر سرکردگی ایک سو ساٹھ (۱۶۰) مجاہدین کے قافلے جن میں شیخ کالو شہید' سید روشن علی' پنج پیراں' امام ابو اسحاق' سید سخی سرور' امام ابو القاسم اور سید اکبر علی شہید شامل تھے- وارد پانی پت ہو کر جام شہادت نوش کیا-
۲- ۴۳۰ھ میں خواجہ عبدالرحمٰن گاذرونی سالار افواج غزنویہ نے اس شہر کو تسخیر کر کے یہاں اقامت اختیار کی-
۳- سید محمود ۴- مولانا فخر الدین عراقی والد حضرت قلندر صاحب- ۵-

اس کا انداز تغزل قدسیوں کو بھا گیا
شعر کے پردے میں اسرار جنوں سمجھا گیا
خواجہ شمس الدین کلیر سے بسے آ کر یہاں
ان کا فیض نور سارے ہند پر ہے ضوفشاں
شہ جلال(۱) الدین کبیر الاولیاء مخدوم ما
سالک راہ طریقت مخزن جود و سخا
مظہر نور حقیقت مرکز علم و یقین
جگمگا اٹھی تھی ان کے دم سے یہ تیری زمیں
خوشہ چینی کے لیے پیر ہرات(۲) آئے یہاں
پیر مکی(۳) نے اسی گلشن سے کیں گل چنیاں
قادر(۴) و شبلی(۵)' علیم (۶)و عبد قدوس(۷) و نظام(۸)
شیخ(۹) مودود سراج الدین(۱۰)- اماں(۱۱)' عبدالسلام(۱۲)
شہ نصیر (۱۳)و شہ زماں(۱۴)-حاجی(۱۵) ولی' احمد حسن(۱۶)
شہ مبارز(۱۷)' شہ کبیر (۱۸)و غوث علی(۱۹) و گل حسن(۲۰)

۱- کتاب میں حالات تفصیل سے تحریر کیے جا چکے ہیں-
۲- پیر ہرات خواجہ ملک علی انصاری ۳- مولانا سراج الدین مکی ۴- خواجہ عبدالقادر ۵- خواجہ شبلی شہباز ۶- شیخ علیم اللہ لبدال ۷- خواجہ عبدالقدوس عثمانی ۸- خواجہ نظام ۹- شیخ مودود لاری ۱۰- مولانا سراج الدین رکو گی ۱۱- شیخ امان پانی پتی- ۱۲- شیخ عبدالسلام شاہ اعلیٰ ۱۳- شیخ نصیر ۱۴- شاہ زماں ۱۵- حاجی دل محمد ۱۶- پیرجی احمد حسن- ۱۷- شاہ مبارز خاں ۱۸- شیخ کبیر بالا پیر ۱۹- مولوی غوث علی ۲۰- مولوی گل حسن-

پیر کینیا(۱) سید سلطان(۲) اولاد نبی
درس زہد و اتقا تھی جن کی ساری زندگی

احمد اللہ(۳)۔ رحمت اللہ(۴)۔ حضرت قاضی(۵) ثنا
مخزن علم شریعت منبع صدق و صفا

سید داؤد(۶) و قنبر (۷)۔ مولوی۔ احمد حسن(۸)
یہ بزرگان زمانہ تھے ترے سرو۔ چمن

قاری(۹) لالہ عبدالرحمٰن(۱۰) فخر قراء جہاں
ہیں یہ سب آسودہ خواب آج بھی تیرے یہاں

شیر افگن(۱۱) خشی(۱۲) و خواجہ معین الدین(۱۳) دلیر
خان صادق(۱۴)۔ خاں راسخ(۱۵)۔ ذکریا خان(۱۶) اور شیر

حاتم(۱۷) ثانی مقرب خاں۔ وزیر بادشاہ
سایہ دولت میں جس کے لوگ پاتے تھے پناہ

شیخ بینا(۱۸) شیخ زینا(۱۹) اور حکیم اللہ(۲۰) دیا
چاک دامن جن شفا دستوں نے صحت کا سیا

۱۔ پیر کہنا خلیفہ مخدوم صاحب۔ ۲۔ سید سلطان احمد یکی آل والے۔ ۳۔ قاضی القضات قاضی احمد اللہ ۴۔ مولوی رحمت اللہ مہاجر مکی ۵۔ بیہقی ہند قاضی ثناء اللہ محدث ۶۔ سید داؤد لنگ ۷۔ سید قنبر علی شہید۔ ۸۔ مولوی احمد حسن صاحب ۹۔ قاری لالہ صاحب ۱۰۔ قاری عبدالرحمٰن محدث ۱۱۔ نواب شکر اللہ خاں شیر افگن گوند ٹھٹھ ۱۲۔ خواجہ عبدالرزاق خشی عالمگیر ۱۳۔ خواجہ معین الدین دلیر دل گورنر کابل ۱۴۔ نواب لطف اللہ خاں صادق وزیر بہادر شاہ ۱۵۔ نواب امین اللہ خاں راسخ وزیر بہادر شاہ ۱۶۔ نواب ذکریا خاں گورنر لاہور ۱۷۔ نواب محمد علی خاں شیر دل مصنف "تاریخ مظفری" ۱۸۔ نواب مقرب خاں وزیر جہانگیر ۱۹۔ شیخ بینا حکیم ۲۰۔ شیخ زینا حکیم اکبر بادشاہ ۱۱ حکیم اللہ دیا طبیب شاہجہاں۔

یادگاریں ان کی تجھ میں آج بھی موجود ہیں
جانشینوں کے لیے ان کے نگر مسدود ہیں

مقبرہ(۱) لودھی کا' کابل مسجد(۲) اور وہ کالا(۳) آم
ذرہ ذرہ ہے ترا مشہور تاریخی مقام

شمع آزادی میں جلتا تھا حسینی(۴) کا لہو
ایسے بطل حریت کو کیا بھلا سکتا ہے تو

ابتدائے جنگ آزادی ہوئی اقبال(۵) سے
غلغلہ اٹھا وطن میں تیرے ہی اس لال سے

حضرت(۶) ملا مسیح۔ مجروح (۷)۔ حالی(۸) و سلیم(۹)
شاعری کا طور تھا تو اور یہ تھے تیرے کلیم

مجلسیں قائم تھیں شعر و شاعری کی کو بکو
تیرے علم و فن کا شہرہ تھا جہاں میں چار سو

اب کہاں باقی ہے وہ ماحول وہ شعر و سخن
خواب ہو کر رہ گئیں ساری روایات کہن

گودنے پالے تھے تیرے کس قدر اہل کمال
تجھ کو خشا تھا انہیں لوگوں نے اوج لازوال

لب نہ پیدا ہوں گے یہ بطل جلیل اس خاک سے
نام روشن تیرا ہم رکھیں گے ارض پاک سے

۱۔ مقبرہ سلطان ابراہیم لودی ۲۔ مسجد کابل باغ تعمیر کردہ بابر بادشاہ ۳۔ کالا آم یادگار فتح احمد شاہ ابدالی ۴۔ مولانا حسینی مجاہد ۱۸۵۷ء ۵۔ صوفی اقبال احمد لیڈر تحریک خلافت ۶۔ ملا مسیح مترجم مہابھارت بہ نظم فارسی ۷۔ میر مہدی حسن مجروح ۸۔ شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی۔ ۹۔ مولوی وحید الدین سلیم۔ مولانا القاء اللہ صاحب عثمانی مدظلہ العالی۔

غیر بھی آتے تو سینے سے لگاتا تو انہیں
بے تعلق کیوں ہے ہم سے دوست رکھتا تھا جنہیں
جس کی گرمی محفل اس کے دیوانوں سے ہے
رونق شمع شبستان یعنی پروانوں سے ہے
آج ناجنسوں سے اپنی آشنائی یاد کر
پھر اگر فرصت ہو ہم سے بیوفائی یاد کر
صبر کر اس سے بھی بدتر وقت آئے گا کبھی
اپنی تہذیب و تمدن پر نہ کر ماتم ابھی
مٹ نہیں سکتا کبھی سینے سے تیرے غم کا داغ
ڈھونڈتا پھر اب ہمیں تو لیکے ہاتھوں میں چراغ
دل مچلتا ہے کہ آؤں دیکھنے کو ایک بار
وہ چمن جس میں گزارے تھے کبھی لیل و نہار
تیرے کوچوں میں پھروں باغوں میں گھوموں روز و شب
سر کے بل روضوں پہ حاضر ہو سکوں حسب طلب
تیری الفت سے مرا دل آج بھی معمور ہے
طور ہے سینہ مرا اور تو چراغ طور ہے
تیری الفت میری غیرت برسر پیکار ہے
دید کی طالب ہے وہ یہ نام سے بیزار ہے
ہاں مگر آثار ماضی کا تعلق آج بھی
ہم میں باقی ہے جو تو رکھے گا اس کی لاج بھی
یہ بزرگوں کے مقابر اک امانت ہیں مری

یاد رکھنا امتحاں گاہ دیانت ہے تری
رابطہ قائم رہے گا ہم میں گو ہو مختصر
یادگاریں سب رہیں محفوظ تیرے پاس اگر
بس فصیح اللہ کا یہ آخری پیغام ہے
دے سکے تو اس کی الفت کا یہی انعام ہے

خواجہ سہیل احمد انصاری-پانی پتی سرگودھا
کتبہ (اطہر) ۱۶ اپریل ۱۹۶۳ء

پانی پت

انقلاب ۱۹۴۷ء اور مولانا لقاء اللہ عثمانی

"پانی پت اور بزرگان پانی پت" کا یہ تذکرہ جب ختم ہونے لگا تو ضروری معلوم ہوا کہ پانی پت کے موجودہ حالات کا بھی ایک خاکہ پیش کر دیا جائے- کیونکہ یہ بھی تاریخ پانی پت کا ایک مستقل باب ہے- موجودہ پانی پت ان واقعات کا نتیجہ ہے جو انقلاب ۱۹۴۷ء کے وقت پیش آئے تھے- ان واقعات کے مطالعہ سے موجودہ پانی پت کا نقشہ سامنے آجاتا ہے- ۱۹۴۷ء کے واقعات کے متعلق حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی سے زیادہ معتبر اور بہتر راوی کون ہو سکتا ہے- جنہوں نے فہم و بصیرت کی کھلی ہوئی آنکھوں سے ان خونین ہنگاموں کا مشاہدہ کیا تھا- چنانچہ مولانا سے درخواست کی گئی کہ وہ خود اس ہنگامہ کی تفصیلات مرتب فرمائیں-

مولانا ضعف بصارت کے عارضہ کے باعث خود تو قلم بند نہیں کر سکے البتہ اس پر راضی ہو گئے کہ مولانا واقعات بیان کریں- اور حاجی حسام الدین صاحب انچارج شعبہ ریلیف جمعیۃ علماء ہند ان کو قلم بند کر لیں- چند صفحات کے بعد مولانا کا یہی بیان آپ کے سامنے آئے گا- ملاحظہ فرمایئے :-

مولانا لقاء اللہ صاحب کا تعارف

صحافت حاضرہ کا فیشن یہ ہے کہ جس کا بیان شائع کیا جائے ساتھ ساتھ اس کا فوٹو بھی شائع ہونا چاہیے- اسلام نے جب اصنام پرستی کی بنیادوں کو اکھاڑا تو تصویر اور فوٹو کی بھی سخت ممانعت کر دی- لہٰذا فوٹو کے مبہم اور مشتبہ تعارف کے بجائے حضرت مولانا کی اوصافی تصویر موقع کے مناسب معلوم ہوتی ہے جو پیش کی جا رہی ہے-

زندہ دل مولانا لقاء اللہ صاحب جو عمر عزیز کی تقریباً ۷۵ منزلیں طے کرنے کے بعد بھی جوان ہمت ہیں- جب آزادی ہند کی تحریک کی بسم اللہ ہو رہی تھی- آپ اس وقت سے جنگ آزادی کے مرد مجاہد ہیں-

تحریک آزادی کی تمہید تحریک خلافت تھی- اور تحریک خلافت کا پہلا مرد میدان جس نے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے وحشیانہ جیل خانہ کو سب سے پہلے آگے بڑھ کر آباد کیا- یہی خوش وضع حسین و جمیل لقاء اللہ عثمانی تھا- جس کے دور شباب پر ہزاروں حسن قربان ہوتے تھے- ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء تک ۲۷ سالہ دور' اور آج ۱۹۶۳ء تک ۵۳ سالہ دور اس طرح گذرا کہ اس مرد مجاہد کا ہر ایک لمحہ ملک و ملت اور خدمت خلق کے لیے وقف تھا- اور وقف ہے-

۱۹۴۷ء کے ہولناک اور خونین ہنگاموں پر مولانا کو قابو نہیں تھا- نہ ان پر قابو تھا- جو ان ہنگاموں میں گھرے ہوئے تھے- البتہ اپنی ذات پر مولانا کو پورا قابو تھا- چنانچہ سب نے کوچ کیا یا سب کوچ پر مجبور ہو گئے- مگر مولانا تمام مجبوریوں کے باوجود اپنی جگہ استقلال و استقامت کے ناقابل تسخیر کوہ ہمالیہ بنے رہے-

پانی پت کے اس آتش فشاں میں تن تنہا مولانا کا قیام ایک ایسا ہیبت انگیز اور خطرناک اقدام تھا کہ اس نے حکومت کے دماغ کو بھی متاثر کیا- چنانچہ حکومت کی طرف سے مولانا کی حفاظت کے انتظامات کیے گئے- مگر مولانا کی ذات ان تمام تحفظات سے مستغنی تھی-

چند سبق آموز اور قابل تقلید شخصیتیں

۱۹۴۷ء کی بہت سی برائیوں میں کچھ اچھائیاں بھی پائی گئیں- انہیں میں ایک خوبی جو نمودار ہو کر سامنے آئی یہ تھی کہ اس گئے گذرے دور میں بھی اعتماد علی اللہ اور خدا پر بھروسہ کرنے کے نتیجہ کا مشاہدہ ہوا- اور چند ایسی شخصیتیں سامنے آئیں- جنہوں نے کم از کم ہمت و جرات اور اعتماد علی اللہ کے سلسلہ میں سلف صالحین کا نمونہ پیش کر دیا-

مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب رحمتہ اللہ علیہ …
لوگ واقف ہیں- ایسے ہی خان عبدالغفار خاں صاحب کی شخصیت بھی …
شخصیت ہے جو تن تنہا انبالہ میں اقامت گزیں اور ضلع کانگریس کمیٹی کے …
حیثیت سے مصروف عمل رہی- لیکن حضرت مولانا محمد شفیع صاحب …
مدرسہ عبدالرب دہلی- اور حضرت مولانا ضیاء الحق صاحب صدر مدرس …
امینیہ کشمیری گیٹ دہلی سے کوئی واقف نہیں- یہ اپنے اپنے مدرسوں میں …
شب و روز اس وقت اور ان حالات میں مقیم رہے جب اس علاقہ میں کسی …
کے وجود کا تصور بھی لرزہ خیز تھا- پھر یہ کچھ اس طرح گمنامی کے ساتھ تمام …
رہے کہ کسی کو ان کی حفاظت کے کسی انتظام کا خیال بھی نہیں آیا- مگر ان کی …
اپنے رب اور مولیٰ پر تھیں اور وہی ان کا محافظ رہا- خطرات کے طوفان …
ان علاقوں میں زمینیں مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بن گئیں- مگر ان کی …
کسی نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا-

حب وطن

کی اس سے بہتر مثال کیا ہو سکتی ہے جو ان حضرات کے کردار سے …
دوست' احباب' عزیز و اقارب' بیوی بچے' بہن بھائی- سب چھوٹے مگر …
چھوٹا وہ وطن عزیز تھا- کیا اس سے بہتر اور اس سے زیادہ واضح حب وطن کی …
مثال پیش کی جا سکتی ہے-

غم کس بات کا تھا

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے بعد پہلا رمضان آنے والا تھا …
شعبان کی ۲۸/ یا ۲۹ کو حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب دہلی تشریف لائے …
بہت افسردہ تھے- آنکھیں پرنم تھیں- اور صدمہ اس بات کا تھا کہ وہ پانی پت …
رمضان شریف میں کم و بیش ایک ہزار قرآن شریف ہوا کرتے تھے- اس …
وہاں صرف ایک ہے- جو قرآن شریف پڑھنا چاہتا ہے- مگر جماعت اور …

بھی میسر نہیں' مولانا نے اسی مجلس میں یہ بھی ہدایت فرمائی- کہ اگر خدانخواستہ "وقت موعود" آجائے تو دہلی لا کر تجہیز و تکفین کرنا-

قناعت

قناعت کا گر یہ ہے کہ انسان اپنے خرچ کو اپنی آمدنی میں محدود رکھے اور آمدنی نہ ہو تو اس کی خودداری ہر مصیبت جھیلنے کے لیے آمادہ ہو- مگر سوال کی ذلت برداشت کرنے کے لیے کسی وقت تیار نہ ہو-

حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی اس گر سے واقف ہیں- چنانچہ تمام عمر ملی اور ملکی خدمات میں صرف کی- مگر کسی وقت کوئی الاؤنس یا کسی خدمت کا کوئی معاوضہ لینا منظور نہ کیا- جائداد کی معمولی آمدنی ذریعہ معاش تھی- جس کو قناعت کے مذکورہ بالا گر نے بابرکت بنا دیا تھا-

۱۹۴۷ء کے اس ہنگامی دور میں جب کہ آمدنی کے تمام ذرائع مسدود تھے- مولانا کو اپنی ضروریات کے لیے بہت کچھ پریشان رہنا پڑا- آخر میں یہ طے کیا گیا کہ مبلغ پچاس روپیہ ماہانہ چند ماہ تک بطور قرض دیئے جائیں- شاید دو ماہ ہی اس طرح قرض کی نوبت آئی تھی- کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب پیدا کر دیئے- اور اب مولانا نے قرض لینے کے بجائے اس کی ادائیگی کا انتظام شروع کر دیا-

مولانا کا اثر غیر مسلموں پر

ہمدردی و غمخواری' خدمت خلق' خودداری قناعت اور خدا پر بھروسہ' وہ جوہری صفات ہیں جو نہ صرف دوستوں بلکہ دشمنوں اور مخالفین کو بھی متاثر کرتے ہیں- چنانچہ مولانا لقاء اللہ جو غیروں کی نظر میں چند روز قبل قابل نفرت تھے کچھ دن گزرنے نہیں پائے تھے کہ یہی مولانا لقاء اللہ ان کی آنکھ کا تارا بن گئے جن کے دلوں میں نفرت کے تنور دہک رہے تھے-

پانی پت میں کہنے کو مولانا تنہا تھے- مگر حالت یہ تھی کہ وہی نفرت کرنے والے معتقد بن کر آتے اور رات دن مولانا کو گھیرے رکھتے تھے- ابھی آفتاب پوری

طرح طلوع نہیں ہوتا تھا کہ رفیوجی بھائیوں کی عورتیں اور بچے دعائیں پڑھوانے اور تعویذ لینے کے لیے حاضر ہو جاتے تھے۔

ایک واقعہ خود مولانا کی زبان سنئے اور اس مقبولیت کا اندازہ کیجئے۔ جو مولانا کو چند ماہ کے اندر ان اجنبی، غیر ملکی شرنارتھیوں میں حاصل ہو گئی تھی۔

مولانا نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا ہے :-

> جب میں خرچ سے تنگ تھا۔ اور جمعیۃ علماء یا مجلس سنی اوقاف میں ملازمت کا کچھ خیال پیدا ہوا تھا۔ شاید کبھی زبان پر بھی آگیا ہو۔ بہر حال کچھ لوگوں کو اس کا علم ہو گیا۔
>
> ایک روز صبح کو جناب حکیم سنت لال صاحب خانوال والے چند ہندو رفیوجیوں کے ساتھ میرے پاس آئے۔ اور دریافت کیا کہ کیا آپ پانی پت چھوڑ رہے ہیں۔ میں نے جواب اثبات میں دیا۔ تو یہ بے قابو ہو کر رونے لگے اور ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پھر ہاتھ جوڑ کر کہاں کہ ہم غریب آدمی زیادہ خدمت نہیں کر سکتے۔ البتہ اتنا کر سکتے ہیں کہ پچاس روپے ماہانہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے رہیں۔ پھر کہنے لگے کہ آپ نے جانے کا ارادہ کیا تو آپ کا تانگہ ہم مردوں، عورتوں، جوان، بوڑھوں اور بچوں کی چھاتیوں پر سے گذر کر اسٹیشن پہونچ سکتا ہے۔

مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ ان صاحبان کی اس درد مندانہ فرمائش کا اثر میرے اوپر یہ ہوا کہ میں خود بھی رونے لگا۔ ان سب کو سینے سے لگایا اور اطمینان دلایا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ میں یہاں اس لیے ٹھہرا ہوا ہوں کہ یہیں میری موت آئے اور اسی خاک پاک میں میری قبر بنے۔

یہ ہیں --- مولانا لقاء اللہ عثمانی جن کا بیان آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ جس سے اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک کے حالات کا علم ہو جائے گا۔

حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب کا بیان

فساد کی ابتداء

آخر اگست ۱۹۴۷ء سے پاکستانی شرنارتھیوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ جو روز بروز بڑھتی رہی۔ ستمبر شروع ہوا تو پانی پت کی فضا خراب ہونے لگی۔ گاندھی جی کی یہ خواہش ضرور تھی، اور دلی جذبہ کے ساتھ تھی کہ پانی پت میں امن رہے۔ مگر حالات دن بدن بگڑ رہے تھے۔ اوائل اکتوبر میں پانی پت کی فضا کو درست اور حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا ابو الکلام صاحب آزاد اور پنڈت نہرو کو توجہ دلائی گئی۔ وہاں سے جب کوئی جواب نہ آیا۔ تو تر دو بڑھ گیا۔ اور اپنے چھوٹے بھائی حاجی وقاء اللہ کو نہایت خطرناک حالات میں دہلی بھیجا۔ انہوں نے میرا خط اور یہاں کے حالات مولانا آزادؒ کے سامنے پیش کیے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا محمد میاں[1] صاحب اور حافظ محمد نسیم صاحب بٹن والے اور دیگر اراکین جمعیۃ علماء ہند اس گفتگو میں شریک تھے۔ ۲۹/ اکتوبر تک جب کوئی صاحب تشریف نہ لائے۔ اور شرنارتھیوں کی کثرت کی وجہ سے خطرہ بڑھ گیا۔ شہر پانی پت سے باہر مسلمان قتل کیے جانے لگے۔

تو میں خود ۳۰/ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو چودھری ناصر علی خاں صاحب کو ساتھ لے کر دہلی پہونچا۔ حالات انتہائی خطرناک تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ سے بات چیت ہوئی۔ دوسرے روز مولانا آزادؒ سے ملاقات ہوئی۔ غور و فکر ہو ہی رہا تھا کہ ۳ نومبر کو اطلاع ملی کہ پانی پت میں عام

۱- غالباً سید محمد صاحب جعفری کی جگہ میرا نام لکھا گیا ہے۔ یہی غلطی اور جگہ بھی ہوئی ہے۔ محمد میاں

قتل و غارت گری شروع ہو گئی ہے- اور محلہ انصاریان و راجپوتان مسلمانوں سے خالی کرا لیا گیا- اور یہاں کے مسلمانوں کو محلہ مخدوم زادگان اور محلہ افغانان میں منتقل کر دیا گیا ہے- اور اس طرح کہ جو شخص جہاں تھا سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ وہاں سے نکال دیا گیا- کوئی سامان ساتھ نہ لے سکا- اس کی اطلاع فوراً مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کو دی گئی-

مجھ کو مولانا آزاد نے دوسرے روز بلایا- چنانچہ میں مولانا حفظ الرحمن صاحب-، مولانا احمد سعید صاحب، مولانا عتیق محمد میاں صاحب، حاجی محمد نسیم صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، حافظ فیاض احمد صاحب اور دوسرے حضرات جو پانی پت سے وطن ہونے کا تعلق رکھتے تھے- ان کی ایک بڑی جماعت مولانا آزادؒ کی خدمت میں پہونچی- مولانا موصوف کو حالات سنائے- بہت غم اور اندوہ کے ساتھ مولانا موصوف نے فرمایا آہ "میرا پانی پت" لٹ گیا-

امن کی کوشش

۵/ نومبر کو مولانا آزادؒ نے پنڈت نہرو سے ملاقات کی- پنڈت جی دفتر تشریف لے جا رہے تھے انہوں نے فرمایا- کہ ایک دو آدمیوں کو میرے پاس دفتر میں بھیج دو- جو وہاں کے حالات تفصیل سے بتلا دیں-

چنانچہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور غالباً حافظ فیاض احمد صاحب دفتر پہونچے اور پنڈت جی کو تفصیلی حالات سنائے-

۵/ نومبر کو ہمارا وفد پھر مزید حالات سنانے کے لیے مولانا آزادؒ کے مکان پر پہونچا- اور مولانا آزاد نے گاندھی جی سے ملاقات کا وقت مقرر کرنا چاہا- گاندھی جی نے فوراً ہی بلا لیا- گاندھی جی نے بڑی تپاک سے استقبال کیا- اور محبت بھرے انداز میں فرمایا "بھائی لکاء اللہ (لقاء اللہ) بہت مدت کے بعد ملاقات (ملاقات) ہوئی- ہم کو بٹھایا- ہم نے پانی پت کے حالات سنانے شروع کیے- مولانا ابوالکلام آزادؒ کو پانی پت کے برباد ہو جانے کا بہت قلق تھا- کیونکہ وہ اس گئے گذرے

میں بھی تجوید و قرات اور تعلیم قرآن کا بہت بڑا مرکز تھا- مولانا کی زبان سے اس وقت بھی یہ جملہ بے ساختہ نکلا "ہائے میرا پانی پت" گاندھی جی اس سے بھی متاثر تھے اور ان کو اس بنا پر بھی افسوس تھا کہ پانی پت صنعت اور دستکاری کا بھی ایک مرکز تھا-

تمام حالات سنانے اور بات چیت کے بعد میں نے چلتے ہوئے مہاتما گاندھی کو ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کی بربادی پر مبارکباد دی- اس پر مہاتما جی نے بہت جوش و جذبے میں تقریباً ڈبڈبائی آنکھوں سے جس کا اثر تمام حاضرین نے محسوس کیا- فرمایا کہ "میں تو پٹیل سے کہتا ہوں کہ چل پنجاب کو دیکھ تیری بدولت کیا ہو رہا ہے-" تاہم ۱۱/ نومبر ۱۹۴۷ء کو پانی پت تشریف لانے کا وعدہ کیا-
ریلیف سکریٹری کو پہلے تنبیہ کی کہ پانی پت کے حالات نہیں معلوم کیے مجھے کل تک اطمینان دلاتے رہے- کہ وہاں کچھ نہیں ہے- اب مولانا لقاء اللہ صاحب سے کچھ حالات معلوم ہوئے- پھر ہدایت کی کہ آپ خود مولانا لقاء اللہ صاحب کے ساتھ پانی پت جائیں اور وہاں کے حالات کی صحیح رپورٹ پیش کریں-

یہ بھی سنا گیا تھا کہ ۶/ نومبر کو صبح کو مہاتما گاندھی پانی پت آنے کے لیے تیار ہو گئے تھے- گاڑی بھی منگالی- مگر جب کیبنٹ کے اراکین کو معلوم ہوا- تو گاندھی جی کے پاس پہونچے- اور اس طرح دفعتہً بلا کسی انتظام کے جانے سے بمشکل باز رکھا-

بہر حال سردار گورچن سنگھ ریلیف سکریٹری اور کچھ اور ساتھیوں کے ساتھ میں ۶/ نومبر کا دن گذار کر رات کو ۱۱ بجے پانی پت پہونچا- کرفیو کی وجہ سے رات کو لالہ بھیم چند کے یہاں قیام کیا- صبح گھر پہونچا- یہ لوگ بھی ساتھ تھے- پورا محلہ ایک کیمپ بنا ہوا تھا- اور آہ و فغاں کی صدائیں ہر طرف سے سنائی دے رہی تھیں- ہمارے پہونچنے کے ساتھ ہی ایک امریکن ڈاکٹر (جو بہت شریف اور ہمدرد انسان تھا) زخمیوں کی مرہم پٹی اور علاج کے لیے پانی پت پہونچ گیا تھا- مسلم حالی ہائی اسکول میں شفاخانہ قائم کیا گیا- اور امریکن ڈاکٹر نے بہت ہمدردی سے زخمیوں کا علاج کیا-

یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ۵ / نومبر کو جب پانی پت میں یہ خبر پھیلی کہ یہاں مہاتما جی آنے والے ہیں- تو اس وقت کے بعد سے قتل کا حادثہ کوئی وقوع میں نہیں آیا-

مسلمانوں کی پریشانی

۷ / نومبر کو پانی پت میں عام طور پر معلوم ہوا کہ کرفیو کی وجہ سے آٹے کی مشینیں بند ہیں- نہ کہیں غلہ اور آٹا مل رہا ہے اور نہ تیل دستیاب ہو رہا ہے- شہر میں کسی کے پاس بھی آٹا نہیں، چنے اور گیہوں ابال کر لوگ کھا رہے ہیں- نمک، تیل، گڑ کوئی چیز بھی نہیں ہے سب بند ہیں- کہا جاتا ہے کہ شہر کے دوکانداروں نے فیصلہ کر لیا تھا- کہ اگر کسی مسلمان کے ہاتھ ایک پیسہ کی چیز بھی فروخت کی گئی تو پانچ روپے جرمانہ کیا جائے گا-

ڈپٹی کمشنر علاقہ مسٹر روشن لال اور راشن کنٹرول آفیسر نے فوراً چکی چلانے والا تیل کافی مقدار میں میرے حوالے کیا- اور چکی چلانے والوں پر سے کرفیو ہٹادیا گیا- تاکہ رات کو چکیاں چل سکیں- غلہ کی دوکانیں قائم کی گئیں- اور حمد اللہ ۸ / نومبر کو مسلمانوں کو روٹی نصیب ہو سکی-

عجیب بات یہ ہوئی کہ دال، نمک، گڑ وغیرہ ضرورت کی چیزیں جن سے مسلمان محروم ہو گئے تھے وہ رفیوجیوں نے فراہم کیں- اور قلندر صاحب کے چوک میں دوکانیں لگا کر بیٹھ گئے- مسلمان ان سے خوف زدہ تھے- وہ اپنی ضرورت کی چیزیں دیکھتے تھے مگر وہاں جاتے ہوئے ان کو وحشت ہوتی تھی- انہوں نے مجھ سے شکایت کی- میں اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر اور تھانہ دار وغیرہ افسران کو لے کر وہاں پہونچا- ہم نے ان دوکاندار شرنارتھیوں سے گفتگو کی- ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ غریب بھی اپنی ضروریات فراہم کرنے کے لیے یہاں بیٹھے ہیں- چنانچہ ہم نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے- وہ بھی تمہاری طرح ضرورت مند ہیں- وہ تمہاری ضرورت کی چیزیں تمہارے ہاتھ بیچ کر اپنی ضرورتوں کے لیے پیسے کمانا

چاہتے ہیں- آپ اطمینان سے جائیں اور خرید و فروخت کریں- بہر حال نو دس دن کے بعد مسلمانوں کو ان کی ضرورت کی چیزیں میسر آئیں- اور لطف یہ ہے- کہ انہیں شرنارتھیوں کے ذریعہ جو ان کے خون کے پیاسے بن کر یہاں پہنچے تھے-

کفن کے لیے کپڑا اور عام طور پر مٹی کا تیل اور نمک کی ضرورت پورا کرنے کے لیے شہر کے سب جج وغیرہ متعین کیے گئے- اور شہری انتظام ٹھیک طور پر چلنے لگا-

گاندھی جی کی آمد

۱۱ / نومبر کو حسب وعدہ مہاتما گاندھی، حضرت مولانا آزادؒ مولانا احمد سعید صاحبؒ، مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ سید محمد صاحب جعفریؒ حافظ محمد نسیم صاحب بٹن والے- اور جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے ذمہ دار حضرات پانی پت تشریف لائے- یہاں کے حالات کا جائزہ لیا- لالہ کھیم چند جو یہاں کی کانگریس کے بڑے لیڈر تھے- ان سے دریافت کیا- کہ آپ لوگوں کی مسلمانوں سے کیسی گذرتی تھی- ابھی وہ جواب دینے بھی نہیں پائے تھے کہ ایک وکیل صاحب بول پڑے- ہمیشہ لڑائی جھگڑے میں- تب لالہ کھیم چند نے فرمایا- کہ ہماری لڑائی دو بھائیوں کی لڑائی ہوتی تھی- صبح کو لڑے اور شام کو گلے مل لیے- اور ہمارے تعلقات آپس میں بہت اچھے تھے- مسلمانوں میں سے ایک صاحب نے حکام کی مدح سرائی شروع کر دی جو خلاف واقعہ تھی- لوگوں کو اچھا معلوم نہیں ہوا- تاہم مہاتما جی پورے حالات سے باخبر ہو کر واپس تشریف لے گئے- اور مسلمانوں کا انخلاء کنوائے کے ذریعہ جو پاکستان سے آئے تھے شروع ہو گیا-

تعجب

ایک بات بہت تعجب کی ہے کہ مسلم لیگ والے میرے سخت مخالف تھے- حتیٰ کہ قتل کرنے کے لیے تیار تھے- لیکن پاکستانی حکومت اور اس کے افسران کو جب یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے پاس آٹا اور دیگر ضروریات کی چیزیں نہیں ہیں-

تو انہوں نے تقریباً ۱۵ بوری آٹا اور مریضوں کے لیے ڈاکٹری ادویات میرے ہی نام بھیجیں- اور خاص طور پر وہاں کے ریلیف کمیٹی کے افسر نے مجھ کو خط لکھا کہ یہ تمام چیزیں آپ اپنے طور سے مسلمانوں میں تقسیم کرائیں-:

مسلمانوں کے انخلاء کا فیصلہ

رفتہ رفتہ کنوائیوں کے ذریعہ انخلاء ہو رہا تھا- پاکستانی دوست اگرچہ مجھ سے خفا بھی تھے اور غالباً یہ بھی صحیح ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرتے تھے- مگر ساتھ ہی مجھ پر اعتماد بھی اتنا تھا کہ انخلاء کی صورتوں کے متعلق پاکستانی فوجی افسران مجھ سے ہی مشورہ کرتے تھے- حالانکہ میرے مکان کے نیچے کھڑے ہوئے مسلمان بہانگ دہل کہا کرتے تھے کہ یہ شخص باغی ہے' غدار ہے' کافر ہے- یہ افسر یہ تمام آوازیں سنتے تھے مگر ان کو اطمینان میری ہی بات سے ہوتا تھا- اور جب تک بات پوری نہیں ہوتی تھی یہ واپس نہیں ہوتے تھے-

ایک روز ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان تشریف لائے ان کے ساتھ ڈپٹی کمشنر علاقہ اور کچھ فوجی افسران تھے- حضرت شاہ قلندر صاحب کے نقار خانے پر سازشیوں نے مسلمانوں کو جمع کر کے دریافت کیا کہ آپ لوگ یہاں رہنا چاہتے ہیں- یا پاکستان جانا چاہتے ہیں- اور یہ بھی کہا کہ پاکستان جا کر کوئی جنت نہ ملے گی- وہاں حلوا پوری تیار نہیں رکھی ہے- اس پر زیادہ بار نہ ڈالو- اور خود پریشان ہو کر پاکستان کو پریشانی میں مبتلا نہ کرو- مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس کے برخلاف مسلمانوں سے ایک درخواست حاصل کی گئی- کہ ہم سب پاکستان جانا چاہتے ہیں- صرف میں نے پاکستان جانے سے انکار کیا- ڈپٹی ہائی کمشنر نے تنہائی میں مجھ سے بہت سی باتیں کیں- لیکن اس وقت میں نے یہ فیصلہ نہیں کیا تھا- کہ میں پانی پت ہی میں قیام کروں گا- یا کسی دوسری جگہ رہوں گا-

دیہاتی مسلمان اور ان کا انخلاء

اس اطلاع پر کہ پانی پت کے مسلمان پاکستان جا رہے ہیں دیہات کے

مسلمانوں میں انتشار پیدا ہوا (دیہات کے اکثر مسلمانوں نے ڈر اور خوف کی وجہ سے جو پاکستان سے آنے والے شرنارتھیوں نے پھیلا دیا تھا- اپنے آپ کو ہندو ظاہر کیا) فسادات کے زمانہ میں پنجاب میں بہت خطرناک سیلاب آیا تھا- اب یہ سیلاب کم ہو گیا تھا- تو ایک روز تقریباً (۷۰) ستر دیہات کے یہ خوف زدہ مسلمان اپنے تعلق کے ہندو جاٹوں کے ہمراہ پانی پت آئے- اور انہوں نے مجھ سے آکر کہا کہ ہمارا کیا حشر ہوگا- کیا ہم مرتد ہو کر یہاں رہیں گے یا ہم بھی پاکستان جا سکتے ہیں- دوسرے روز بھی اسی قدر دیہات کے مرتد مسلمان آئے- مگر تیسرے روز بہت زیادہ تعداد میں لوگ آئے' اس وقت کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ان کا کیا حل ہو- چونکہ میں خود بھی متردد تھا کہ میں دہلی رہوں جیسا کہ مہاتما جی اور جمعیۃ علماء ہند کے اکابرین کی خواہش تھی یا کیرالہ یا حیدر آباد قیام کروں جہاں سے دوست و احباب کا سخت تقاضا تھا- پانی پت رہنے کا خیال اس وقت تک پختہ نہیں تھا-

سکون

تیسرے روز رات کو میں کچھ سو رہا تھا کچھ جاگ رہا تھا- بہرحال غنودگی طاری تھی- کہ ایک متین و حسین چہرہ دکھائی دیا- اور اس نے تنبیہ کی کہ "مسلمانوں کی خدمت کا وقت اب ہے-" مار کاٹ اور شرنارتھیوں کی بربریت و مظالم کی وجہ سے میرا ابھی دل مطمئن نہیں تھا- لیکن ان الفاظ کے بعد میرے دل میں سکون پیدا ہو گیا- اور وحشت و پریشانی وغیرہ سب کافور ہو گئی- اور یہ عزم پختہ ہو گیا کہ مجھ کو یہاں پانی پت ہی میں رہنا ہے-

صبح کو نماز کے بعد میں نے اپنے ایک عزیز دوست سے ذکر کیا- کہ اب میں کہیں نہیں جاؤں گا- بلکہ پانی پت ہی رہوں گا- میرا بھائی (وقاء اللہ) جو دہلی سے بعض بے یار و مددگار عورتوں کو لے کر ہوائی جہاز سے پاکستان چلا گیا تھا- اگر وہ موجود ہوتا تو اپنے اس عزم کی اطلاع اس کو دیتا- اس دوست کو نہ دیتا- کیونکہ وقاء اللہ صرف میرا بھائی نہ تھا- بلکہ وہ میرا دوست بھی تھا-

اب میرے دماغ میں دو خیال گھوم رہے تھے (۱) مغویہ عورتوں کی واپسی اور (۲) مرتد مسلمانوں کی واپسی یا ان کا پاکستان بھیجنا- اس سلسلہ میں کوئی رائے پختہ نہیں ہوئی تھی کہ پانی پت کے مسلمانوں کے انخلاء کا متفقہ آخری فیصلہ ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان کے سامنے ہو گیا تو میں پھر دوبارہ پنڈت مادھورام اور دیگر کانگریسی دوستوں کو ساتھ لے کر دہلی گیا- رات کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اور مولانا احمد سعید صاحبؒ سے ملاقاتیں کیں- اور ان کو مسلمانوں کا فیصلہ سنایا- یہ آخری نومبر یا دسمبر کی پہلی دوسری تاریخ کا واقعہ ہے-

صبح کو مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا احمد سعید صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسینؒ- مولانا محمد میاں صاحب، حافظ محمد نسیم صاحب وغیرہ کے ساتھ مہاتما گاندھی کے یہاں پہونچے- مہاتما جی نے فرمایا کہ بھائی لقاء اللہ اب کیوں آئے ہو؟ میں نے جواب دیا- کہ پانی پت کے مسلمان رہنا نہیں چاہتے اور پاکستان جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں- میری خواہش اور درخواست ہے کہ آپ ان کو رخصت کر دیں- انہوں نے ۴/ دسمبر کی تاریخ مقرر کی ہے- اس کے بعد میں نے پلاپیار کر درخواست کی کہ میں آپ سے ایک بھیک مانگتا ہوں- انہوں نے کہا کہ فرمائیے- تو میں نے مسلمان مغویہ عورتوں کی بازیابی اور دیہاتی مسلمانوں کے انخلاء کے بندوبست کرنے کی درخواست کی- مہاتما جی نے کہا- کہ مغویہ عورتوں کی واپسی تو بہت ہی ضروری ہے وہ آپ لے سکتے ہیں- لیکن مسلمانوں کا اپنے گھروں کو چھوڑ کر جانے کا نہ میں پہلے حامی اور موید تھا اور نہ اب ہوں- اسی طرح ہندوؤں کا پاکستان سے آنے کا نہ میں پہلے حامی تھا- نہ اب ہوں- یہ سلسلہ دونوں ملکوں کے لیے تباہ کن ہے-

کانگریسی دوستوں کی غلط بیانی

پنڈت مادھورام کے ساتھ مہاتما گاندھی کے یہاں میرے دوست اور عزیز دیش بندھو گپتا بھی موجود تھے- مہاتما جی نے دیش بندھو گپتا سے پوچھا- کہ تم مسلمانوں کو نہیں رکھ سکتے- اس نے جواب دیا- کہ ہم نے بہت کوشش کی لیکن

مسلمان نہیں مانے اور نہیں رک سکے- میں نے فوراً جواب میں کہا کہ دیش بندھو تم غلط کہتے ہو تم وہی ہو- لالہ کھیم چند، لالہ روشن لال، سردار گوربچن سنگھ وغیرہ ۸/ نومبر کو میرے مکان پر موجود تھے- میں نے ان لوگوں سے خود کہا کہ آپ لوگ اگر مسلمانوں کو روکنا چاہتے ہیں تو ایک عام جلسہ بلائیے اور اس میں کھلے دل سے پچھلے کردار کی معذرت کیجئے- اور آئندہ کے لیے ان کو اطمینان دلائیے- مسلمان یقیناً رک جائیں گے- مگر ایسا اجتماع آج تک نہیں ہوا- اس پر مہاتما جی کو بہت غصہ آیا- اور انہوں نے دیش بندھو گپتا کے متعلق بہت سخت الفاظ استعمال کیے-

۴/دسمبر کو مہاتما گاندھی کی تشریف آوری

مہاتما جی نے ۴/دسمبر پانی پت کے لیے مقرر کی تھی- وہ پانی پت تشریف لائے- دوسرے روز حالات سنے- میں نے بالکل کھل کر واضح طور پر حکام اور مقامی لوگوں کے متعلق (جس میں کانگریسی دوست بھی شامل تھے) وہ سب کچھ صاف صاف کہدیا جو میں کہہ سکتا تھا- یہ سب لوگ اس وقت موجود تھے- ان کے علاوہ وزیراعلیٰ پنجاب شری بھارگو اور دوسرے وزراء پنجاب بھی موجود تھے-

ہتھیار

مقامی حکام نے کچھ ہتھیاروں کی بھی نمائش کی- اور الزام یہ لگایا کہ یہ ہتھیار مسلمانوں کے یہاں سے برآمد کیے گئے ہیں- حالانکہ یہ ہتھیار خود شرنارتھی حضرات اور پولیس والوں نے کرفیو کے زمانے میں کہیں باہر سے جمع کیے تھے- البتہ معمولی چاقو اور ترکاری کاٹنے والی چھریاں ضرور مسلمانوں کے یہاں سے برآمد ہوئی تھیں- جن کو آلات حرب سے تعبیر کیا گیا- اس نمائش پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں ان سے زیادہ سخت ترین ہتھیار ہندوؤں کے یہاں سے برآمد کرا سکتا ہوں یہ ہتھیار اس طرح برآمد کیے گئے ہیں کہ کرفیو لگا ہوا تھا، حکام کے پاس ہتھیار موجود تھے- اور مشہور کر دیا گیا کہ یہ مسلمانوں کے مکانات سے نکلے ہیں- یہ میرا بیان تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہا جس کو عزیزہ اندرا

گاندھی (دختر پنڈت جواہر لال نہرو) نے پورے طور پر نوٹ کیا۔

اسپیشل ٹرینوں کا انتظام

۵/دسمبر کو پہلی اسپیشل روانہ ہوئی اس میں مسافر بھس کی طرح بھرے گئے تھے۔ اور ستم یہ کہ وہ لیگی کارکن جن کو ٹکٹ دیئے گئے تھے۔ کہ جانے والوں کو تقسیم کردیں' انہوں نے فی ٹکٹ ایک روپیہ نذرانہ وصول کیا تھا۔

۷/دسمبر کو ڈپٹی کمشنر صاحب کرنال تشریف لائے اور انہوں نے فرمایا کہ مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ کو یہ اطلاع کردوں۔ کہ پرسوں والی اسپیشل ٹرین خیریت لاہور پہونچ گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے عرض کیا۔ کہ وہ پانچ مسلمان جو مرے ہیں ان کے انتقال کی رپورٹ کہاں ہے۔ اس پر وہ بہت سراسیمہ اور پریشان ہوئے اور کہا کہ ٹھیک ہے۔ پھر دریافت کیا کہ مسلمانوں کی روانگی میں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ میں نے توجہ دلائی کہ مسلمانوں کو گاڑی میں بھس کی طرح بھرا جارہا ہے یہ کوئی انسانیت نہیں ہے تو انہوں نے بہتر انتظام کا وعدہ کیا۔ اور مجھ سے کہا کہ چل کر دیکھ لو کہ گاڑی میں مسافروں کو آرام سے جگہ دی گئی ہے۔ چنانچہ میں اسٹیشن گیا۔ اسٹیشن سے دور فاصلہ پر اسپیشل کھڑی کی جاتی تھی۔ میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب کو دکھلایا کہ مسافر زیادہ ہیں۔ چنانچہ فوراً دوسری خالی گاڑی اسٹیشن ماسٹر سے طلب کر کے لگوائی گئی۔ اور ایک گاڑی کے بجائے دو گاڑیوں میں وہ مسلمان سوار ہو کر جاسکے۔ اور اسی طریقے سے گاڑیاں روانہ ہوتی رہیں۔ ۹/دسمبر کو آخری اسپیشل روانہ ہوئی۔ اسپیشل گاڑیاں علاقہ مجسٹریٹ اور میرے دستخط سے لگائی۔ اور روانہ کی جاتی تھیں۔

اب پانی پت میں میرے گھر کے سوا کوئی مسلمان نہیں تھا۔ دس بارہ مسلمان اور تھے جو میرے ہی مکان پر مقیم تھے۔ اور بعد میں یا تو پاکستان چلے گئے یا دہلی وغیرہ میں جاکر مختلف جگہ آباد ہوگئے۔

پانی پت کے مسلمانوں کے انخلاء میں پاکستانی افسران کپتان محمد اصغر' جنرل

فخر الدین صاحب نے بہت خوش اسلوبی اور بہت ہمدردی کے ساتھ امداد فرمائی۔ میں اپنی کمزوری کی وجہ سے باہر دیہات میں نہیں جاسکتا تھا۔ تو میرے بھائی وقاء اللہ نے مغویہ عورتوں کے برآمد کرنے اور دیہاتی مسلمانوں کو پاکستان روانہ کرنے کا کام بہت مستعدی سے کیا۔ ایک مقامی سکھ دوست نے بھی بڑی تن دہی' جانفشانی اور پوری ہمدردی سے اس کام کے انجام دینے میں عزیزم وقاء اللہ کی مدد کی۔

پانی پت اور دیہات میں فساد کا ذمہ دار کون تھا؟

پانی پت اور اس کے دیہات میں جو کچھ ہوا مجھے یقین ہے کہ وہ کانگریسی لوگوں کے مشورے اور ایماء سے ہوا۔ ڈاکٹر کپور جو پانی پت ضلع کے کانگریس کے سکریٹری تھے۔ انہوں نے تمام دیہات اور قرب وجوار میں دورہ کیا اور تمام جاٹوں اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف ورغلایا۔ جب مردولا سارابائی اور دوسرے حضرات دریافت حال کے لیے پانی پت آئے تو مجھ سے پوچھا۔ اس وقت ڈاکٹر کپور موجود تھے۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کردیا۔ کہ ان حضرت سے دریافت کیجئے جن کا یہ سب کیا دھرا ہے تو مردولا سارابائی کو بہت غصہ اور افسوس ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ڈاکٹر کپور کو وہاں سے ہٹادیا گیا۔ مگر افسوس بعد از وقت۔

ایک لطیفہ

اکثر مسلمان انخلاء کے وقت اپنے مکانوں پر لکھ گئے تھے کہ مالک مکان لقاء اللہ ہے۔ چنانچہ شرنارتھیوں اور رفیوجیوں کا میرے مکان پر تانتابدھ گیا۔ کہ فلاں مکان ہم کو دیدو' یہ سلسلہ بہت دنوں تک جاری رہا۔

انخلاء مسجد ودرگاہ حضرت مخدوم شاہ

جب رمضان شریف قریب آیا تو میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب کو درخواست دی کہ میں رمضان شریف میں درگاہ میں تراویح اور قرآن شریف پڑھنا چاہتا ہوں۔ درگاہ ومسجد خالی کرادی جائے۔ اس وقت مسجد ودرگاہ شریف اور اس کے سارے مکانات وجگہ شرنارتھیوں سے بھری پڑی تھی۔

مسجد میں نماز اور گرنتھ صاحب

میری درخواست منظور ہوگئی چونکہ مسجد میں سکھوں کا گرنتھ رکھا ہوا تھا- اس کے منتقل کرنے کے لیے کوئی جگہ مناسب نہیں ملی تو اس کو مدرسہ میں منتقل کر دیا گیا- اور رمضان شریف میں خدا کے فضل سے اطمینان سے قرآن شریف اور تراویح ادا کی گئیں- بریلی کے ایک حافظ صاحب جو دہلی میں موجود تھے میں ان کو جا کر لے آیا تھا- انہوں نے قرآن شریف سنایا- رمضان شریف کے بعد گرنتھ پھر مسجد میں آ گیا- اور ہر سال ایسا ہی ہوتا رہا- کہ رمضان شریف میں گرنتھ مدرسہ میں رکھ دیا جاتا اور بعد اختتام قرآن شریف و تراویح پھر مسجد میں آ جاتا- ۱۹۵۶ء میں جب بالکل انخلاء ہوگیا تو اس وقت سے مسجد میں نماز باجماعت اور قرآن پاک و تراویح باقاعدہ ہو رہی ہے- بہر حال ناغہ کبھی نہیں ہوا- (وللہ الحمد)

ایک کرامت

درگاہ حضرت مخدوم صاحب میں ایک شرنارتھی خاندان آباد تھا- جس کا ایک نوجوان لڑکا دق کا سخت مریض تھا- اور اس کی چارپائی حضرت مخدوم شاہ صاحبؒ کے مزار کی پائتی میں پڑی تھی- جب میرا آنا جانا مسجد میں ہونے لگا تو مجھسے دعا کے لیے فرمائش کی گئی کہ مولوی صاحب اس مریض کے لیے دعا کر دیجیے کہ اچھا ہو جائے- میں نے کہا میرا ایک کہنا مان لو کہ اس کی چارپائی درگاہ سے باہر بچھا دو- اور روزانہ درگاہ میں چراغ جلاؤ- مریض اچھا ہو جائے گا- سردار جی میری بات سے متاثر ہوئے- اور میری ہدایت پر عمل کیا- خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ مریض دن بدن اچھا ہونے لگا- اس شخص نے کچھ دنوں بعد جب عرس کے دن آئے تو درخواست کی کہ میں نے منت مانی تھی کہ درگاہ پر چادر چڑھاؤں گا- لہٰذا چادر چڑھوا دو- چادر چڑھوا دی گئی- اور اس طرح عرس کی صورت نکل آئی اور عرس بھی ناغہ نہیں ہوا-

عرس قلندر صاحب

۸/۹/ رمضان شریف جولائی ۱۹۴۸ء کو محمد یونس صاحب مالک جامعہ ہوٹل دہلی کچھ کھانا پکوا کر جس میں بریانی اور شیرمال تھے- ۸/۱۰ ہمراہیوں کے ساتھ پانی پت آئے- ان کو پولیس نے روک لیا- اور تھانہ لے گئے- وہاں ان سے پوچھ گچھ کی گئی تو انہوں نے کہا کہ ہم پاکستانی نہیں ہیں' بلکہ دہلی سے درگاہ پر نیاز چڑھانے آئے ہیں- اور کوئی مقصد ہمارا نہیں ہے- مولانا لقاء اللہ صاحب کے مکان پر ٹھہریں گے چنانچہ ان کو چھوڑ دیا گیا- رات کو درگاہ قلندر شاہ میں ایک معمولی سا عرس ہوا- اور کھانا تقسیم کر دیا گیا-

یہ لوگ رات کو میرے مکان پر آگئے تو مشہور کر دیا گیا کہ پاکستانی لوگ آئے ہوئے ہیں- چنانچہ میرے مکان پر شرنارتھیوں کی بھیڑ لگ گئی- جب میں نے ان کو سمجھایا کہ یہ لوگ دہلی سے آئے ہیں' پاکستانی نہیں ہیں- تب وہ لوگ واپس ہوئے- اور اس طرح عرس حضرت قلندر صاحب کی صورت نکلی- ان دونوں بزرگوں کا عرس کسی سال بھی ناغہ نہیں ہوا-

ایک غلط خبر

۱۴/ فروری ۱۹۴۸ء کو ایک شخص مسمی ظہور پانی پتی کا پاکستانی اخبارات میں بیان شائع ہوا کہ پانی پت کے قلندر شاہ کی درگاہ کے کسوٹی کے ستون نکال لیے گئے ہیں- اور مولانا غوث علی شاہ صاحب کے مزار کا گنبد مسمار کر کے صاف کر دیا گیا- اس بیان کے شائع ہونے کے چار پانچ روز بعد فروری کے آخر میں کرنل فخر الدین صاحب پانی پت تشریف لائے- ان کے ساتھ کسٹوڈین پانی پت اور ضلع کرنال کے کچھ افسران بھی تھے- انہوں نے دونوں جگہ کا معائنہ کیا اور بالکل مطمئن ہو گئے- انہوں نے درگاہ غوث علی شاہ صاحب پر ایک کیمپ قائم کر دیا- جہاں دیہاتی مسلمان جمع ہوتے تھے- جہاں سے پاکستان روانہ کیے جاتے تھے- اسی طرح کرنال میں مغویہ عورتوں کا ایک کیمپ بنایا گیا تھا-

خواتین کی بازیابی اور مذہبی آزادی

اس سے قبل ۱۸ جنوری کو ایک مرتبہ پھر گاندھی جی کے پاس دہلی گیا- اور ان کو مغویہ مسلمان عورتوں کی بازیابی' اور دیہاتی مسلمانوں کے انخلاء کے اطمینان بخش انتظام کی طرف توجہ دلائی- اسی وقت میں نے مہاتما جی سے ایک مطالبہ یہ بھی کیا- کہ جو مسلمان مرتد ہو گئے ہیں وہ اگر بحیثیت مسلمان یہاں رہنا چاہیں تو ان کو آزادی دی جائے- مہاتما جی نے کہا کہ میرے پاس بھارگو آنے والے ہیں- میں ان کو یہ سب باتیں سمجھا دوں گا- وہ آپ سے پانی پت ملیں گے- بھارگو صاحب میرے ہیں-

بھارگو صاحب پانی پت آئے اور انہوں نے مسلمانوں کی پوری پوری مدد کرنے اور مجھ سے تعاون کا وعدہ کیا- عرسوں کا سلسلہ شروع ہو جانے سے اور حکومت کی ظاہری روش سے مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا- کہ اب ہم پر کوئی پابندی وغیرہ نہیں ہے تو وہ بھی ارکان اسلام کی ادائیگی کھلم کھلا کرنے لگے-

خصوصی طور پر حضرت مخدوم شاہ صاحب کے ۱۹۴۹ء والے عرس میں صاف طور پر مسلمانوں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان بھی کیا- اس وقت مقامی حکام نے بھی ان کا حوصلہ بڑھایا-

ایک مسلمان فوجی افسر نے مجھ سے کہا- کہ ان مسلمانوں کی جو مسلمان رہنا چاہتے ہیں- یا پاکستان جا رہے ہیں ان کی چوٹی کٹوائیے- میں نے کہا- کہ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے- اس نے کہا کہ آپ پولیس کو باہر مشغول رکھیں' اندر زنانے مکان میں ہم یہ کام کرتے ہیں- چنانچہ جن مسلمانوں نے اپنے مسنون رہنے کا اعلان کیا' ان کی چوٹیاں کاٹی گئیں جس سے دو کنستر (تیل والے) بھر گئے-

کام کی نوعیت اور گاندھی جی کا حادثہ قتل

مہاتما جی نے مجھ سے پوچھا کہ کام کی نوعیت کیا ہو گی- اس کے متعلق میں نے ایک خط لکھا- جو ۳۰/ جنوری ۱۹۴۸ء کو ۱۱ بجے دن کے وقت مہاتما جی کے پاس

پہونچا- انہوں نے سردار گوربچن سنگھ سے کہا- کہ کل کو مولوی صاحب کی چٹھی کا جواب لکھنا- مگر ابھی کل نہیں آئی تھی کہ شام کے وقت مہاتما جی کے قتل کا واقعہ پیش آ گیا- رات کو جب اطلاع ملی تو میرے مکان کے نیچے سے لوگ یہ کہتے ہوئے گذر رہے تھے کہ دہلی میں گاندھی جی کو قتل کر دیا گیا ہے یہاں اس کو (مجھ کو) بھی ختم کر دو- مگر خدا کا شکر ہے کہ کوئی واقعہ ناگواری کا پیش نہیں آیا- میں بدستور مغویہ عورتوں کے نکالنے کے کام میں عملی طور پر ارکان جمعیتہ علماء اور سوشل ورکروں مثلاً بہن- مردولا سارابائی کے ساتھ مصروف رہا- اور یہ کوشش جاری رہی کہ جو مسلمان ہندو علاقہ میں رہ گئے ہیں- ان کے بچوں کی تعلیم کا کوئی نہ کوئی بندوبست جلد ہونا چاہیے- اور جو اوقاف ہیں ان کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں ہونا چاہیے-

دینی تعلیم کا سلسلہ

ہنگاموں کے ختم ہونے اور فضا کے ساکن ہونے کے بعد جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ مکمل تخلیہ اور انخلاء کے باوجود مسلمان دیہاتوں میں موجود ہیں- تو جمعیتہ علماء ہند کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے اصرار شروع ہوا کہ پانی پت میں دینی تعلیم کا سلسلہ از سر نو شروع کیا جائے- اور کوشش کی جائے کہ دیہات کے مسلمان بچوں کو یہاں لا کر رکھا جائے- اور ان کو دینی تعلیم سے آشنا کیا جائے- اس تحریک کو حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تائید سے تقویت حاصل ہوئی- چنانچہ ستمبر ۵۲ء سے دینی تعلیم کا مکتب قائم کیا گیا- دشواری یہ تھی کہ پانی پت میں کوئی مسلمان بچہ نہیں تھا- دیہات کے بکھرے ہوئے اکا دکا تباہ حال مسلمانوں میں نہ تعلیم کا شوق تھا نہ اتنی ہمت تھی کہ اپنے بچوں کو جدا کریں- نہ خود بچوں میں کوئی شوق یا احساس تھا- ان تمام باتوں کا اثر یہ تھا کہ بمشکل بچوں کو لایا جاتا- بچے کچھ دن پڑھتے اور پھر نکل کر چلے جاتے تھے-

بہر حال پہلی مرتبہ جناب کنور عبدالرحمٰن صاحب کی نگرانی میں مدرسہ کی ابتداء کی گئی- جمعیتہ علماء ہند کی طرف سے ماہانہ امداد جاری کی گئی- مگر یہ مکتب چند

ماہ جاری رہ کر بند ہو گیا۔

پھر حافظ عبدالحمید صاحب کو جو پانی پت کے شاگرد ہیں۔ اور یہاں ہی کے باشندہ ہو گئے تھے۔ ان کو بلا کر مدرسہ ان کے سپرد کیا مگر وہ بھی نہ چلا سکے۔ پھر حافظ محمد عمر صاحب کو قصبہ سہنسپور ضلع بجنور سے یہاں بلایا۔ اور مدرسہ ان کے سپرد کر دیا۔ حافظ صاحب کا بچپن پانی پت ہی میں گذرا تھا۔ آپ نے یہیں تجوید و قرأت کی تکمیل کی تھی۔ خدا کا شکر ہے آپ کی محنت و جانفشانی سے مدرسہ اب تک جاری ہے۔

حافظ صاحب موصوف نہ صرف مدرسہ کی نگرانی اور بچوں کی تعلیم و تربیت کا کام کرتے ہیں۔ بلکہ میرے دست راست ہیں۔ اور مدرسہ کے لیے مالی امداد کا فراہم کرنا' اور اوقاف کے مقدمات کی پیروی نہایت تندہی اور ہمدردی سے کر رہے ہیں۔ اور بہت کامیاب ہیں۔

کچھ دنوں بعد نواب عظمت علی خاں صاحب رئیس کرنال کی موقوفہ جائداد سے تقریباً تین ہزار روپے سالانہ کی امداد آنے لگی۔ اور ایک ادارہ اسلامی پانی پت و کرنال کے نام سے قائم کیا گیا۔ جس میں مسٹر محمد احمد کاظمی ایڈووکیٹ و ممبر پارلیمنٹ' مولانا سید محمد میاں صاحب' میر احمد حسین صاحب حافظ عبدالجلیل صاحب' حافظ فیاض احمد صاحب انصاری پانی پتی' اور راقم الحروف ممبر مقرر کیے گئے۔ یہ ادارہ اس وقت تک قائم ہے اور اس کے ماتحت مدرسہ اس وقت تک جاری ہے۔ تقریباً ۶۰ بچے قرآن شریف' اور رسالہ تعلیم الاسلام اور جمعیتہ علماء ہند کی مرتب کردہ مذہبی کتابیں پڑھنے اور لکھنے کے قابل ہو کر فارغ ہو چکے ہیں۔

ادارہ اسلامی کی امداد کے لیے وقف نواب عظمت علی خاں کی جانب سے یہ شرط تھی کہ جب کرنال کی جامع مسجد مسلمانوں کے قبضہ میں آ جائے گی۔ اور وہاں مدرسہ قائم ہونے کی صورت ہو جائے گی تو یہ رقم بند کر دی جائے گی اور وہاں خرچ ہو گی۔

چنانچہ بحمداللہ سعی و کوشش سے کرنال کی جامع مسجد خالی ہو گئی ہے اور وہاں مدرسہ قائم ہو گیا ہے۔ راؤ محمد حسین خاں صاحب وہاں مقیم ہیں۔ اور کرنال کے

حصہ کی رقم اس مدرسہ کو دی جا رہی ہے۔ لیکن اس کا دوسرا نتیجہ یہ بھی ہے کہ پانی پت کے مدرسہ کی آمدنی بہت محدود رہ گئی ہے۔ یعنی صرف تقریباً ایک ہزار روپیہ سالانہ رہ گئی۔ اس بنا پر وظیفہ پانے والے طلبہ کی تعداد کم کرنی پڑی۔ تاہم مدرسہ جاری ہے اور اب وقف درگاہ قلندر صاحب و درگاہ مخدوم صاحب اور بعض دوسری درگاہوں کی آمدنی بھی ہونے لگی ہے۔ تو توقع ہے۔ مدرسہ کو ترقی کا موقع ملے گا۔ اور طلبہ میں اضافہ ہو سکے گا۔

تنظیم اوقاف

اوقاف کے بارے میں عرصہ سے لگن اور خواہش تھی کہ کسی طرح ان کا تحفظ ہو جائے اپنے طور پر حکومت کو مسلسل توجہ دلا رہا تھا۔ کہ کم سے کم دو چار وقف ہی میرے سپرد کر دیئے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درگاہ مخدوم صاحب درگاہ بو علی شاہ قلندر' درگاہ حضرت شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء ۱۹۵۷ء میں میرے سپرد کر دی گئی۔ درگاہ مخدوم صاحب کچھ دنوں بعد بالکل خالی ہو گئی۔ لیکن درگاہ بو علی شاہ قلندر میں زنانہ اسکول تھا۔ اور باوجود وعدوں کے میونسپلٹی درگاہ شاہ قلندر سے اسکول نہیں ہٹا رہی تھی۔ اور درگاہ کو خالی نہیں کیا جا رہا تھا۔ تو اپریل ۱۹۵۷ء میں اکابرین جمعیتہ علماء ہند کے مشورے سے میں نے میونسپلٹی پانی پت کو نوٹس دیا کہ درگاہ شاہ قلندر سے مدرسہ ہٹا کر اس کو خالی کر کے دروازہ پر قفل لگا کر کنجی میرے حوالے کرو۔ ورنہ میں ستیہ گرہ شروع کر دوں گا۔

بحمداللہ اس کا بہت اچھا اثر ہوا۔ اور جون ۱۹۵۷ء میں درگاہ خالی ہو گئی۔ اس کے بعد صحیح طور پر اجتماعی کوشش مشرقی پنجاب کے اوقاف کی واگذاری کے لیے جمعیتہ علماء ہند کی طرف سے شروع ہو گئی۔ اور کئی سال کی جدوجہد کے بعد اکتوبر ۱۹۶۱ء میں پنجاب وقف بورڈ کی تشکیل عمل میں آئی۔ اب بحمداللہ پنجاب وقف بورڈ اطمینان اور تندہی سے مسلمانوں کی تعلیمی' مذہبی کاموں میں مدد کر رہا ہے۔

سیکولرزم کا ایک خوشگوار نتیجہ اور حکومت کا حوصلہ مندانہ اقدام

ہزاروں انسان دوبارہ دامنِ اسلام میں

دیہات کے خوف زدہ مسلمانوں کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے- ان کو مرتد کہنا تو اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اسلام سے ایک لحہ کے لیے بھی منحرف نہیں ہوئے تھے- ان کے دلوں میں اسلام اسی طرح رچا ہوا تھا- بلکہ بعض ایسی مثالیں بھی ملی ہیں کہ لوگ چھپ چھپ کر نمازیں پڑھتے تھے- البتہ حالات کی ہولناکیوں سے مرعوب ہو کر انہوں نے سر پر چوٹیاں رکھ لی تھیں- اور اپنے آپ کو ہندو کہنے لگے تھے- ان کا معاملہ بہت تکلیف دہ تھا- اور ان کی وجہ سے ہر وقت پریشانی رہتی تھی- ان کے متعلق حکومت سے عرض و معروض اور خط و کتابت کرتا رہا-

مزید بر آں غیبی تائید یہ ہوئی کہ اسی طرح کے مسلمانوں کا ایک وفد' جو پٹیالہ ضلع کے رہنے والے تھے' دہلی پہونچا' اور مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے ذریعہ اپنی فریاد حکومت ہند کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو تک پہونچائی- کہ مذہبی آزادی کا نہ صرف اعلان' بلکہ ایسا انتظام کیا جائے کہ ہم آزادی کے ساتھ اپنے اسلام کا اظہار کر سکیں' ورنہ ہمیں پاکستان پہونچانے کا انتظام کیا جائے-

یہ بات باعث مسرت ہے پنڈت نہرو نے ان کی فریاد کی طرف فوراً توجہ کی- اور ایک سرکلر جاری کر دیا- کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے جو مسلمان تھے- وہ مسلمان ہی ہیں- وہ آزادانہ اپنے مذہبی احکام پر عمل کر سکتے ہیں- روک ٹوک کرنے والوں اور ڈرانے دھمکانے والوں کو مجرم قرار دیا جائے- اور ان کو اس جرم سے باز رکھا جائے-

پھر سیاسی حالات نے بھی کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ مسلمان کی قیمت بڑھنے لگی- پنجابی اور ہندی زبان کے قصے میں ہندو اور سکھوں میں کچھ کشیدگی پیدا ہوئی تو مسلمانوں کو تیسری پارٹی قرار دے کر ہر ایک نے اپنی طرف کھینچنا چاہا- بہر حال خدا کا شکر ہے کہ یہ سب مسلمان اس وقت مذہبی آزادی سے بہرہ اندوز ہیں- اور اب

اس نفرت کے آثار بھی تقریباً ختم ہیں جو اس دور نامسعود میں ان تمام تباہیوں اور بربادیوں کی ذمہ دار تھی-

مسلمانوں کی جائدادوں کی واگذاری

مسلمانوں کے پاکستان جانے کے بعد حکومت مشرقی پنجاب نے یہ عام فیصلہ کر دیا- کہ یہاں کوئی مسلمان نہیں ہے- جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جو مسلمان یہاں رہ گئے تھے ان کی جائدادیں بھی ضبط کر لی گئیں- خود اس فقیر کی جائداد بھی ضبط ہوئی- ان جائدادوں کے متعلق جمعیتہ علماء ہند نے جو جدوجہد کی وہ اس کا ایک تاریخی کارنامہ ہے- جس کی بنا پر کروڑوں روپوں کی جائدادیں مسلمانوں کے پاس محفوظ رہ گئیں- جمعیتہ علماء ہند کے علاوہ اس فقیر کی خط و کتابت بھی حکومت ہند اور حکومت پنجاب سے ۱۹۴۸ء سے جاری رہی-

جمعیتہ علماء ہند کی جدوجہد اور احقر کی مراسلت کے نتائج زیادہ بہتر ہو سکتے تھے- مگر بد قسمتی سے محکمہ کسٹوڈین میں ایسے شرنارتھی حکام اور عملہ تعینات کیا گیا- جن کے دلوں میں انسانی درد اور ہمدردی پاس کو بھی نہیں گذری تھی-

انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ وہ جابرانہ سلوک کیا کہ تاریخ یاد رکھے گی- حالانکہ اس وقت تک بہت سے معاملات طے ہو چکے ہیں- لیکن پھر بھی میرے جیسے گوشہ نشین انسان' عدالتوں کے چکر سے گھبرانے والے' بے یار و مددگار اب تک پریشان ہیں- اور ان کی جائدادیں کسٹوڈین نے غیر قانونی طور پر زبردستی ہڑپ کر لی ہیں- ہندوستان میں مسلمان موجود ہے- مگر کسٹوڈین کے فائل میں لکھا ہوا ہے کہ وہ پاکستان چلا گیا ہے- اور یہ جائداد کسٹوڈین کی ہے-

مغویہ عورتوں کی بازیابی

کرنل فخر الدین پاکستانی فوجی افسر نے شروع نومبر ۱۹۴۷ء میں درگاہ حضرت مولانا غوث علی شاہ میں کیمپ قائم کر دیا تھا- وہاں پر دیہاتی مسلمانوں کو جو پاکستان جانا چاہتے تھے اکٹھا کیا جاتا تھا- اور جو عورتیں بازیاب اور برآمد ہوتی تھیں ان کو یا تو

پاکستان بھیج دیا جاتا تھا- یا جن کے اعزا کا پتہ چل سکا ان کے حوالے کر دیا جاتا تھا-

شروع نومبر ۱۹۴۷ء میں فساد ہو رہا تھا جس میں تقریباً دو ڈھائی ہزار آدمی کام آئے- اور سات سو کے قریب عورتیں اغوا کی گئیں- مس مردولا سارا بائی صاحبہ کی اسکیم کے تحت مولوی انیس الحسن صاحب ورکر جمعیۃ علماء ہند مغویہ عورتوں کی بازیابی کے لیے مس مردولا سارا بائی کے ساتھ پانی پت آئے- اور میری مرتب کردہ فہرست کے مطابق مغویہ عورتوں کی بازیابی ہوئی- حمد اللہ دو چار عورتوں کے سوا جن کی موت وزندگی کا کچھ پتہ نہیں چل سکا- تمام مغویہ عورتیں بر آمد ہو گئیں- اسی سلسلہ میں بعض شہر نارتھی بھائیوں کی عورتیں جو پاکستان میں رہ گئی تھیں یا اغوا کر لی گئی تھیں ان کی بازیابی بھی اپنے احباب و اعزا کے ذریعہ جو پاکستان میں تھے ہوتی رہی- اللہ تعالیٰ نے اس کام میں کامیابی عطا فرمائی- بعض معاملات میں کچھ دشواری بھی پیش آئی- لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری مدد فرمائی- اور آسانیاں پیدا کر کے ہم کو کامیاب بنایا-

حرف آخر

ناسپاسی ہو گی اگر میں اس تذکرے میں میر احمد حسین صاحب شملوی کا ذکر نہ کروں- کیونکہ انہوں نے اس جدوجہد اور تگ و دو میں یعنی مسلمانوں کو مسلمان رہنے- ان کی جائدادوں کی واپسی' اوقاف کی واپسی' اور ان کا انتظام وانصرام اور دوسرے مسائل میں جس غیر معمولی دلچسپی سے کام لیا' وہ ہر ایک ہمدرد ملت بالخصوص مسلمانان مشرقی پنجاب کی طرف سے ہزاروں شکریہ کی مستحق ہے- جب کبھی مقامی حکام' حکام ضلع یا صوبائی یا مرکزی حکومت سے خط و کتابت یا ملاقات کی ضرورت پیش آئی تو جہاں جماعتی حیثیت سے جمعیۃ علماء ہند کے کارکن اور جمعیۃ علماء ہند کا دفتر مستحق شکریہ ہے کہ اس نے اس ضرورت کو پورا کیا- انفرادی حیثیت میں میر صاحب موصوف مستحق ستائش ہیں- نکاسی جائدادوں کے سلسلہ میں حکومت کی طرف سے ایک تاریخ مقرر کی گئی کہ جو لوگ پاکستان نہیں گئے ہندوستان ہی کے

کسی مقام پر رہے وہ فلاں تاریخ تک واپسی جائداد کی درخواست دیدیں- ایسے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں ہیں- ان لوگوں نے معینہ تاریخ تک درخواستیں دیں-

میر احمد حسین صاحب شملوی نے صرف یہی نہیں کہ اس طرح کی درخواستیں لکھنے میں رہنمائی فرمائی- بلکہ ایسی درخواستیں خود ہی ٹائپ بھی کیں- اور پوری توجہ سے ان کو بروقت روانہ کیا- اس طرح کی خدمات میں جہاں میر صاحب کا وقت خرچ ہوا- آپ پر مالی بار بھی پڑا- جس کو میر صاحب نے فراخ حوصلگی سے برداشت کیا- دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کی جزائے خیر دے اور اس دولت سے سرفراز فرمائے جو اس کے نزدیک بہتر سے بہتر ہے-

حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحبؒ مولانا آزادؒ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ مولانا احمد سعید صاحبؒ مولانا محمد میاں صاحب اور دوسرے تمام ارکان جمعیۃ علماء ہند کے لیے بھی یہی دعا میری اور پنجاب کے تمام مسلمانوں کی جانب سے ہے- خدا کا شکر ہے کہ آباد کاری' مغویہ عورتوں کی بازیابی اور اوقاف کی واگذاری' مسلمانوں کی ارتداد سے واپسی' یہ سب امور خیر وخوبی کامیاب ہو گئے ہیں- البتہ کچھ مسلمانوں کی جائدادیں اور کچھ اوقاف کی جائدادوں کی واپسی کا مسئلہ باقی ہے- اللہ تعالیٰ محکمہ کسٹوڈین کے حکام و عمال کو فرض شناسی کی توفیق بخشے- تاکہ مسلمان اپنا جائز حق پا کر مطمئن ہوں- اور حکومت کا بول بالا ہو- اللہ تعالیٰ ہم سب کی مدد فرمائے-

لقاء اللہ عثمانی (پانی پت)

۸ محرم الحرام ۱۳۸۳ھ مطابق یکم جون ۱۹۶۳ء

خاتمہ کتاب

ایک سبق---جو کبھی بھی فراموش نہ ہونا چاہیے

آپ نے بزرگان پانی پت کے حالات میں تقریباً تین سو صفحات کا مطالعہ کیا ان حالات میں مرکزی نکتہ جس کی جھلک ہر جگہ نظر آرہی تھی- کیا تھا-؟

پریم' محبت' رواداری' اپنوں پرائیوں سے اچھا سلوک - ایک دوسرے پر اعتماد ' خدا شناسی اور خدا ترسی' ان تین سو صفحات میں آپ کو یہی باتیں ملیں گی- جو دراصل انسانیت کی صحیح تصویر اور شرافت کا جوہر ہیں-

پھر آپ نے حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کا بیان بھی ملاحظہ فرمایا: یقیناً آپ کا مزہ بگڑ گیا ہوگا- وہی انسان جو شرافت کا پیکر تھے - آپ کو بھیڑیئے معلوم ہونے لگے ہوں گے- یہ فرق کیوں ہوا- اس وقت ۱۹۶۳ء میں جب کہ جمہوریہ ہند پروان چڑھ رہا ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس فرق کو سمجھیں اور اس کی بنیادی وجہ معلوم کریں- وجہ مسلمان بادشاہوں کو آپ کچھ بھی کہیں - ان کی آپس کی لڑائی جھگڑوں کے متعلق آپ کچھ بھی فیصلہ کریں- مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا اصول حکمرانی وہ تھا- جس کی وصیت بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو کی تھی-

اے پسر مملکت ہندوستان مختلف مذاہب سے پر ہے- الحمد للہ کہ اس نے اس کی بادشاہت تمہیں عطا فرمائی- تمہیں لازم ہے کہ تمام تعصبات مذہبی کو لوح دل سے دھو ڈالو- اور عدل و انصاف میں ہر مذہب وملت کے طریق کا لحاظ رکھو- جس کے بغیر تم ہندوستان کے لوگوں پر قبضہ نہیں کر سکتے- جس طرح انسان کے جسم میں چار عناصر مل جل کر کام کر رہے ہیں- اسی طرح مختلف المذاہب رعایا کو ملا جلا رکھو اور ان میں اتحاد عمل

(قومی یکجہتی) پیدا کرو- تاکہ جسم سلطنت مختلف امراض سے محفوظ و مامون رہے-

(حوالہ علماء ہند کا شاندار ماضی ج ۲ و اخبار خلافت نمبر ۱۹۰ اگست (۱۹۲۶ء)

بیشک ایسا ہو کہ ہمایوں کو شیر شاہ نے ہندوستان سے بھگا دیا- پھر تقریباً بارہ سال بعد ہمایوں نے چڑھائی کر کے شیر شاہ کے وارثوں کو ختم کیا- مگر یہ لڑائی حکمرانوں کی تھی- وہ آپس میں تباہ ہوتے اور ایک دوسرے کو تباہ کیا کرتے تھے- لیکن جیسا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی رپورٹ پنجم ۱۸۱۲ء میں کہا گیا تھا- اس تباہی کا اثر عوام پر نہیں پڑتا تھا- رپورٹ میں تحریر ہے-

"میونسپل (مقامی) گورنمنٹ کے اس سادہ نظام (یعنی دیہات کے پنچائتی نظام میں) اس ملک کے باشندے نامعلوم زمانہ سے زندگی بسر کر رہے ہیں- وہ یہ فکر نہیں کرتے کہ بادشاہت ٹوٹ گئی یا منقسم ہو گئی- جب تک ان کا گاؤں صحیح سالم ہے انہیں پرواہ نہیں کہ وہ کس سلطنت میں شامل ہو گیا- یا کس بادشاہ کے قبضہ میں آگیا- اس کی اندرونی زندگی کے آئین اور دستور منقلب نہیں ہوتے-" (دت ص ۱۹۶)

بہر حال- بابر کی وصیت سے جو اصول معلوم ہوتا ہے- اس کے نتائج وہ تھے جو آپ نے کتاب کے تین سو صفحات میں ملاحظہ فرمائے-

اب آیئے- انگریزوں کا اصول حکمرانی ملاحظہ فرمایئے:-

"ہندوستان میں ہماری حکومت کے ہر صیغہ کو خواہ وہ خارجی تعلقات سے واسطہ رکھتا ہو- یا عدالتی اور حربی نظم و نسق سے' یہ اصول ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے- "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" (حوالہ ایشیاٹک جنرل ۱۸۲۱ء)

"نفاق ڈال کر حکومت کرنا رومیوں کا اصول تھا- یہی اصول

ہمارا بھی ہونا چاہیے۔" (یادداشت لارڈ الفنسٹن گورنر بمبئی
مورخہ ۱۴ مئی ۱۸۵۹ء)

(حوالہ ان ہپی انڈیا۔ مصنفہ لالہ لاجپت رائے)

پانی پت کے یہ واقعات جو مختصر اور منتشر طور پر آپ نے مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی کے بیان میں ملاحظہ فرمائے۔ نفاق کے اسی پودے کے کڑوے پھل تھے۔ جس کو انگریزوں نے بویا تھا۔ افسوس سو سال میں اس کی جڑیں اتنی گہری پھیل گئی ہیں کہ ۱۶ سال ہو گئے۔ انگریز جا چکا۔ مگر یہ جڑیں اب تک نہیں اکھڑ سکیں۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً۔

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافات عمل غافل مشو

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

محمد میاں

(۱۱ صفر ۱۳۸۳ھ مطابق ۳/ جولائی ۱۹۶۳ء)

